رشید حسن خاں: احوال و آثار

ڈاکٹر رفاقت علی شاہد

رشید حسن خاں اُردُو کے صفِ اوّل کے محقق، مدوّن، ماہرِ زبان، لغت شناس اور نقاد تھے۔ اُردُو ادب اور تحقیق کے لیے ان کی خدمات کثیر الجہات ہیں۔

رشید حسن خاں کی تاریخ ولادت ۱۰ جنوری ۱۹۳۰ء[۱] اور ۱۵ دسمبر ۱۹۲۵ء[۲] لکھی جاتی ہے لیکن خود رشید حسن خاں نے اپنی تاریخِ پیدائش سے متعلق لکھا ہے:

> "تعلیمی کاغذات میں تاریخ ولادت ۳۰ جنوری ۱۹۳۰ء لکھی ہوئی ہے۔ یہ تاریخ کس نے لکھائی تھی؟ مجھے نہیں معلوم۔ صحیح سالِ ولادت ۱۹۲۵ء ہے، دسمبر کا مہینا، تاریخ کا علم نہیں۔"[۳]

رشید حسن خاں کے اپنے بیان کے بعد بقیہ تمام تاریخیں غلط ٹھہرتی ہیں اور ان کی صحیح تاریخِ پیدائش دسمبر ۱۹۲۵ء بنتی ہے۔

رشید حسن خاں کا تعلق پٹھانوں کی یوسف زئی شاخ سے تھا اور وہ اپنے طور طریق سے مکمل پٹھان تھے۔[۴] انھوں نے اپنے اسلاف سے متعلق انتہائی مختصر معلومات دی ہیں۔[۵] ان کے مطابق ان کے دادا کا نام علی حسن خاں اور والد کا نام امیر حسن خاں تھا۔ خاندان کے بزرگ فوج کی ملازمت کو نشانِ امتیاز سمجھتے تھے، چناں چہ ان کے دادا بھی فوج کے ملازم تھے۔ ان کے والد کو کسرت اور کشتی کا شوق تھا، اس لیے انھوں نے پولیس کی ملازمت کو ترجیح دی۔ ان کے والد سچے اور پکے محبِ وطن تھے لہٰذا تحریکِ عدمِ تعاون کے دوران میں انھوں نے اپنی سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے دیا لیکن ان کا محکمانہ ریکارڈ اچھا ہونے کے سبب ان کے سپرنٹنڈنٹ نے انھیں استعفیٰ دینے کے بجائے قبل از وقت سبک دوشی حاصل کرنے پر آمادہ کر لیا۔ یوں ان کی پنشن پندرہ روپے دو آنے لگ گئی جو آخر تک ملتی رہی۔

حبِ وطنی کے جذبے کے باعث امیر حسن خاں انگریزی تعلیم کے خلاف تھے، چناں چہ انھوں نے رشید حسن خاں کو اسکول میں داخل کرانے کے بجائے اپنے استاد کے ہاں محلّے میں بھجوانا شروع کیا۔ یہاں رشید حسن خاں نے عربی و فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۳۴ء میں انھیں درسِ نظامی کی تکمیل کے لیے شاہ جہاں پور کے معروف مدرسے، بحر العلوم میں بھیج دیا گیا۔ ابھی انھوں نے متوسطات تک کی کتابیں پڑھی تھیں کہ دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ شاہ جہاں پور میں آرڈی ننس کلوذنگ فیکٹری تھی۔ اس فیکٹری میں فوجی وردیاں سلتی تھیں۔ جنگ کی وجہ سے فوجی وردیوں کی مانگ میں اضافہ ہوا اور نتیجے میں طلب پوری کرنے کے لیے آرڈی نَنس فیکٹری میں فوجی وردیوں کی تیاری میں تیزی آ گئی، لہٰذا کام کی رفتار تیز کرنے کے لیے اضافی عملے کی

بھرتی شروع ہوگئی۔چوں کہ گھر کے معاشی حالات اچھے نہیں تھے،اس لیے رشید حسن خاں نے تعلیم ادھوری چھوڑ کر ۱۹۳۹ء میں آرڈی ننس فیکٹری میں ملازمت کرلی۔یوں پانچ سال تک مدرسۂ بحرالعلوم میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود وہ درسِ نظامی کی تکمیل نہ کر سکے۔یہ آرڈی ننس فیکٹری رشید حسن خاں کے آخری زمانۂ حیات تک موجود تھی۔ڈاکٹر آرتی رینا نے یہ فیکٹری جولائی ۲۰۰۳ء میں دیکھی تھی۔(۶)

اس وقت چوں کہ جنگِ عظیم جاری تھی،لہٰذا سول کارخانوں میں تو مزدور یونین بنانے کی اجازت تھی لیکن آرڈی ننس فیکٹریوں میں اس کی اجازت نہ تھی۔اس کے باوجود کچھ لوگوں نے ۱۹۴۰ء کے اواخر میں چُھپ چھپا کر آرڈی ننس فیکٹری، شاہ جہان پور میں مزدور یونین کا آغاز کردیا۔شروع شروع میں یونین کے جلسے خفیہ طور پر کیرتن اور میلاد شریف کے بہانے ہوتے تھے، پھر جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد آہستہ آہستہ یونین کا کام کُھل کر کیا جانے لگا۔ ۱۹۴۵ء کے اواخر میں شاہ جہان پور کی آرڈی ننس فیکٹری میں ۲۳ دن کی ہڑتال ہوئی۔(۷) یہ کسی بھی آرڈی ننس فیکٹری میں پہلی باضابطہ ہڑتال تھی۔اس وقت رشید حسن خاں مزدور یونین کے جوائنٹ سیکرٹری تھے۔اسی پاداش میں ۱۹۴۶ء کے شروع میں انھیں فیکٹری سے نکال دیا گیا۔(۸) ڈاکٹر شمس بدایونی نے فیکٹری سے برطرفی ۱۹۴۷ء میں لکھی ہے۔(۹) یہ درست نہیں۔

مزدور یونین کی سیاست کا تجربہ رشید حسن خان کے لیے خوش گوار نہیں رہا۔وہ تھے سیدھے، سچے اور کھرے پٹھان، سیاست کا ہیر پھیر اور منافقت اُن کے مزاج کے خلاف تھا، چناں چہ یونین کی منافقانہ سیاست کے رجحانات اُن کے دل میں پائیدار منفی اثرات چھوڑ گئے۔مزدور یونین کی سیاست کے بارے میں اُن کے مشاہدات خود اُن کی زبانی دیکھیے:

> ''ہماری یونین کے سیکرٹری کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ایک تربیت یافتہ شخص تھے، بہت محنتی، ایمان دار اور پڑھے لکھے۔ان دنوں کمیونسٹ پارٹی میں کامریڈ رندیوے کے گروپ کو برتری حاصل تھی اور یہ زمانہ انتہاپسندی کا تھا، سیاسی سطح پر مفاہمت نام کی ان دنوں کوئی چیز نہیں تھی۔ٹریڈ یونین سے، مزدوروں کے مسائل کو حل کرنے سے زیادہ، پارٹی کی آئیڈیالوجی کو پھیلانے کا کام لیا جاتا تھا، اور ورکروں کی اسی لحاظ سے، شام کے بیٹھکوں میں ذہنی تربیت کی جاتی تھی۔یونین میں تین چار لوگ ایسے تھے جو اس پالیسی سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔میں بھی انھی میں سے تھا۔ہمارا کہنا تھا کہ ''دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ'' کھوکھلا نعرہ ہے اور محض سیاسی ہتھ کنڈا۔ہر ملک، حتیٰ کہ ہر کارخانے کے مزدوروں کے مسائل یک ساں نہیں، پھر وہ سب ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ ہم یہ بھی کہتے تھے کہ مینجمنٹ سے لڑنا ہمارا مقصود نہیں ہو سکتا، طریقۂ کار کا عارضی حصہ ہو سکتا ہے، مگر یہ پارٹی کی پالیسی کے خلاف تھا۔''
>
> ''پھر شخصی جھگڑے تھے۔اب ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اس وقت ورکر تو نچلے درجے سے آئے تھے جو بہت ایمان دار، سچے تھے، مگر سادہ دل اور سیاسی داؤ پیچ سے ناآشنا، جب کہ جتنے لیڈر تھے، وہ سب اپر کلاس سے آئے تھے اور اپنے طبقے کے سارے ذہنی اور عملی تضادات ساتھ لے کر آئے تھے۔اس سے ایک سطح پر کش مکش کا پیدا ہونا لازم تھا، اور وہ ہوا۔آخر میں دو گروہ بن گئے تھے یونین میں، اسی سوال پر۔''(۱۰)
>
> ''اس دوران میں یوپی کے بیش تر لیڈروں اور کمیونسٹ پارٹی کے ذمے داروں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور

جس قدر ان سے قریب ہوتا گیا، اسی قدر روحانی طور پر ان سے دور ہوتا گیا..... غرض کہ خاص خاص ورکروں اور لیڈروں میں خلیج بڑھتی گئی اور آخر کار مجھ ایسا آشنائے سیاست کارکن بالکل الگ ہو گئے۔ ان دنوں ایسے تلخ تجربے ان رونماؤں کے ہوئے تھے کہ آج تک ان کی یاد باقی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہ صورتِ حال رونما نہ ہوئی ہوتی تو شاید میں بھی آج ترقی پسندی کا لیبل لگائے ہوئے ہوتا۔"(۱۱)

مزدور یونین کی سیاست کے بداثرات اگرچہ انھیں ترقی پسندی کی جانب راغب کر رہے تھے لیکن بقول اُن کے:

"ترقی پسندی تحریک سے بچنے کی ایک وجہ یہ بھی پیدا ہو گئی کہ میں نے تنقیدی کتابیں پڑھنے سے پہلے وہ ادب پڑھا تھا اور اس نے مجھے محفوظ رکھا، کیوں کہ فارسی شاعری اور کلاسیکی اُردو ادب کے مطالعے نے ذہن میں ذوق اور معیار کا ایک تصور ضرور پیدا کر دیا تھا جس نے صحافت، نعرے بازی اور ادب میں فرق کرنا سکھایا تھا اور فرد کی حقیقت اور شخصیت کے دائرے کی وسعت سے آشنا کیا تھا۔"(۱۲)

فیکٹری کی ملازمت کے دوران ۱۹۴۵ء میں رشید حسن خاں کی شادی ہو گئی۔(۱۳) ڈاکٹر شمس بدایونی لکھتے ہیں:

"۱۹۴۴ء [کذا] میں اُن کی شادی خاندان ہی کے ایک فرد منظور علی خاں کی بیٹی نفیس بیگم سے ہوئی تھی جن کے بطن سے ایک بیٹی پیدا ہو کر آٹھ نو ماہ بعد فوت ہو گئی تھی۔"(۱۴)

ظاہر ہے ۱۹۴۴ء کمپوزنگ کی غلطی ہے۔ ڈاکٹر شمس نے ۱۹۴۴ء لکھا ہوگا۔ خود رشید صاحب نے واضح طور پر اپنی شادی کا سنہ ۱۹۴۵ء لکھا ہے، اس لیے ۱۹۴۴ء کے بجائے ۱۹۴۵ء مروج ہے۔ دوسرے: شادی کی تاریخ اور بیوی اور بیٹی سے متعلق درج بالا کوائف کا اندراج صرف ڈاکٹر شمس نے کیا ہے، ان کی صحت سے متعلق یقین سے کچھ کہنا ممکن نہیں۔

شادی کی وجہ سے ذمّے داریوں کا مزید بوجھ رشید صاحب کے کندھوں پر آن پڑا۔ اُدھر ۱۹۴۶ء کے آغاز میں انھیں فیکٹری کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ذمّے داریوں میں اضافے کے سبب سے بے روزگاری کا یہ دور اُن کے لیے شدید مالی مشکلات لے کر آیا۔ خود اُن کے بیان کے مطابق اگلے چار پانچ سال وہ معاشی طور پر بہت پریشان رہے،(۱۵) چناں چہ آرڈی نینس فیکٹری کی ملازمت کے بعد معاشی ضروریات کے تحت مجبوراً انھیں چھوٹی موٹی نوکریوں پر گزارا کرنا پڑا۔ فیکٹری کی ملازمت کے خاتمے کے بعد ۱۹۴۶ء کے آغاز میں وہ آنا پینے والی چکی پر منشی کے فرائض انجام دینے لگے۔ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ایک زمین دار کے کارندے کے طور پر نوکری کی اور گاؤں اور زمین داری کی زندگی کے مشاہدات حاصل کیے۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۹ء تک راشن کی ایک دُکان پر منشی رہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر شمس بدایونی کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے:

"انھوں نے کچھ دن مدرسہ فیضِ عام، شاہ جہان پور میں عربی اور فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھائیں..... کچھ مدّت انگریزوں کو کھانے کی اشیا سپلائی کرنے کے لیے اشیائے خوردنی کی دکان کھولی مگر اس میں بھی کامیاب نہیں ہوئے۔ آخر ترکِ وطن کی، اہلیہ کو میکے بھیجا اور خود بریلی آ گئے اور ایک مقامی ہفت روزہ اخبار "ندرت" کے دفتر میں ملازمت کر لی۔"

"ہفت روزہ "ندرت" (بریلی) کے مالک و مدیر سیّد ابراہیم حسن رسا بریلوی (ف ۱۹۸۷ء) تلمیذِ دلؔ شاہ

جہاں پوری ..... نے ۱۹۴۸ء میں ہفتہ وار "ندرت" کا اجرا کیا تھا۔ "ندرت" کا دفتر رسا کے رہائشی مکان واقع محلہ شاہ آباد، بریلی میں تھا۔ ملازمت کی نوعیت کا پتا نہیں چلا۔ بزرگ ادیب ڈاکٹر سیّد لطیف حسین ادیب ..... جو اُن دنوں شاہ آباد محلے میں رہتے تھے؛ نے بتایا کہ خاں صاحب کا قیام رسا کے رہائشی مکان ہی میں تھا ..... یہ ۱۹۵۰ء کے بعد یا قریب کا زمانہ رہا ہوگا۔"(۱۶)

ڈاکٹر شمس بدایونی نے تفصیلِ مزید کے لیے رشید صاحب کے بیٹے خورشید حسن خاں سے رابطہ کیا تو انھوں نے فون پر یہ بتایا:

"میری والدہ بتاتی تھیں کہ یہ تمھاری ولادت (۱۶/اپریل ۱۹۵۳ء) سے پہلے کی بات ہے جب تمھارے والد بریلی میں ملازمت کرتے تھے۔ تقریباً ساڑھے تین سال وہ بریلی میں ملازم رہے۔ اس کے بعد شاہ جہان پور آ گئے۔"(۱۷)

رشید صاحب کو مدرسۂ فیضِ عام کی نوکری چھوڑنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یاد رہے کہ خود رشید صاحب نے واضح کیا ہے کہ مدرسۂ فیضِ عام کے مہتمم اُن کے دوست اور کرم فرما تھے۔ اگر مہتمم مدرسہ کو انھیں نکالنا مقصود ہوتا تو رشید صاحب کو اُسی وقت فارغ کر دیتے جب طلبہ نے اُن سے درس لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اگر مدرسۂ فیضِ عام سے رشید صاحب کی ملازمت ختم ہوئی تھی تو ایسا خود رشید صاحب نے کیا ہوگا، مہتمم مدرسہ کی جانب سے کسی ایسے اقدام کی توقع نہیں۔ اسی تناظر میں یہ بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اُس وقت رشید صاحب شدید معاشی مشکلات کا شکار تھے۔ ان دگرگوں حالات میں معقول ملازمت سے ہاتھ دھونا انھوں نے کیسے گوارا کیا ہوگا؟

اب رہا معاملہ بریلی میں ملازمت اور رہائش کا۔ رشید صاحب نے اپنی گزشتہ زندگی کے تقریباً تمام بڑے واقعات اور مشکل حالات کا ذکر کر دیا ہے لیکن عجیب بات ہے بریلی جانے کی مجبوری اور تفصیلات کی جانب اشارہ تک نہیں کیا۔ رشید صاحب کی اہلیہ اور بیٹے کی تصدیق کے بعد یہ تو طے ہے کہ تلاشِ معاش کے سلسلے میں رشید صاحب کے بریلی جانے کا واقعہ درست ہے لیکن اس کے زمانۂ وقوع کے سلسلے میں مذکور مبالا بیانات میں ابہام پایا جاتا ہے، جس کا اظہار خود صاحبِ مضمون نے بھی کیا ہے۔ (۱۸)

رشید صاحب نے مدرسۂ فیضِ عام، شاہ جہاں پور میں مدرّسی کا زمانہ ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۲ لکھا ہے۔ (۱۹) مگر سنِ قیاس نہیں کہ اس ملازمت کو خیر باد کہہ کر رشید صاحب نے بریلی جا کر قسمت آزمائی کرنے کو ترجیح دی ہو۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۹ء تک وہ اسلامیہ اسکول میں اُستاد کی حیثیت سے ملازم تھے۔ اس کا تو بالکل امکان نہیں کہ اتنی اچھی نوکری چھوڑ کر وہ طالع آزمائی کرنے بریلی گئے ہوں۔ اس لیے امکان ہے کہ بریلی مراجعت کا زمانہ ۱۹۵۰ء کے آس پاس کا نہیں بلکہ ۱۹۴۹ء یا اس سے پہلے کا ہوگا۔ رشید صاحب کی اہلیہ نے ۱۹۵۳ء سے قبل کا زمانہ کہا تھا جو ۱۹۴۹ء یا اس سے پہلے کا بھی ہو سکتا ہے۔

اس سلسلے میں رسا بریلوی کے بھائی سیّد عابد حسین کلیم (پ ۱۹۲۵ء) کا بیان اہمیت رکھتا ہے جس سے بہت سی گتھیاں سلجھتی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر شمس بدایونی کے مطابق ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے دہے میں کلیم صاحب سے رشید صاحب کی لگاتار خط کتابت رہی ہے۔ ان میں جو خطوط مضمون نگار کو دست یاب ہوئے، اُن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دہلی یونیورسٹی میں ملازمت کے دوران بھی رشید صاحب؛ کلیم صاحب سے ملنے بریلی آتے رہتے تھے۔ کلیم صاحب کے مطابق:

"رشید حسن خاں؛ میرے بھائی سیّد زاہد حسن کے ساتھ آرڈی نینس فیکٹری میں ملازمت کرتے تھے۔ دونوں

میں باہمی اتحاد و اُنس تھا۔ خاں صاحب عملاً بائیں بازو کے ٹریڈ یونینسٹ تھے۔ ملازمت سے برطرف ہو جانے کے بعد زاہد حسن کے ذریعے بریلی آ کر روپوش ہو گئے جہاں میرے اہلِ خانہ نے ان کی تقریباً ڈیڑھ دو برس کفالت کی۔ وہ اپنا وقت اہلِ خانہ اور اہلِ محلّہ کی مصروفیتوں میں ہاتھ بٹا کر اور شریک ہو کر گزارتے۔ خاں صاحب محلّے کی ایک آنا چکی پر بھی بیٹھتے تھے اور اس کا حساب لکھ دیا کرتے تھے۔ محلّے کے بچوں کو بھی پڑھا دیا کرتے تھے۔ خاں صاحب نے یہ وقت انتہائی تنگ دستی، تکلیف مگر استقلال اور خودداری کے ساتھ گزارا۔ ڈیڑھ دو برس بعد ان کی شاہ جہان پور واپسی ہوئی۔"(۲۰)

کلیم صاحب کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ آر ڈی نینس فیکٹری میں ٹریڈ یونین کے جوائنٹ سیکرٹری ہونے کے باعث اگرچہ رشید صاحب کو فیکٹری کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے، اس سے بڑھ کر کوئی ایسی صورتِ حال بھی درپیش ہو گئی تھی کہ رشید صاحب کو بریلی میں روپوش ہونے کی ضرورت پیش آئی اور ڈیڑھ دو سال تک وہ واپس شاہ جہاں پور نہیں جا سکے۔ اس صورتِ حال کا ذکر رشید صاحب نے نہیں کیا۔ اسی طرح یہ بھی قرینِ قیاس نہیں کہ رشید حسن خاں جیسا غیور پٹھان محنت مزدوری کرنے کے بجائے ڈیڑھ دو سال تک دوست کی روٹیوں پر پڑا رہے اور اپنے متعلقین کو شاہ جہاں پور میں اکیلا چھوڑ آئے، خصوصاً شدید مالی مشکلات میں گھر والوں کی ضروریات اور احتیاجات کو نظر انداز کرتا رہے۔ اس لیے یہ بیان محتاجِ ثبوت ہیں کہ رشید صاحب فیکٹری سے فارغ کیے جانے کے بعد چھپتے چھپاتے بریلی پہنچے اور ڈیڑھ دو سال تک ڈر کے مارے شاہ جہان پور واپس نہیں گئے اور اتنے طویل عرصے تک وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور ان کی کفالت اُن کے دوست کرتے رہے۔

کلیم صاحب اور رشید صاحب کی اہلیہ کے بیانات سے البتہ یہ امور واضح ہوتے ہیں کہ رشید صاحب تلاشِ معاش کے سلسلے میں بریلی گئے تھے۔ کلیم صاحب کے بیان کی روشنی میں اُن کے بریلی جانے کا زمانہ فیکٹری کی ملازمت چھُٹ جانے کے فوراً بعد شروع ۱۹۴۶ء کا بنتا ہے۔ قیاس ہے کہ اُن کے دوست انھیں قسمت آزمائی کے لیے اپنے ساتھ بریلی لے آئے ہوں گے۔ یہاں انھوں نے آنا چکی پر کام کیا، رشید صاحب نے بھی فیکٹری کی ملازمت کے بعد آنا چکی پر کچھ عرصے کے لیے منشی کا کام کرنے کا لکھا ہے۔(۲۱) اس کے بعد زمین دار کے کارندے اور راشن کی دکان پر منشی گیری کی ملازمتیں بھی بریلی کی یادگار لگتی ہیں کیوں کہ آنا چکی پر منشی گیری اور زمین دار کے کارندے کے طور پر ملازمت کا دورانیہ رشید صاحب نے اوائل ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۷ء تحریر کیا ہے (۲۲) جو زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو سال بنتا ہے۔ کلیم صاحب نے بھی رشید صاحب کے بریلی میں قیام کی مدّت ڈیڑھ دو سال بیان کی ہے لیکن رشید صاحب کی اہلیہ کے مطابق رشید صاحب تقریباً ساڑھے تین سال بریلی میں ملازم رہے۔ گویا رشید صاحب اوائل ۱۹۴۶ء سے وسط ۱۹۴۹ء تک بریلی میں ملازمت کرتے رہے۔ کلیم صاحب سے سہو ہو سکتا ہے لیکن رشید صاحب کی اہلیہ سے اس کا امکان نہیں کیوں کہ انھوں نے اپنے شوہر سے دُوری کا یہ عرصہ جس تنگ دستی اور مشکلات میں بسر کیا، اُسے بھلانا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ یوں بیگم رشید حسن خاں کے بیان کے مطابق اوائل ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۹ء میں مدرسۂ فیضِ عام میں مدّرس کی ملازمت ملنے تک رشید حسن خاں بریلی میں رہے، چناں چہ اس دورانیے میں انھوں نے جن تین چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کا ذکر کیا ہے (آنا چکی پر منشی گیری، زمین دار کے کارندے کے طور پر اور راشن ڈپو پر منشی گیری) وہ بریلی کے زمانے کی یادگار ہو سکتی ہیں۔

۱۹۴۹ء میں وہ شاہ جہاں پور واپس آ گئے۔ یہاں اُنھیں مدرسۂ فیضِ عام میں مدّرس کی جگہ مل گئی۔ رشید صاحب کو مدرسے

کے طلبہ کو درسِ نظامی کی ابتدائی کتابیں پڑھاتھیں۔جلد ہی انھیں محسوس ہوا کہ طلبہ اُن سے درس لینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔کچھ دنوں بعد یہ بات تب کھلی جب طلبہ نے مہتمم مدرسہ سے شکایت کی کہ اُستادِ محترم تو داڑھی منڈاتے ہیں،اس لیے وہ اُن سے نہیں پڑھ سکتے۔مہتمم مدرسہ: رشید حسن خاں کے دوست اور کرم فرما تھے۔انھوں نے رشید صاحب سے طلبہ کی شکایت کے بارے میں بات کی اور کہا کہ داڑھی تو ضرور رکھنی پڑے گی ورنہ مدرسے میں آپ کی مخالفت زیادہ ہو جائے گی۔رشید صاحب نے رشوت کی داڑھی رکھنے سے انکار کر دیا۔مہتمم چوں کہ رشید صاحب کے دوست اور کرم فرما بھی تھے،اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ انھیں مدرسے کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑیں، چناں چہ درمیانی راستہ یہ نکالا گیا کہ انھیں درسِ نظامی کے بجائے منشی فاضل،مولوی فاضل اور منشی کامل کے طلبہ کو امتحانات کی تیاری کرانے پر مامور کر دیا گیا۔اس پر سبھی مطمئن ہو گئے۔ (۲۳) مدرسۂ فیضِ عام میں انھوں نے ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء تک فرائض انجام دیے۔

اسی زمانے میں ۱۹۵۲ء میں اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول،شاہ جہان پور میں فارسی اور اُردو کے اُستاد کی خالی اسامی پر بھرتی ہونے لگی۔(۲۴) رشید صاحب نے بھی اس جگہ کے لیے درخواست دے دی۔اگر چہ رشید صاحب کو یہ ملازمت مل گئی لیکن اس کے ساتھ ایک دل چسپ واقعہ بھی وابستہ ہے۔یہ واقعہ خود رشید صاحب کی زبانی ملاحظہ کیجیے:

> ''اس جگہ کے لیے ہمارے شہر کے مولوی محمد یوسف صاحب بھی اُمیدوار تھے، جو گورنمنٹ اسکول میں اس وقت ٹیچر تھے اور ریٹائر ہونے والے تھے۔وہ شہر کی ایک بڑی مسجد کے امام تھے اور بہت لوگوں کے پیر بھی تھے۔ مشہور شخص تھے۔وہ دو تین سال کے لیے اس اسکول میں ملازمت کرنا چاہتے تھے۔میرے اُستاد مولوی مجتبیٰ حسن خاں صاحب میرے لیے کوشاں تھے اور ان کے اثرات سے میرا کام یاب ہونا یقینی سا تھا۔مولانا یوسف صاحب نے بعد نمازِ جمعہ منبر سے یہ اعلان کیا کہ یہ شخص چوں کہ کمیونسٹوں کے ساتھ ٹریڈ یونین میں کام کرتا رہا ہے اور کمیونزم کو مانتا ہے،اس لیے یہ مسلمان نہیں ہو سکتا،اور ایسے شخص کو اسلامیہ اسکول میں جگہ کیسے دی جا سکتی ہے۔یہ گویا تر پ کا پتا تھا مگر افسوس کہ انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔''(۲۵)

ڈاکٹر خلیق انجم نے مولوی صاحب کے اس واقعے کو مدرسۂ فیضِ عام سے جوڑا ہے۔(۲۶)

۱۶/اپریل ۱۹۵۳ء کو اُن کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی۔اس کا نام خورشید حسن خاں رکھا گیا۔(۲۷)

رشید صاحب کا بیان ہے کہ اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں ملازمت حاصل کرنے تک وہ عربی فارسی بورڈ،یوپی سے مولوی کا امتحان پاس کر چکے تھے،جب کہ شعبۂ مشرقی،لکھنؤ یونیورسٹی سے دبیرِ کامل کے امتحان میں امتیازی نمبروں کے ساتھ کامیابی حاصل کر چکے تھے۔(۲۸) امکان ہے کہ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء کے زمانے میں چھوٹی موٹی نوکریوں کے دوران انھیں ان امتحانات کی تیاری کرنے اور امتحانات دینے کا موقع نہ ملا ہوگا۔بہت حد تک ممکن ہے کہ یہ فراغت اور موقع انھیں مدرسۂ فیضِ عام میں ملازمت کے دوران ملا ہو۔یوں قیاساً اُن کے مولوی اور دبیرِ کامل کے امتحانات پاس کرنے کا دورانیہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء کا زمانہ رہا ہوگا۔

۱۹۵۲ء سے وسط ۱۹۵۹ء تک رشید حسن خاں نے اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول،شاہ جہان پور میں خدمات انجام دیں۔(۲۹) اگست ۱۹۵۹ء میں وہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر ملازم ہو گئے۔بعد میں اسی جگہ ترقی کر کے ریسرچ ایسوسی ایٹ ہوئے۔(۳۰) رفعت سروش لکھتے ہیں۔

"وہ ۶۰ء کے آس پاس شاہ جہان پور سے دہلی آئے تھے اور دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں ملازم ہو گئے تھے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی بھی ان کے ہم پیشہ تھے مگر وہ پرائیویٹ امتحان دے دے کر پی ایچ ڈی کی [کذا] اور پھر پروفیسر ہو گئے لیکن رشید حسن خاں لائبریری کے کارکن ہی رہے۔ ویسے وہ ریسرچ اسکالروں کے گائیڈ بھی تھے اور نہ جانے کتنے "ادبی ڈاکٹروں" نے خاں صاحب سے فیض اُٹھایا ہوگا۔"(۳۱)

رشید صاحب کے دہلی یونیورسٹی لائبریری سے وابستہ ہونے کی بابت تسلیم غوری بدایونی نے بھی لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"خاں صاحب سے میرے تعلقات اس زمانے سے تھے جب وہ دہلی میں مقیم تھے اور دہلی یونیورسٹی کی لائبریری سے وابستہ تھے۔" (۳۲)

حیرت یہ ہے کہ خود رشید صاحب نے کہیں بھی کتب خانۂ جامعہ دہلی سے اپنی وابستگی کے بارے میں نہیں لکھا۔

جہاں تک رشید صاحب کے "ریسرچ اسکالروں کے گائیڈ" ہونے کی بات ہے تو اس کا ذکر نہ رشید صاحب نے کیا، نہ کسی اور نے۔ لگتا ہے رفعت سروش صاحب اپنی رو میں ممتحن کو گائیڈ لکھ گئے جب کہ دونوں میں واضح فرق ہے۔ ڈاکٹر اسلم پرویز نے اپنے مضمون میں یہ لکھا ہے کہ رشید حسن خاں: ایم فل اور پی ایچ ڈی کے سندی مقالات کے ممتحن بنائے جاتے تھے۔ (۳۳)

رشید حسن خاں کی دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ملازمت کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

"-----خاں صاحب اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں ملازم ہو گئے اور یہیں انھوں نے عروض اور قواعد پر کچھ مضامین لکھے جن کی وجہ سے خواجہ احمد فاروقی کی نظرِ انتخاب پڑی اور خواجہ صاحب انھیں دہلی یونیورسٹی کے اُردو شعبے میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر لے آئے۔"(۳۴)

اسی مضمون میں ڈاکٹر خلیق انجم نے رشید صاحب سے متعلق کچھ واقعات تحریر کیے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ دہلی یونیورسٹی میں آمد سے قبل اہلِ علم؛ رشید صاحب کی تحریروں سے متاثر تھے۔

اسی ذیل میں سیّد عابد حسن کلیم کا یہ بیان بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں:

"ڈاکٹر قمر رئیس کی کوشش سے انھیں دہلی یونیورسٹی میں سروس مل گئی۔"(۳۵)

ڈاکٹر قمر رئیس کا تعلق بھی شاہ جہاں پور سے ہے اور تفصیلات کے مطابق رشید صاحب اور قمر رئیس صاحب میں گاڑھی چھنتی رہی ہے، اس لیے اس کا بھی قوی امکان ہے کہ قمر رئیس نے کوشش کر کے خواجہ احمد فاروقی کے ذریعے رشید صاحب کا تقرر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں کرایا ہو۔

شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی کی ملازمت ہی کے سلسلے میں ڈاکٹر شمس بدایونی رقم طراز ہیں:

"اگست ۱۹۵۹ء میں شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر ان کا تقرر ہوا۔ یہ تقرر عارضی تھا۔ ۱۹۶۴ء میں اسے کُل وقتی منظوری حاصل ہو گئی۔"(۳۶)

اگست ۱۹۵۹ء تا دسمبر ۱۹۸۹ء تیس سال سے زائد عرصے تک رشید صاحب نے شعبۂ اُردو، دہلی یونیورسٹی میں تحقیقی خدمات انجام دیں اور ۳۱ دسمبر ۱۹۸۹ء کو ذرا سا قبل از وقت یہاں سے سبک دوش ہوئے۔ (۳۷)

سبک دوشی کے بعد بھی رشید حسن خاں ۱۹۹۶ء تک دہلی میں ہی رہے۔ اس سلسلے میں رشید حسن خاں کے بیٹے خورشید حسن خاں کا

یہ بیان قابلِ توجہ ہے:

"دہلی یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد ۱۹۹۶ء میں وہ اپنے وطن شاہ جہاں پور واپس آئے اور ہم لوگوں کے ساتھ رہنے لگے۔"[۳۸]

ڈاکٹر شمس بدایونی نے اپنے مضمون میں رشید صاحب کی شاہ جہاں پور مستقل واپسی کی تاریخ ۲ فروری ۱۹۹۶ء لکھی ہے اور اس کے لیے اپنے نام رشید صاحب کے خط کا حوالہ دیا ہے۔[۳۹] خود رشید صاحب کے خط سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

شاہ جہاں پور میں وہ اپنے علمی و تدوینی کاموں میں مصروف ہو گئے۔ عمر کے ستر برس عبور کرنے تک وہ بعض عوارض کا شکار ہو چکے تھے۔ ۱۹۹۰ء کے بعد، دہلی کے زمانۂ قیام میں وہ ذیابیطس کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے جس کے باعث انجائنا کا مرض بھی اُنھیں لاحق ہو گیا۔[۴۰] ستمبر ۱۹۹۵ء تک اُن کی آنکھوں اور دل کے آپریشن ہو چکے تھے اور وہ کھانے میں احتیاط برت رہے تھے۔ بھاری غذا، روشن و مسالے دار اشیا کی ممانعت تھی۔ ناشتے میں دلیا، دوپہر اور رات کے کھانے میں دال مونگ، چنے کا شوربہ، خشک روٹی اور سلاد کھاتے تھے۔[۴۱] اسی سلسلے میں علاج کے لیے یکم اگست ۱۹۹۸ء کو اُن کے بمبئی جانے کی بھی شہادت ملتی ہے۔[۴۲] اس کے علاوہ اور جگہ بھی زیرِ علاج رہے ہوں گے۔ ڈاکٹر ٹی آر رینا اوائل نومبر ۲۰۰۵ء میں رشید صاحب سے ملے تھے۔ وہ اُن کے اُس وقت کے عوارض سے متعلق لکھتے ہیں:

"خاں صاحب..... (نے) جواب دیا: ..... میں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتا۔ بات کرنے میں تھوڑی تکلیف ہوتی ہے۔ سانس پھولنے لگتی ہے۔"[۴۳]

"آج کل موسم تبدیل ہو رہا ہے۔ سردی شروع ہونے پر میں کام کے لیے بیٹھ نہیں سکتا۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ جُھک کے بیٹھنا مشکل ہوتا ہے۔ میرے گھٹنے میں بہت درد رہتا ہے۔ کمرے میں بھی چلنا پھرنا نہیں ہوتا۔ تین سالوں سے میں نے باہر جانے کے لیے اپنی دہلیز پار نہیں کی۔ پراسٹریٹ کی تکلیف بھی ہے۔ پیٹ اکثر خراب رہتا ہے۔ صبح سے شام تک دوائیاں وقت پر لینی پڑتی ہیں۔ سانس پھولنے لگتا ہے۔ زیادہ حرکت کرنے کے لیے ڈاکٹروں نے سختی سے منع کیا ہے۔ اب گھر کی چار دیواری کے اندر مقید ہو کر رہ گیا ہوں۔ جب موسم گرما شروع ہوگا تو میں اچھی طرح کام کاج کرنے لگوں گا۔"[۴۴]

اسی طرح کی بات رشید صاحب نے ڈاکٹر ممتاز احمد خاں (مظفر پور، بہار) کے نام ۷ نومبر ۲۰۰۵ء کے خط میں لکھی ہے۔ اس خط میں گھر سے باہر نہ جانے کی سخت ہدایت ڈاکٹر کی جانب سے لکھی ہے کیوں کہ "سانس کی رفتار اچانک بگڑ جایا کرتی ہے۔"[۴۵] ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ان کے علاوہ خاں صاحب کے عوارض میں بے خوابی اور پھیپھڑوں کی خرابی کا بھی اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے عبدالوہاب خاں سلیم کے نام رشید صاحب کے دسمبر (غالباً ۲۰۰۵ء) کے خط کا ذکر کیا ہے، جس میں رشید صاحب نے لکھا:

"سردی کا موسم مجھے راس نہیں آتا۔ اب پچھلے مہینے کے اواخر سے احوال یہ ہے کہ سر جُھکا کر ذرا دیر بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ ریزش، چھینکیں اور آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔ لکھنا پڑھنا بند ہے۔"[۴۶]

مذکورہ بالا تفصیلات سے علم ہوا کہ اپنی زندگی کے آخری کم و بیش تیرہ سال (تقریباً ۱۹۹۴ء سے ۲۰۰۶ء تک) رشید صاحب مختلف عوارض میں مبتلا رہے اور آخری تین چار سال تو ان عوارض کی شدت میں ایسا اضافہ ہوا کہ اُن کے لیے بیٹھ کر کام کرنا تقریباً

ناممکن ہوگیا۔انھی عوارض کے باعث بالآخر ۱۵اور ۱۶فروری ۲۰۰۶ءکی شب وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔(۴۷)

۲۹ مارچ ۲۰۰۳ءکورشید صاحب کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا تھا۔اس سانحے کا رشید صاحب کودلی دُکھ ہوااور وہ اپنی زندگی میں خلا سا محسوس کرنے لگے۔(۴۸) اُن کی اہلیہ نے زندگی کے نامساعد حالات میں بھی اپنے شوہر کا ساتھ حوصلے اور پامردی سے دیا تھا۔رشید صاحب نے اپنی اہلیہ کی تعریف کرتے ہوئے ۲۰۰۲ءمیں لکھا:

> ”۱۹۴۵ءمیں میری شادی ہوچکی تھی۔۔بے حد قانع اورصابروشاکر بیوی ملی تھی جس نے بے حد استقلال اور خوش دلی کے ساتھ اُن دنوں رفاقت کا حق ادا کیااور یہ روش آج بھی برقرار ہے۔“(۴۹)

رشید حسن خاں کے دیگر متعلقین میں دو بیٹے اورایک بیٹی موجود ہیں۔بیٹوں کے نام خورشید حسن خاں اور خالد حسن خاں ہیں جو شاہ جہان پور میں اُردُو کے اُستاد ہیں۔بیٹی کا نام نادرہ بیگم اوراُن کے شوہر کا نام مقصود حسن خاں ہے جو ڈرافٹ انجینئر ہیں۔(۵۰) ڈاکٹرٹی آر رینا نے رشید صاحب کے پوتے پوتیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔(۵۱) خورشید حسن خاں نے بھی اپنے چھوٹے بھائی کے بچوں کا ذکر کیا ہے۔(۵۲)

محمد ایوب واقف نے رشید حسن خاں کی ظاہری شباہت کی کچھ تفصیل قلم بند کی ہے:

> ”ان کی ہمہ جہت اور مہتم بالشان شخصیت میں اتنی کشش اوراثر پذیری تھی کہ آدمی پہلی فرصت میں اُن سے مرعوب ہوجاتا تھا۔میرے دل ودماغ پران کی ہمہ گیریت کا بہت گہرااثر تھا..............ان کا سراپا نگاہوں میں سرایت کر گیا۔متوسط قد وقامت کے رشید حسن خاں صاحب کا گورا چٹا چہرہ اپنی تمام تر ضیاپاشیوں کے ساتھ سامنے متحرک رہا تھا۔چوڑی پیشانی، تجسس دکھتی آنکھیں،سر پر گھنے اور پیچھے کی جانب مُڑے ہوئے سفید بال،اس پرستوؤہ ناک اوربڑے بڑے کان ان کے سراپے کوخوب صورت بنانے کے لیے کافی تھے۔“(۵۳)

دہلی میں رشید صاحب کا قیام تقریباً ساڑھے چھتیس برس رہا(اگست ۱۹۵۹ءتا ۲فروری ۱۹۹۶ء)۔شروع میں ان کی رہائش گاہ کے طور پر متعدد جگہوں کی عمارتوں کا ذکر ملتا ہے۔ڈاکٹر اسلم پرویز کے مطابق دلّی آنے کے بعد رشید صاحب کا قیام ”کچھ دنوں“ کے لیے سرسیّد روڈ (دریا گنج) پرواقع سرسید کے مکان میں رہا۔وہاں سے ملنے اس مکان میں جاتے رہے ہیں۔(۵۴) ڈاکٹرخلیق انجم کے مطابق شروع شروع میں شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے سامنے ٹیوٹوریل بلڈنگ میں رشید صاحب کوایک کشادہ کمرہ ملا جس میں کتابوں کے لیے چند الماریاں بھی تھیں (۵۵)۔جگن ناتھ آزاد نے ۱۹۶۳ءسے قبل دہلی یونیورسٹی کے قریب لکھنؤ روڈ کے ایک مکان میں رشید حسن خاں اور قمر رئیس کی رہائش کے بارے میں لکھا ہے(۵۶)۔بعد میں وہ دہلی یونیورسٹی کے گوائر ہال میں منتقل ہوگئے اور شاہ جہاں پور مستقل واپسی تک اسی یونیورسٹی ہاسٹل میں گزراوقات کرتے رہے(۵۷)۔گوائر ہال میں انھیں دو کمرے ملے ہوئے تھے۔شمیم حنفی صاحب کے مطابق دونوں کمرے کتابوں سے بھرے تھے(۵۸)۔میرے ایک دوست محمد علی انجم کی زبانی روایت کے مطابق اگست ۱۹۹۵ءمیں وہ دہلی گئے تو ایک روز دوپہر کے وقت رشید صاحب سے ملنے گوائر ہال بھی گئے۔وہ کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک بہت بڑا کمرہ ہے جس میں چاروں طرف کتابوں کی الماریاں ہیں۔کمرے میں کوئی شخص نظر نہ آیا تو وہ کمرے میں داخل ہوکر دس بارہ قدم آگے آئے۔کمرے کی سامنے والی دیوار کے قریب انھیں ایک میز نظر آئی جس کے اوپر مناسب روشنی والا ایک بلب جل رہا تھااور میز کے پیچھے کرسی پر، چاروں جانب سے کتابوں میں گھرے رشید صاحب لکھنے میں

معروف تھے(۵۹)۔

رشید صاحب تمام زندگی کچھ معمولات پر سختی سے کاربند رہے۔اس کے باعث ان کی طبیعت میں استقلال اور کام میں باقاعدگی پیدا ہوئی۔اپنے روزانہ کے معمولات کے بارے میں رشید صاحب لکھتے ہیں:

''میرے معمولات میں ۱۹۵۹ء کے بعد بہت کم تبدیلی آئی ہے، یوں کہوں کہ گویا نہیں آئی۔صبح پانچ بجے اٹھتا ہوں۔ہر موسم میں ساڑھے پانچ بجے کے قریب نہاتا ہوں، شدید سردی کے زمانے میں بھی اس کا ناغہ نہیں ہوتا (بیماری کی بات الگ ہے)، پھر چھ بجے سادہ چائے پیتا ہوں، لیمن ٹی۔آٹھ بجے ناشتا کرتا ہوں۔چھ بجے لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں، آٹھ بجے تک پھر نو بجے سے ایک بجے تک۔ایک بجے دوپہر کا کھانا کھاتا ہوں۔دو گھنٹے آرام کرتا ہوں، ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق.... تین بجے اُٹھ کر چائے پیتا ہوں اور پھر آٹھ بجے تک کام کرتا ہوں۔شام کی خبریں سن کر ساڑھے نو بجے بستر پر لیٹ جاتا ہوں۔

''دہلی یونیورسٹی کے ہوسٹل میں رہتا رہا.... کھانا ناشتا میس میں ملتا تھا۔میں ناشتا کر لیا کرتا تھا.... چائے اپنے کمرے میں آ کر پیتا تھا، خود بنا کر۔

''کافی ہاؤس میں پابندی سے بیٹھا کرتا تھا، جب تک دہلی میں رہا، مگر ہمیشہ تنہا.... مجلس آرائی کا میں قائل نہیں۔فضول باتوں کا شوق نہیں، اتنا وقت ہی نہیں ملا کبھی، مزاج بھی یہ نہیں۔اب جب دہلی جانا ہوتا ہے تو کافی ہاؤس ضرور جاتا ہوں، کم سے کم دو بار۔یونیورسٹی کافی ہاؤس میری پسندیدہ جگہ ہے۔یہاں کے بیرے بڑے تربیت یافتہ تھے اور مردم شناس۔مہینے کی آخری تاریخوں میں اکثر جیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے مگر یونیورسٹی کافی ہاؤس کا ناغہ نہیں ہوتا تھا۔پرانا بیرا تھا۔اس کو خوب معلوم تھا کہ جیب میں پیسے ہوں گے، فوراً دے جائیں گے، نہیں ہوں گے تو نہیں۔اس نے کبھی پیسے نہیں مانگے، کبھی بل لا کر ٹیبل پر نہیں رکھا۔دو دن، تین دن، چار دن۔جب تنخواہ ملی، اسی دن ادائگی [کذا] کر دی۔نہ اس نے حساب بتایا، نہ اس سے پوچھا۔کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ کمی بیشی ہوئی ہے''(۶۰)۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے رشید صاحب کے معمولات میں وقت کی پابندی کی جو عملی مثالیں اپنے مضمون میں پیش کی ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ عمر بھر ان کے معمولات اور مقررہ اوقات کار میں کوئی فرق نہیں آیا(۶۱)۔عبداللہ ولی بخش قادری کے مطابق ۱۹۹۳ء تک رشید صاحب بلا ناغہ ہر اتوار کو صبح دس بجے ان کے ہاں اوکھلا، جامعہ نگر آتے تھے۔یہاں دوستوں کے جمگھٹے میں دنیا جہان کے موضوعات پر بحث مباحثہ ہوتا اور رشید صاحب کھل کر ان دوستانہ بحثوں میں حصہ لیتے تھے(۶۲)۔

دہلی میں قیام کے دوران ایک تو دہلی یونیورسٹی کے منصبی فرائض تھے، اس سے ہٹ کر دیگر اہل علم بھی رشید صاحب کی صلاحیتوں سے مستفید ہونے کے راستے نکالتے رہتے تھے، چناں چہ وہ بھارت کی مختلف جامعات، مثلاً بمبئی، جموں، جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی میں توسیعی لیکچر دینے کے لیے بلائے جاتے تھے۔اس کے علاوہ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے سندی مقالات کے ممتحن بھی بنائے گئے(۶۳)۔ڈاکٹر اشفاق محمد خاں نے بتایا ہے کہ رشید صاحب سے ان کا تعلق قائم ہونے کے بعد دہلی میں رشید صاحب کے قیام کے زمانے تک وہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی میں ایم فل کے طلبہ کو توسیعی لیکچر دینے کے لیے انھیں برابر زحمت دیتے رہے(۶۴)۔رفعت سروش نے ساٹھ کی دہائی میں رشید صاحب کی ریڈیو کے ادبی

پروگراموں میں شرکت کے بارے میں تفصیل دی ہے (۶۵)۔ یہ سب اضافی ذمے داریاں تھیں جو رشید صاحب دہلی کے زمانۂ قیام میں انجام دیتے رہے۔

عمومی شہرت کے باوصف رشید حسن خاں خشک طبیعت کے آدمی نہیں تھے۔ تحقیق اور مطالعہ و تصنیف کے ساتھ ساتھ دیگر مشاغل بھی ان کی زندگی کا حصہ تھے۔ ان مشاغل میں کھیلوں میں دل چسپی سرِفہرست ہے۔ کھیلوں میں بھی انھیں ہاکی کا کھیل زیادہ پسند تھا۔ ان کے اپنے مطابق انھیں ہاکی کے کھیل میں شروع ہی سے دل چسپی رہی اور یہ دل چسپی آخر تک برقرار رہی۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۹ء تک انھوں نے خود بھی ہاکی کھیلی۔ ہاکی کے علاوہ کبڈی کا کھیل بھی انھوں نے کھیلا۔ فٹ بال، والی بال اور باسکٹ بال سے بھی انھیں دل چسپی تھی، لیکن دیکھنے کی حد تک۔ ہاکی اور فٹ بال کے میچ وہ باقاعدگی اور انہماک سے دیکھا کرتے تھے۔ اس انہماک اور دل چسپی کے باعث ان کے تحقیقی کاموں پر ذرا بھی اثر نہیں پڑتا تھا (۶۶)۔ رشید صاحب کے بیٹے خورشید حسن خاں نے کھیلوں کے علاوہ ڈراموں سے رشید صاحب کی دل چسپی کے بارے میں لکھا ہے اور بتایا ہے کہ انھوں نے کئی ڈرامے رشید صاحب کے ساتھ دیکھے (۶۷)۔

پہناوے اور کھانے پینے میں رکھ رکھاؤ اور بعض معمولات کی پابندی کا ذکر ان کے بعض جاننے والوں نے کیا ہے۔ ان کے پہناوے کے بارے میں ڈاکٹر اسلم پرویز ذیل کی تفصیل مہیا کرتے ہیں:

> ''خاں صاحب لباس کے بارے میں بھی وضع کے پابند ہیں۔ گرمیوں میں بوشرٹ، پتلون اور چمڑے کے براؤن رنگ کے سینڈل پہنتے ہیں۔ جاڑوں میں پوری آستین کی قمیض، پتلون اور وہی براؤن رنگ کا لیس والا جوتا۔ بوشرٹ اور قمیض ہمیشہ چیک کی ہوتی ہے۔ ہاتھ پر ویسٹ اینڈ کمپنی کی گھڑی'' (۶۸)۔

جامہ زیبی میں رشید صاحب کے قریبے کی دادا نور خاں نے بھی دی ہے۔ دہلی کے معمولات میں کھانے پینے میں ان کے معمول کا ذکر ہو چکا ہے، کچھ اور معمولات کا ذکر کرتے ہوئے انور خاں لکھتے ہیں:

> ''کسی خاص ریستوران میں داخل ہونے سے پہلے وہ تسلی کر لیتے ہیں کہ صاف ستھرا اور کچھ قریبے کا ہے۔ ریستوران میں چائے پر کافی کو ترجیح دیں گے اور اگر فلٹر کافی مل جائے تو کیا کہنے! اخذا تھوڑی ہو مگر اچھی ہو'' (۶۹)۔

رشید صاحب کے بیٹے خورشید حسن خاں کا کہنا ہے کہ رشید صاحب کو بہترین کھانے کا بھی شوق تھا۔ گھر میں وہ اکثر مچھلی، مرغ وغیرہ پکواتے تھے۔ وفات سے ایک روز قبل بھی اپنے چھوٹے بیٹے سے مچھلی کی فرمائش کی لیکن وہ ان کے نصیب میں نہ ہو سکی (۷۰)۔

اخلاقی خصوصیات انسانی شخصیت کا لازمہ ہیں۔ رشید صاحب کی شخصیت میں اچھے اخلاق کی چند ایسی خصوصیات بھی موجود تھیں۔ رشید صاحب لکھتے ہیں:

> ''خاندانی روایت، نسلی اثرات اور مقامی خصوصیات نے شروع ہی سے صاف گوئی کا عادی بنا دیا تھا۔ اسی نے تحقیق کی طرف متوجہ کیا .....''
>
> ''میں صاف، سادہ، واضح اور دوٹوک انداز میں بات کہنا چاہتا ہوں اور اس سے مجھے مطلق دل چسپی نہیں کہ لوگ اسے مثبت سمجھیں گے یا منفی۔ .... مجھے سچ کی تلاش ہے۔ .... میں صلح سمجھوتے کا قائل نہیں'' (۷۱)۔

ان کے قریبی دوست ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی لکھتے ہیں:

''وہ صاف گو، سچے، معاملات کے کھرے اور بڑے نوک پلک درست رکھنے کے قائل تھے۔ ان کا لباس، وضع قطع، اخلاق و آداب، گفتگو، غرض کہ ہر شے میں ایک ستھرا پن، شائستگی اور طبقۂ اشرافیہ کے سے انداز تھے'' (۷۲)۔

ان کی صاف گوئی کا اعادہ بعض دیگر مضمون نگاروں نے بھی کیا ہے۔ سچائی کی تلاش میں خلوص اور صاف گوئی کے اوصاف رشید صاحب کی تحقیق میں گہرائی اور معیار کا سبب بنے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے رشید حسن خاں کی آزاد فکری، روشن خیالی اور دور اندیشی کا ذکر کیا ہے (۷۳)۔ نامی انصاری کا مشاہدہ ہے کہ رشید صاحب عادتاً شائستہ، نرم خو اور خلیق تھے (۷۴)۔ رفعت سروش نے ان کی مروّت اور اعلیٰ اخلاق کا واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک بار انھوں نے ریڈیو کے ادبی پروگرام ''بزمِ ادب'' میں رشید صاحب کو خواجہ احمد فاروقی کی کتاب پر تنقید کے لیے بلایا۔ رشید صاحب نے رفعت سروش کا خیال کرتے ہوئے اپنا نشری تنقیدی تجزیہ متوازن رکھا اور کھل کر کتاب پر تنقید نہیں کی، چناں چہ وہ ریکارڈ شدہ پروگرام بغیر تدوین کے جوں کا توں نشر کیا گیا (۷۵)۔

کالی داس گپتا رضاؔ نے اپنے مضمون میں رشید صاحب کے خطوط سے مثالیں پیش کر کے ان کی کچھ اور خوبیوں کو واضح کیا ہے۔ ایک خط میں رشید صاحب نے اپنی مدوّنہ ''گلزارِ نسیم'' میں خود اپنی غلطی سے رضاؔ صاحب کو آگاہ کیا (۷۶)۔ اس سے معلوم ہوا کہ خاں صاحب کو اپنی غلطی تسلیم کرنے میں کوئی عار نہ تھی۔ اسی طرح دوسروں کے اچھے کاموں کی تعریف کرنے میں بھی وہ کنجوسی کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے، جیسا کہ عام طور پر مشاہیر میں پایا جاتا ہے، چناں چہ رشید صاحب نے رضاؔ صاحب کی بعض کتابوں کے افادی پہلوؤں کی دل کھول کر تعریف کی ہے (۷۷)۔ مخمور سعیدی نے اپنی مثال پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے اور رشید صاحب نے غالبؔ کی ''دستنبو'' کا اردو ترجمہ کیا جو دہلی سے ساتھ ساتھ شائع ہوئے۔ رشید صاحب نے مخمور صاحب کے ترجمے کی داد ان الفاظ میں دی:

''آپ نے صرف کتاب کے مفہوم کو نہیں، غالبؔ کے اسلوب کو بھی اُردو میں منتقل کر دیا ہے'' (۷۸)۔

رضاؔ صاحب نے ان کی زندہ دلی کی مثالیں بھی اپنے مضمون میں پیش کی ہیں (۷۹)۔

خورشید حسن خاں اور انور خاں نے رشید صاحب کی کچھ اور اخلاقی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ رشید صاحب خواتین اور بچوں سے شفقت سے پیش آتے اور ان کی معروفیات اور دل چسپیوں پر ان سے گفتگو کرتے۔ اس وجہ سے مخاطب ان سے انسیّت محسوس کرتا۔ رشید صاحب اپنے تلامذہ کو گھر اور دفتر کی ذمّے داریاں بہ خوبی نبھانے اور بے پروائی نہ برتنے کا مشورہ دیتے جو ان کے خلوصِ نیّت پر دال ہے۔ عام معمولات میں دل چسپی لینا اور ہر طرح کے ماحول میں نباہ کرنا بھی ان کی شخصیت کی نمایاں خوبی تھی (۸۰)۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے واضح کیا ہے کہ رشید صاحب کم گو اور کم آمیز تھے۔ ہم مزاج لوگوں سے ہی ملتے تھے۔ شعبہ جاتی سیاست اور سازشوں سے دامن بچا کر رکھتے۔ یوں اگرچہ وہ گوشہ گیر سے ہو گئے تھے لیکن سنجیدہ ریسرچ اسکالروں کی ہر ممکن مدد کرتے۔ انھیں سب سے زیادہ ریسرچ اسکالروں سے قربت تھی (۸۱)۔

رشید صاحب کے بیٹے نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ رشید صاحب خشک اور کھردری

طبیعت کے شخص تھے، حال آں کہ ایسا نہیں۔ وہ بہت خوش مزاج اور ملن سار تھے۔ ان کے دروازے سائلینِ علم کے لیے کھلے رہتے تھے۔ طلبہ کے لیے انھوں نے وقت مقرر کر رکھا تھا۔ انھیں وقت برباد کرنے سے سخت نفرت تھی، اس لیے ایسے لوگوں سے نہ ملتے۔ وہ ہر ایک سے شیریں بیانی سے پیش آتے۔ جب کوئی بلند آواز سے بولتا یا شور مچاتا تو انھیں غصہ آتا تھا۔ اپنے بیٹوں سے بے تکلفی تھی۔ ضرورت مندوں کی مالی مدد کرتے۔ کسی کی پریشانی ان سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اصول پسند اور وقت کے بہت پابند تھے۔ بے ترتیبی ناپسند کرتے تھے۔ اپنی ترتیب پسند تھی، اس لیے اگر کوئی چیز ان کی ترتیب سے ہٹی ہوئی نظر آتی تو بہت ناراض ہوتے۔ کرپن کے خلاف تھے اور میانہ روی کو پسند کرتے تھے۔ شعائرِ اسلام کی پابندی کرنے کی نصیحت اور نماز پڑھنے کی تلقین کرتے، ہمیں احادیثِ مبارکہ بتاتے۔ زندگی کے ہر معاملے پر ہم سے گفتگو کرتے۔ اپنے خیالات ضرور بیان کرتے لیکن اپنی پسند دوسروں پر تھوپتے نہیں تھے۔ ان کی لکھنے کی میز پر کتابیں، قلم، کاغذ، پیپر ویٹ وغیرہ سلیقے اور ترتیب سے رکھے ہوتے۔ اچھے قلم انہیں بڑے پسند تھے۔ ہر قسم کے غیر ملکی قلم ان کے میز کی آرائش دوبالا کرتے۔ اپنے شاگردوں کا بڑا خیال کرتے اور ان کی عزت و توقیر کرتے۔ خوددار بہت تھے۔ سفارش کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اپنی اولاد کے لیے کبھی سفارش نہیں کی، بلکہ انھیں محنت سے اپنا مقام خود بنانے کی تلقین کرتے۔ تعلیم کی اہمیت سے وہ بخوبی واقف تھے اور اکثر کہتے تھے کہ تعلیم کے بغیر قومیں ترقی نہیں کر سکتیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر فکرمند ہوتے تھے۔ مدرسوں میں دینی تعلیم کے ساتھ جدید علوم کی تعلیم کو بھی ضروری خیال کرتے تھے، خصوصاً انگریزی، سائنس اور کمپیوٹر کی تعلیم پر زیادہ زور دیتے تاکہ بچوں کو آگے جا کر اپنی تعلیم جاری رکھنے میں مشکل پیش نہ آئے (۸۲)۔

مختلف حوالوں سے ان کے کچھ دوستوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس سے غالباً دہلی میں آمد سے قبل ہی گہرا دوستانہ تعلق قائم تھا۔ شمیم حنفی نے باقر مہدی سے ان کے دوستانے کا ذکر کیا ہے (۸۳)۔ دونوں میں صاف گوئی کی قدرِ مشترک غالباً دونوں کی دوستی کی وجہ تھی۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے گوپال متل اور اپنے ساتھ دوستی کی تفصیلات مہیا کی ہیں (۸۴)۔ گوپال متل سے دوستی کا ذکر رفعت سروش نے بھی کیا ہے۔ (۸۵) خورشید حسن خاں نے ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور ڈاکٹر اسلم پرویز کو دہلی میں رشید صاحب کے خاص ملنے والوں میں شمار کیا ہے۔ (۸۶) پاکستان میں ان کا قریبی تعلق مشفق خواجہ اور ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے تھا۔

کالی داس گپتا رضا نے لکھا ہے کہ رشید صاحب خط نگاری میں بھی منفرد طبیعت رکھتے تھے۔ وہ خطوط کا جواب لکھنے کے بعد عموماً خطوط تلف کر دیتے تھے۔ (۸۷) اس طرح مکتوب الیہ اور مکتوب نگار کے لیے بے تکلفی سے خط لکھنا ممکن ہوتا ہے۔

رشید صاحب نے شاعری کو اپنی تنہائی کا رفیق قرار دیا تھا۔ شاعری کو ان کی زندگی میں کیا مقام حاصل تھا، اس کا علم ان کے اس بیان سے ہوتا ہے:

> ''میں تنہائی کے لمحوں میں پہلے دن سے آج تک شاعری کو سب سے زیادہ رفیق رکھتا ہوں، کیوں کہ میرا خیال ہی نہیں، عقیدہ بھی ہے کہ شعر: محفل میں پڑھنے کی چیز نہیں: زور سے پڑھنے کی چیز نہیں۔ جب زور سے شعر پڑھا جاتا ہے تو اپنی آب و تاب آدھی کھو دیتا ہے، جیسے کوئی بہت اچھا گانا ہو اور ٹرانسسٹر کو بہت اونچا کر دیا جائے تو گانے کی خوبی آدھے سے زیادہ ختم ہو جاتی ہے۔ جب میں تنہا ہوتا ہوں، پریشان ہوتا ہوں، گھبرایا ہوا ہوتا [ہوں] تو صرف شاعری سے اپنا دل بہلاتا ہوں لیکن کسی کو سناتا نہیں اور اس شاعری کو پڑھتا ہوں جو پہلے میرے ذہن پر حملہ نہ کرے بلکہ میرے دل میں اتر جائے۔ میں شاعری پڑھتا ہوں اور اس میں قدیم و جدید کی تخصیص نہیں۔ میں نئے نئے

شاعروں کو بھی پڑھتا ہوں۔فیضؔ کو اتنی بار پڑھا ہے کہ بہت سے فیضؔ پرستوں نے بھی شاید اتنی بار نہ پڑھا ہو"(۸۸)۔

گیتا رضاؔ نے لطافتِ شعری سے ان کے گہرے لگاؤ اور فنِ شعر، عروض، محاورہ روزمرہ سے گہری واقفیت کا ذکر کیا ہے(۸۹)۔اس امر کا اندازہ رشید صاحب کے تحقیقی مضامین اور تدوینات کو دیکھ کر بھی بہ خوبی ہوتا ہے۔شعر فہمی کے علاوہ شعر گوئی سے بھی انھیں طبعی مناسبت تھی لیکن کبھی شاعری کرنے کی کوشش نہیں کی۔شمیم حنفی نے ایک ادبی مذاکرے میں ان کے فی البدیہہ شعر کہنے کا واقعہ اپنے مضمون میں لکھا ہے (۹۰)۔

شعری ذوق کے ساتھ ساتھ ذوقِ نقد بھی ان کی طبیعت میں رچا ہوا تھا۔انھیں حالیؔ اور کلیم الدین احمد بطور نقاد پسند تھے۔ کلیم الدین احمد کے ذکر میں انھوں نے تنقیدی تحریروں کا معیاری اسلوب یوں واضح کیا ہے:

> ''حالیؔ، کلیم الدین احمد ... کی تنقیدی زبان کو، ان کے لہجے کو، ان کے اسلوب کو میں تنقید کا سچا اسلوب سمجھتا ہوں۔ کلیم الدین احمد سے شدید ترین اختلافات ہیں.... یہاں ان سے بحث نہیں.... حالیؔ کے یہاں یہ ہے کہ سادگی کا عنصر کچھ زیادہ ہوگیا ہے۔کلیم الدین چوں کہ مغربی ادب سے اچھی واقفیت رکھتے تھے اور قدیم ادب سے بھی خوب واقف تھے۔اس چیز نے ان کے یہاں ایک توازن رکھا ہے، تو کلیم الدین کا اسلوب حالیؔ کے اسلوب کی ترقی یافتہ صورت ہے؛ روشن، واضح، جس میں کوئی ابہام نہیں، کوئی انشا پردازی کی لہریں نہیں اور کوئی قول محال نہیں'' (۹۱)۔

احتشام حسین کا اندازِ نقد بھی انھیں پسند تھا لیکن وہ شاکی تھے کہ احتشام حسین اپنے نظریے کے سخت اور ایمان داری کے ساتھ پابند تھے، غالباً اسی جانب داری کے سبب ان کا تنقیدی اسلوب رشید صاحب کے ذہن میں نہیں سما سکا۔اُن کے نزدیک کچھ زمانے تک اسلوب احمد انصاری کا اسلوب بھی تنقید کا اندازِ نگارش رہا ہے۔اس کی وجہ بھی اسلوب صاحب کی انگریزی ادبیات سے گہری واقفیت ہے(۹۲)۔

مطالعے کا بھی انھیں شروع ہی سے شوق تھا۔انھوں نے لکھا ہے کہ فیکٹری کی ملازمت کے دوران جب ان کی عمر ابھی بیس سال کے لگ بھگ تھی؛ انھوں نے ''آبِ حیات'' اور ''طلسمِ ہوش ربا'' کی تمام جلدوں کا مطالعہ کیا، پھر ''نگار'' ان مطالعے میں رہنے لگا۔آہستہ آہستہ فارسی شاعری اور اُردو کلاسیکی ادب کا مطالعہ بڑھنے لگا جس نے ان کی مزاج گری میں بڑا کردار ادا کیا۔ان کے مطابق یونین کی سیاست سے مایوسی کے دور میں وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر اس کے اسیر ہو جاتے اگر کلاسیکی ادب کے مطالعے نے ان کی طبیعت میں ذوق اور معیار کا ایک تصور نہ پیدا کر دیا ہوتا (۹۳)۔لغت، صرف ونحو، رسم خط، عروض وقواعد، تاریخ ادب اور تنقید بھی شروع ہی سے ان کی دل چسپی اور تحقیق کے موضوعات رہے(۹۴)۔اسی دل چسپی کے باعث وہ کثیر المطالعہ تھے۔ ان کے سینے میں علم کا ایک سمندر تھا اور وہ اسے فیاضی سے خرچ کرتے تھے۔ادب کی تقریباً ہر صنف اور موضوع کے حوالے سے ان کے مطالعے اور معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔قدیم ادب ہو کہ جدید ادب، شاعری ہو کہ نثر، تحقیق ہو کہ تدوین، تخلیق وتنقید ہو کہ زبان، لسانیات، لغت نگاری کے مباحث؛ ہر موضوع پر معلومات کو اس وضاحت کے ساتھ پیش کرتے کہ تشنگی باقی نہ رہتی اور سامع جواب سے مطمئن دکھائی دیتا(۹۵)۔

رشید حسن خاں کو اُردو سے بے حد لگاؤ تھا۔انھوں نے اُردو زبان اور املا کی اصلاح کے لیے کتابیں لکھیں، خطبات اور لیکچر

دیےاور عملی کام بھی انجام دیے۔ان کے بیٹے خورشید حسن خاں کا بیان ہے کہ وہ اوران کے بھائی اُردُو کے استاد ہیں اور رشید صاحب اکثر ان سے طلبہ کی اُردُو تدریس سے متعلق دریافت کرتے تھے۔اس کے علاوہ رشید صاحب اپنے پوتوں کو روزانہ ایک گھنٹا اُردُو پڑھاتے تھے۔اُردُو سے رشید صاحب کی اس گہری دل چسپی کے نتیجے میں ان کے اہل عیال میں سب لوگ اُردُو پڑھے ہوئے ہیں(۹۶)۔رشید صاحب نے ایک بار اطہر فاروقی کے ساتھ بات چیت میں بھی اُردُو کے خلاف سیاسی سازشوں کا ذکر کر کے اُردُو کی حمایت میں اپنے خیالات کا تفصیل سے اظہار کیا تھا۔وہ پاکستان میں اُردُو کی زبوں حالی سے بھی آگاہ تھے اور اس پر تاسف کا اظہار کرتے تھے(۹۷)۔

رشید صاحب فارسی اور اُردُو زبانوں میں ماہرانہ دست گاہ رکھتے تھے۔وہ کبھی اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم نہیں رہے۔اُردُو اور فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں میں ان کی شُد بُد اکتسابی تھی۔ان کے اپنے بیان کے مطابق فیکٹری ملازمت کے دوران انھوں نے محلّے کے ایک پنڈت جی سے ہندی کی پہلی کتاب پڑھی، پھر ہندی میں کسی قدر مشق بہم پہنچائی۔اس کے نتیجے میں وہ ہندی پڑھ تو لیتے تھے، لکھ نہیں سکتے تھے۔رشتے کے ایک بھائی صاحب سے انگریزی کی ''کنگ ریڈر'' پڑھی، پھر انگریزی اخبار خوانی کی مشق کی۔اس باعث وہ انگریزی کی ہلکی پھلکی کتابیں آسانی کے ساتھ پڑھ سکتے تھے اور حوالے کی کتابوں سے بہ خوبی استفادہ کر لیتے تھے(۹۸)۔ساقی انصاری نے لکھا ہے کہ رشید صاحب انگریزی سے تقریباً نا واقف تھے(۹۹)۔ ان کے تحقیقی کاموں میں کئی انگریزی کتابوں اور عبارتوں کے حوالے موجود ہیں، چناں چہ یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ رشید صاحب انگریزی زبان سے ''تقریباً نا واقف'' تھے۔

تحقیق کا شوق اور طبعی مناسبت انھیں کیسے حاصل ہوئی؟اس سے متعلق انھوں نے تفصیلی معلومات دی ہیں۔ان کے مطابق ان کے دل میں تحقیق کے نقوش اوّل اوّل مدرسے کے استادِ محترم کی اس بات سے بیٹھے کہ ہر بات کی تصدیق کر لینی چاہیے۔سنی سنائی بات پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔روایت اور درایت کے اصولوں کی تعلیم اور منطق کا مطالعہ بھی اس سلسلے میں معاون ہوا۔اس کے ساتھ ساتھ گھر میں والد صاحب اور اردگرد کے دیگر افراد کے کھرے پن اور عدم مفاہمت کے رویّے نے بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۴۴ء کے قریب ماہ نامہ ''نگار'' (لکھنؤ) اور نیاز فتح پوری کی تحریریں مطالعے میں آئیں تو ان کی علمیّت اور اندازِ تحریر نے مزاج پر بڑا اثر ڈالا۔تشکیک، دلیل کا مطالبہ، شہادت اور گواہی کا تصور اور روایت کی پرکھ کے متعلقات کا شعور ابتداً نیاز فتح پوری کی تحریروں سے ہوا۔اس کے ساتھ مولانا شبلی کی ''شعرالعجم'' کا مطالعہ بھی مؤثر ثابت ہوا۔اسی دوران انھوں نے حافظ محمود شیرانی، مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود اور عبدالستار صدیقی کی تحقیقی تحریروں کا مطالعہ کیا تو نیاز فتح پوری اور مولانا شبلی کی تحریروں کا سحر ٹوٹا اور انھیں علم ہوا کہ نیاز اور شبلی کا اندازِ تحریر یقیناً مؤثر ہے لیکن دونوں ادیب تحقیق میں خاصے کمزور ہیں(۱۰۰)۔

رشید صاحب کے اپنے بیان کے مطابق لغت، زبان کے مسائل، عروض، قواعد، زبان و بیان، رسمِ خط، ادبی تحقیق، تدوین، تاریخ ادب اور تنقید ان کے پسندیدہ موضوعاتِ تحقیق تھے۔ (۱۰۱) لغات و زبان دانی اور املا وغیرہ سے دل چسپی کی وجہ یہ تھی کہ ان کی بنیادی تعلیم مدرسے کی عربی و فارسی تعلیم تھی جس میں دو سال تک قواعدِ زبان کی تعلیم دی جاتی تھی۔اس سے ذہن میں عبارت اور لفظوں کو ناپنے کا پیمانہ بن جاتا ہے۔

لغات ومتعلقاتِ زبان پر مطالعہ وتحریر کا آغاز انھوں نے ۴۶۔ ۱۹۴۵ء میں کیا۔املا پر سب سے پہلے انھوں نے عبدالستار صدیقی کی تحریروں کا مطالعہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ اردو والوں نے املا کی معیار بندی کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔کم و بیش زمانہ سے کچھ فرصت پا کر ۱۹۶۰ء میں انھوں نے اُردو املا پر اپنی تحقیق کے کام کا آغاز کیا اور موضوع پر متعلقہ مواد کا مطالعہ شروع کر دیا۔تیرہ سال کی محنت کے بعد ۱۹۷۳ء میں انھوں نے اپنی تحقیقات مکمل کیں اور اسے کتابی صورت میں ''اُردو املا'' کے نام سے شائع کرایا۔رشید صاحب نے ایک سے زیادہ جگہوں پر یہ وضاحت کی ہے کہ انھوں نے اُردو املا میں کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ اسے سہل بنایا ہے۔مختلف الفاظ کی ایک سے زیادہ رائج شکلوں اور املا میں سے معیاری شکلوں اور املا کی نشان دہی کی ہے۔املا پر ان کے کام کی بنیاد انجمن ترقیِ اُردو ہند کی شائع ہونے والی وہ رپورٹ ہے جو سہ ماہی ''اُردو'' میں ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئی۔یہ رپورٹ اصل میں اس کمیٹی کی سفارشات پر مبنی تھی جو ۱۹۴۳ء میں انجمن ترقیِ اُردو ہند نے قائم کی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اس کے معتمد (سیکرٹری) تھے(۱۰۲)۔

رشید صاحب تحقیق میں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کو اپنا معنوی استاد تسلیم کرتے تھے اور اعتراف کرتے تھے کہ انھوں نے ان محققین کی تحریروں سے تحقیق وتدوین کے اصول اور آداب سیکھے (۱۰۳)۔

رشید صاحب کے تدوینی کاموں کے معیار سے متاثر ہو کر ڈاکٹر گیان چند جین نے انھیں ''خدائے تدوین'' کا خطاب دیا۔(۱۰۴)

رشید صاحب کو شہرت، دولت اور نام ونمود کی خواہش نہیں تھی اور وہ اسے تحقیق کی طبعی مناسبت کے خلاف سمجھتے۔کالی داس گپتا رضاؔ کے نام ۶ دسمبر ۱۹۹۵ء کے ایک خط میں رشید صاحب نے لکھا کہ محققین کے حصے میں ہمیشہ بے قدری آئی ہے۔شہرتِ عام ویسے بھی محقق کو راس نہیں آتی، نہ محقق کے کام کی ہوتی ہے (۱۰۵)۔ایک اور جگہ انھوں نے محقق کی خصوصیات کے سلسلے میں لکھا کہ محقق میں صبر، تحمل اور قوتِ برداشت ہونی چاہیے اور دنیا کو حاصل کرنے کا جذبہ کم سے کم ہونا چاہیے۔اس کے علاوہ محقق کو کثیر المطالعہ ہونا چاہیے۔اسے پڑھنا زیادہ اور لکھنا کم چاہیے۔سہل انگاری اور غیر ضروری موضوعات کا انتخاب بھی تحقیق گش ہوتا ہے(۱۰۶)۔

رشید صاحب اپنی زندگی اور حاصلات سے مطمئن تھے۔تحقیق جیسے غیر منفعت بخش کام میں عمر گزارنے پر انھیں کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔اپنی وفات سے چند سال قبل انھوں نے خود لکھا کہ انھوں نے سوچ سمجھ کر تحقیق جیسے گھاٹے کے سودے کا انتخاب کیا اور انھیں اس پر کوئی پچھتاوا نہیں۔ان کا ضمیر مطمئن تھا۔کبھی غلط کی حمایت اور سچ کی مخالفت نہیں کی، اسی وجہ سے پاک وہند کے کئی لوگ ان سے ناخوش تھے لیکن انھوں نے اسے کبھی اہمیت نہیں دی۔وہ اپنی زندگی اور کارگزاری سے قطعی مطمئن اور خوش تھے(۱۰۷)۔

تصانیف وتدوینات رشید حسن خاں (۵۴)

۱۔ باغ وبہار (از میر امّن دہلوی) [تدوین، مقدمہ]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ ۱۹۶۴ء۔

۲۔ مقدمۂ شعر وشاعری (از مولانا الطاف حسین حالیؔ) [تدوین، مقدمہ]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ ۱۹۶۹ء۔

۳۔ انتخابِ نظیر اکبرآبادی (از ولی محمد نظیر اکبرآبادی) [انتخاب، تدوین، مقدمہ]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ ۱۹۷۰ء۔

۴۔ دیوانِ دردؔ (از خواجہ میر دردؔ دہلوی) [تدوین، مقدمہ]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ ۱۹۷۱ء۔

۵۔ انتخابِ مراثیِ انیسؔ ودبیرؔ (از میر انیسؔ ومرزا دبیرؔ) [انتخاب، تدوین، مقدمہ]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ ۱۹۷۱ء۔

۶۔ انتخابِ شبلی (مضامین) (از مولانا شبلی نعمانی) [انتخاب، تدوین، مقدمہ]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ ۱۹۷۱ء۔

۷۔ انتخابِ سوداؔ (از مرزا محمد رفیع سوداؔ) [انتخاب، تدوین، مقدمہ]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ ۱۹۷۲ء۔

۸۔ انتخابِ ناسخؔ (از امام بخش ناسخؔ لکھنوی) [انتخاب، تدوین، مقدمہ]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ ۱۹۷۲ء۔ طبعِ دوم: کراچی، انجمنِ ترقیِ اُردو پاکستان۔ ۱۹۹۶ء۔

۹۔ حیاتِ سعدیؔ (از مولانا الطاف حسین حالیؔ) [تدوین، مقدمہ]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔

۱۰۔ موازنۂ انیسؔ ودبیرؔ (از مولانا شبلی نعمانی) [تدوین، مقدمہ]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔

۱۱۔ گذشتۂ لکھنؤ (از عبدالحلیم شررؔ لکھنوی) [تدوین، مقدمہ]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔

۱۲۔ اُردو املا

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، ترقی اُردو بورڈ۔ ۱۹۷۴ء۔ طبعِ دوم: لاہور، فکشن ہاؤس۔ ۱۹ء۔ طبعِ سوم: نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان۔ ۱۹۹۸ء۔

۱۳۔ اُردو کیسے لکھیں (صحیح املا)

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ ۱۹۷۵ء۔ طبعِ دوم: لاہور، الحمد سنز۔ ۲۰۰۷ء۔

۱۴۔ زبان اور قواعد (لغت، تلفظ اور قواعدِ شاعری پر مضامین)

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، ترقی اُردو بورڈ۔ ۱۹۷۶ء۔ طبعِ ثانی: ایضاً [ترقی اُردو بیورو]۔ ۱۹۸۳ء۔

۱۵۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ (نظریاتی اور عملی تحقیق پر مضامین)

اشاعتِ اوّل: علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ ۱۹۷۵ء۔ طبعِ دوم: لاہور، الفیصل۔ ۱۹۸۹ء۔

طبعِ سوم: لکھنؤ، اُتر پردیش اُردو اکادمی۔ ۱۹۹۰ء۔

۱۶۔ تلاش و تعبیر (تنقیدی مضامین)

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، ناشر مصنف۔ ۱۹۸۸ء۔

۱۷۔ فسانۂ عجائب (از رجب علی بیگ سرور) [تدوین، مقدمہ، حواشی، لغات]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، انجمن ترقی اُردو ہند۔ ۱۹۹۰ء۔ طبعِ دوم: لاہور، نقوش، اپریل ۱۹۹۰ء۔

طبعِ سوم: نئی دہلی، انجمن ترقی اُردو ہند۔ ۱۹۹۶ء۔

۱۸۔ باغ و بہار (از میر امّن دہلوی) [تدوینِ جدید، مقدمہ، حواشی، لغات]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، انجمنِ ترقی اُردو ہند۔ ۱۹۹۲ء۔ طبعِ دوم: لاہور، نقوش۔ ۱۹۹۲ء۔

طبعِ سوم: نئی دہلی، انجمنِ ترقی اُردو ہند۔ ۱۹۹۷ء۔

۱۹۔ تفہیم (تحقیقی و تنقیدی مضامین)

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ ۱۹۹۳ء۔

۲۰۔ انشا اور تلفّظ

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ پیامِ تعلیم۔ دسمبر ۱۹۹۳ء۔ طبعِ دوم: لاہور، الحمد سنز۔ ۲۰۰۷ء۔

۲۱۔ عبارت کیسے لکھیں

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ پیامِ تعلیم۔ ۱۹۹۴ء۔ طبعِ دوم: لاہور، الحمد سنز۔ ۲۰۰۷ء۔

۲۲۔ انشائے غالب (از مرزا غالب) [تدوین، مقدمہ]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ۔ اکتوبر ۱۹۹۴ء۔

۲۳۔ مثنوی گلزارِ نسیم (از پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی) [تدوین، مقدمہ، حواشی، لغات]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، انجمنِ ترقی اُردو ہند۔ ۱۹۹۵ء۔

۲۴۔ مثنویاتِ شوق (از نواب مرزا شوق لکھنوی) [تدوین، مقدمہ، حواشی، لغات]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، انجمنِ ترقی اُردو ہند۔ ۱۹۹۸ء۔ طبعِ دوم: کراچی، انجمن ترقی اُردو پاکستان۔ ۱۹۹۸ء۔

۲۵۔ تدوین۔تحقیق، روایت (تحقیقی مضامین کا مجموعہ)

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، ناشر مصنف۔ ۱۹۹۹ء۔

۲۶۔ سحرالبیان (از میر غلام حسن حسؔن دہلوی) [تدوین، مقدمہ، حواشی، لغات]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، انجمن ترقّیِ اُردو ہند۔ ۲۰۰۰ء۔

۲۷۔ املاے غالبؔ

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، غالبؔ انسٹی ٹیوٹ۔ ۲۰۰۰ء۔ طبع دوم: کراچی، ادارۂ یادگارِ غالبؔ۔ ۲۰۰۱ء۔

۲۸۔ مصطلحاتِ ٹھگی (از علی اکبر الہٰ آبادی) [تدوین، مقدمہ، حواشی]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، ناشر مدوّن، ۲۰۰۲ء۔ طبع دوم: لاہور، دارالنوادر۔ ۲۰۰۵ء۔

۲۹۔ کلاسیکی اَدب کی فرہنگ (پہلی جلد)

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، انجمن ترقّیِ اُردو ہند۔ ۲۰۰۳ء۔

۳۰۔ زٹل نامہ (کلیاتِ جعفر زٹلی) [تدوین، مقدمہ، حواشی، لغات]

اشاعتِ اوّل: نئی دہلی، ناشر مدوّن۔ ۲۰۰۳ء۔

۳۱۔ گنجینۂ معنی کا طلسم (لفظیاتِ غالبؔ۔ مسودہ تقریباً ڈیڑھ ہزار صفحات پر مشتمل ہے) زیرِ طبع: انجمن ترقّیِ اُردو ہند، نئی دہلی۔

نامکمل منصوبے

۱۔ غرائب اللغات (از عبدالواسع ہانسوی)

۲۔ قصائدِ سوؔدا (از مرزا محمد رفیع سوؔدا)

۳۔ امراؤ جان ادا (از مرزا محمد ہادی مرزؔا رسوؔا)

۴۔ کلیاتِ اقبالؔ (اُردو)

حواشی و تعلیقات

۱۔ ''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ''، ص ۹؛ ''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش)، ص ۱۳۹؛ ''رشید حسن خاں'' (نامی انصاری)، ص ۱۵۰۔

۲۔ ''رشید حسن خاں'' (نامی انصاری)، ص ۱۵۲، حاشیہ از ادارہ؛ ''رشید حسن خاں کی یادیں'' (نکہت بریلوی)، ص ۱۵۳، ۱۵۵۔

۳۔ ''کچھ اپنے بارے میں''، ص ۱۵۷۔ ایک جگہ رشید صاحب نے تعلیمی اسناد میں پیدائش کی تاریخ ۱۰ جنوری ۱۹۳۰ء لکھی ہے [''رشید حسن خاں: یادوں کے آئینے میں''، ص ۳۳]۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۳۰ جنوری کا اندراج غلطی کی بنا پر کردیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کمپوزنگ کی غلطی ہو۔

۴۔ ''رشید حسن خاں کی یادیں''، ص ۳۰۔

۵۔ ''کچھ اپنے بارے میں''، ص ۱۵۷۔

۶۔ ''رشید حسن خاں: یادوں کے آئینے میں''، ص ۱۹۔

۷۔ اطہر فاروقی نے ہڑتال کا دورانیہ ۴۳ دن لکھا ہے۔[''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ''، ۱۰]۔ خود رشید حسن خاں نے بھی ایک جگہ ہڑتال کا یہی دورانیہ بیان کیا ہے [خود نوشت حالات در مجلّہ ''اظہار''، بمبئی، شمارہ ۵: جنوری ۱۹۸۴ء، بحوالہ ''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ''، ص ۱۲]

۸۔ ایضاً، ص ۱۵۹، ۱۶۰۔ اطہر فاروقی نے لکھا ہے: ''اس فیکٹری میں ۱۹۴۱ء کے آخر میں چھپ چھپا کر پہلی مزدور یونین بنائی گئی۔'' [''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ''، ص ۱۰] ظاہر ہے خود رشید حسن خاں کے بیان کے بعد یہ بیان درست نہیں رہا۔

۹۔ ''رشید حسن کاں کی یادیں''، ص ۳۱۔

۱۰۔ ''کچھ اپنے بارے میں''، ص ۱۶۰۔

۱۱۔ خود نوشت حالات در مجلّہ ''اظہار''، بمبئی، شمارہ ۵: جنوری ۱۹۸۴ء، بحوالہ ''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ''، ص ۱۲، ۱۳۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۳۔

۱۳۔ ''کچھ اپنے بارے میں''، ص ۱۶۰۔

۱۴۔ ''رشید حسن کی یادیں''، ص ۳۱۔

۱۵۔ ''کچھ اپنے بارے میں'' ص ۱۶۰۔

۱۶، ۱۷، ۱۸۔ ''رشید حسن کی یادیں'': ۳۱۔

۱۹۔ ''کچھ اپنے بارے میں''، ص ۱۵۸۔

۲۰۔ ''رشید حسن خاں کی یادیں''، ص ۳۱۔

۲۱، ۲۲۔ ''کچھ اپنے بارے میں''، ص ۱۵۹۔

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۵۸۔ اطہر فاروقی کا بیان ہے: ''عربی مدرسے کے طلبہ نے ان سے پڑھنے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد رشید صاحب کو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پڑھانے کے لیے دوسری جماعت میں بھیج دیا گیا۔'' [''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ''، ص ۱۰] ۔ رشید صاحب نے مدرسۂ فیضِ عام میں دوسری جماعت کے بچوں کو پڑھانے کی بات کہیں نہیں لکھی۔ اُن کے اپنے بیان کے مطابق:

''مجھ کو اس پر ہوا کہ میں درسِ نظامی کے بجائے منشی، مولوی اور منشی کامل کے امتحانات کی تیاری کراؤں اور اس کے پر بھی مطمئن ہو گئے۔''

[''کچھ اپنے بارے میں''، ص ۱۵۸]

۲۴۔ اطہر فاروقی نے فارسی اُردو کے بجائے فارسی عربی اُستاد کی جگہ خالی ہونے کا لکھا ہے [ایضاً] ۔ یہ درست نہیں۔

۲۵۔ ''کچھ اپنے بارے میں''، ص ۱۵۹۔

۲۶۔ ''ممتاز محقق اور تنقید نگار، رشید حسن خاں''، ص ۴۔

۲۷۔ ''رشید حسن خاں کی یاد میں''، ۳۱۔

۲۸۔ ''کچھ اپنے بارے میں''، ص ۱۵۹۔

۲۹۔ ''انھوں نے ۱۱ سال تک اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول (شاہ جہاں پور) میں اُردو اور فارسی کی تدریسی خدمات انجام دیں۔'' [''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش): تعارف از ادارہ، ص ۱۴۶] معلوم ہوتا ہے کہ سہ ماہی ''روشنائی'' کے مدیران نے اسلامیہ ہائر سیکنڈری اسکول میں ملازمت کا دورانیہ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۹ء تک شمار کیا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں رشید صاحب مدرسہ فیضِ عام میں مدرّس ہوئے تھے جب کہ اسلامیہ اسکول میں ملازمت ۱۹۵۲ء میں اختیار کی۔ یوں اسلامیہ اسکول میں اُن کی ملازمت کا دورانیہ ۱۹۵۲ء سے وسط ۱۹۵۹ء اور عرصہ کم و بیش سات سال بنتا ہے۔

۳۰۔ ''کچھ اپنے بارے میں''، ص ۱۵۹۔ سہ ماہی ''روشنائی'' (کراچی) میں تحریر ہے: ''......انھوں نے دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ افسر کے عہدے پر ۱۹۹۹ء تک کام کیا۔'' [''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش): تعارف از ادارہ، ص ۱۴۶]۔ ظاہر ہے یہ درست نہیں۔ دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ افسر کا کوئی عہدہ موجود نہیں تھا۔ یہ عہدہ یونیورسٹی کے کسی شعبے میں تو ہو سکتا تھا اور اس عہدے کا نام ''ریسرچ افسر'' بھی نہیں تھا۔ رشید صاحب شعبۂ اُردو میں ملازم تھے اور انھوں نے یہاں ''ریسرچ اسسٹنٹ'' اور ''ریسرچ ایسوسی ایٹ'' کے طور پر فرائض انجام دیے تھے۔

۳۱۔ ''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش)، ص ۱۴۷۔

۳۲۔ ''رشید حسن خاں: کچھ یادیں، کچھ باتیں''، ص ۱۳۔

۳۳، ۳۴۔ ''رشید حسن خاں: ادب اور زندگی کی ایک متوازن شخصیت''، ص ۶۔

۳۵، ۳۶۔ ''رشید حسن خاں کی یاد میں''، ص ۳۱۔

۳۷۔ ''کچھ اپنے بارے میں''، ص ۱۵۹۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے مضمون میں سبک دوشی کی تاریخ ۱۳ دسمبر ۱۹۸۹ء درج ہے [رشید حسن خاں: اُردو تحقیق کا رجلِ رشید''، ص ۴۷]۔ ۱۳ دسمبر یقیناً کمپوزنگ کی غلطی ہے۔ ہاشمی صاحب نے ۳۱ دسمبر ہی لکھا ہوگا۔

۳۸۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی و غیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو''، ص ۱۱۔

۳۹۔ ''رشید حسن خاں کی یاد میں''، ص ۱۳۰ اور ۳۱۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۳۱۔

۴۱۔ ''رشید حسن خاں: یادوں کے آئینے میں''، ۱۹۔

۴۲۔ ''رشید حسن خاں کی یاد میں''، ص ۳۰۔

۴۳۔ ''رشید حسن خاں: یادوں کے آئینے میں''، ص ۳۲۔

۴۴۔ ایضاً، ص ۳۳۔

۴۵۔ ''رشید حسن خاں: میرے مشفق، میرے اُستاد''، ص ۱۵۔

۴۶۔ ''رشید حسن خاں: اُردو تحقیق کا رجلِ رشید''، ص ۵۰۔

۴۷۔ ''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش)، ص ۱۴۷۔

۴۸۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی و غیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو''، ص ۱۱؛ ''رشید حسن خاں کی یاد میں''، ص ۳۱۔

۴۹۔ ''کچھ اپنے بارے میں''، ص ۱۶۰۔

۵۰۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی و غیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو''، ص ۱۱؛ ''رشید حسن خاں کی یاد میں''، ص ۳۱۔

۵۱۔ ''رشید حسن خاں: یادوں کے آئینے میں''، ص ۱۹۔

۵۲۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی وغیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو''،ص ۱۱۔

۵۳۔ ''رشید حسن خاں: ایک عہد ساز شخصیت''،ص ۱۳۔

۵۴۔ ''رشید حسن خاں: ادب اور زندگی کی ایک متوازن شخصیت''،ص ۵۔

۵۵۔ ''ممتاز محقق اور تنقید نگار: رشید حسن خاں''،ص ۴۔

۵۶۔ ''رشید حسن خاں''(جگن ناتھ آزاد)،ص ۱۱۔

۵۷۔ ''رشید حسن خاں: ادب اور زندگی کی ایک متوازن''،ص ۶۔

۵۸۔ ''خاں صاحب رشید حسن خاں''،ص ۴۵۔

۵۹۔ زبانی روایت جناب محمد علی انجم (مالک و منیجر اظہار سنز، اردو بازار، لاہور)۔

۶۰۔ ''کچھ اپنے بارے میں''،ص ۱۶۳ تا ۱۶۵۔

۶۱۔ ''رشید حسن خاں: ادب اور زندگی کی ایک متوازن شخصیت''،ص ۶۔

۶۲۔ ''ہمارے خاں صاحب''،ص ۱۳۵۔

۶۳۔ ''رشید حسن خاں: ادب اور زندگی کی ایک متوازن شخصیت''،ص ۶۔

۶۴۔ ''رشید حسن خاں صاحب''،ص ۱۷۔

۶۵۔ ''رشید حسن خاں''(رفعت سروش)،ص ۱۴۸۔

۶۶۔ ''کچھ اپنے بارے میں''، ص ۱۶۲، ۱۶۳۔

۶۷۔ ''رشید صاحب کی ادبی وغیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو''،ص ۱۱۔

۶۸۔ ''خاں صاحب''(ڈاکٹر اسلم پرویز)،ص ۳۹، ۴۰۔

۶۹۔ ''رشید حسن خاں کا تنقیدی رویہ اور شخصیت''،ص ۵۶؛ ''قابل قدر عالم، خوش اسلوب انسان''،ص ۴۹۔

۷۰۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی وغیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو''،ص ۱۱۔

۷۱۔ ''رشید حسن خاں''(صدیق الرحمٰن قدوائی)،ص ۲۔

۷۲۔ خود نوشت حالات در مجلہ ''اظہار''، بمبئی: ص ۱۳، ۱۴۔

۷۳۔ ''ممتاز محقق اور تنقید نگار: رشید حسن خاں''،ص ۳۔

۷۴۔ ''رشید حسن خاں''(نامی انصاری)،ص ۱۵۰۔

۷۵۔ ''رشید حسن خاں''(رفعت سروش)،ص ۱۴۸۔

۷۶۔ ''ہمارے خاں صاحب''،ص ۱۰۔

۷۷۔ ایضاً،ص ۱۱۔

۷۸۔ ''خانِ والا شان''،ص ۵۷۔

۷۹۔ ''ہمارے خان صاحب''،ص ۱۲۔

۸۰۔ ''رشید حسن خاں کا تنقیدی رویہ اور شخصیت''،ص ۵۶؛ ''قابل قدر عالم، خوش اسلوب انسان''،ص ۴۹؛ ''رشید حسن خاں ادبی وغیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو''،ص ۱۱۔

۸۱۔ ''ممتاز محقق اور تنقید نگار: رشید حسن خاں''،ص ۴۔

۸۲۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی اور غیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو''،ص ۱۱۔

۸۳۔ ''خاں صاحب رشید حسن خاں''،ص ۴۳۔

۸۴۔ ''ممتاز محقق اور ثقہ نقاد: رشید حسن خاں''،ص ۳۔

۸۵۔ ''رشید حسن خاں''(رفعت سروش)،ص ۱۴۷۔

۸۶۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی وغیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو''،ص ۱۱۔

۸۷۔ ''ہمارے خان صاحب''،ص ۹۔

۸۸۔ مذاکرہ،ص ۵۹۔

۸۹۔ ''ہمارے خاں صاحب''،ص ۹۔

۹۰۔ ''خاں صاحب رشید حسن خاں''،ص ۴۵۔

۹۱۔ ''خاں صاحب سے بات چیت''،ص ۷۲۔

۹۲۔ ایضاً،ص ۷۳۔

۹۳۔ ''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ''،ص ۱۱؛ ''خاں صاحب سے بات چیت''،ص ۷۰،۷۱۔

۹۴۔ ''رشید حسن خاں کا ایک یادگار خط''،ص ۱۵۷،۱۵۸۔

۹۵۔ ''خانِ والا شان''،ص ۵۷؛ ''ہمارے خان صاحب''،ص ۱۳۷۔

۹۶۔ ''رشید حسن خاں کی ادبی وغیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو''،ص ۱۱۔

۹۷۔ ''رشید حسن خاں سے بات چیت''،ص ۶۰ تا ۶۴۔

۹۸۔ ''کچھ اپنے بارے میں''،ص ۱۵۸۔

۹۹۔ ''رشید حسن خاں''(نامی انصاری)،ص ۱۵۰۔

۱۰۰۔ ''کچھ اپنے بارے میں''،ص ۱۲۰ تا ۱۲۳؛ ''خاں صاحب سے بات چیت''،ص ۴۰ تا ۴۲۔

۱۰۱۔ خودنوشت حالات در مجلّہ ''اظہار''، بمبئی،ص ۱۳؛ ''رشید حسن خاں کا ایک یادگار خط''،ص ۱۵۸۔

۱۰۲۔ مذاکرہ،ص ۵۱۔

۱۰۳۔ خودنوشت حالات در مجلّہ ''اظہار''، بمبئی،ص ۱۱؛ ''رشید حسن خاں سے ایک انٹرویو''،ص ۴۲۔

۱۰۴۔ ''خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ: مثنویاتِ شوق''،ص ۲۹۔

۱۰۵۔ ''ہمارے خاں صاحب''،ص ۱۰۔

۱۰۶۔ مذاکرہ،ص ۵۴،۵۵۔

۱۰۷۔ ''کچھ اپنے بارے میں''،ص ۱۲۶۔

۱۰۸۔ تصانیف و تدوینات رشید حسن خاں کی ترتیب میں ذاتی تحقیق و تلاش کے علاوہ ذیل کے ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے:

۱) ''رشید حسن خاں کی یاد میں''،ص ۴۱، ۴۲۔

کتابیات (مضامین)

۱۔ ادارہ: تعارف بر مضمون ''رشید حسن خاں'' (رفعت سروش)؛ ''ادبی کارگزاریاں: رشید حسن خاں''۔ سہ ماہی ''روشنائی'' (کراچی)۔ جلد ۷، شمارہ ۲۶: جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۴ تا ۱۴۶۔

۲۔ اظہر پرویز: ''رشید حسن خاں: ادب اور زندگی کی ایک متوازن شخصیت''۔ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' (نئی دہلی)۔ جلد ۶۵، شمارہ ۳۳ تا ۳۶: یکم تا ۲۸ ستمبر ۲۰۰۶ء (رشید حسن خاں نمبر)، ص ۵، ۶، ۱۱۔

۳۔ ایضاً: ''خاں صاحب''۔ مشمولہ: ''رشید حسن خاں (شخصیت اور ادبی خدمات)''۔ مرتب: اطہر فاروقی، نئی دہلی، ماہنامہ ''کتاب نما''۔ پہلی بار: جولائی ۲۰۰۳ء، ص ۳۳ تا ۴۰۔

۴۔ اشفاق محمد خاں، ڈاکٹر: ''رشید حسن خاں صاحب''۔ سہ ماہی ''ترسیل'' (بمبئی) شمارہ ۲۱، ۲۲: جنوری تا جون ۱۹۹۹ء، ص ۱۴ تا ۱۸، ۲۸۔

۵۔ اطہر فاروقی: ''رشید حسن خاں کا سوانحی خاکہ''۔ مشمولہ: ''رشید حسن خاں (شخصیت اور ادبی خدمات)''۔ مرتب: اطہر فاروقی، نئی دہلی، ماہنامہ ''کتاب نما''۔ پہلی بار: جولائی ۲۰۰۳ء، ص ۹ تا ۱۸۔

۶۔ انور خاں: ''قاطعِ قدر عالم، خوش اسلوب انسان''۔ مشمولہ: ''رشید حسن خاں (شخصیت اور ادبی خدمات)''۔ مرتب: اطہر فاروقی، نئی دہلی، ماہنامہ ''کتاب نما''۔ پہلی بار: جولائی ۲۰۰۳ء، ص ۴۷ تا ۵۲۔

۷۔ ایضاً: ''رشید حسن خاں کا تنقیدی رویہ اور شخصیت''۔ سہ ماہی ''ترسیل'' (بمبئی) شمارہ ۲۱، ۲۲: جنوری تا جون ۱۹۹۹ء، ص ۵۴ تا ۵۹۔

۸۔ تسلیم غوری بدایونی: ''رشید حسن خاں: کچھ یادیں، کچھ باتیں''۔ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' (نئی دہلی)۔ جلد ۶۵، شمارہ ۳۳ تا ۳۶: یکم تا ۲۸ ستمبر ۲۰۰۶ء (رشید حسن خاں نمبر)، ص ۱۳، ۱۴۔

۹۔ جگن ناتھ آزاد: ''رشید حسن خاں''۔ مشمولہ: ''رشید حسن خاں (شخصیت اور ادبی خدمات)''۔ مرتب: اطہر فاروقی، نئی دہلی، ماہنامہ ''کتاب نما''۔ پہلی بار: جولائی ۲۰۰۳ء، ص ۲۱ تا ۲۴۔

۱۰۔ خلیق انجم، ڈاکٹر: ''ممتاز محقق اور متقی نقاد: رشید حسن خاں''۔ ایضاً، ص ۳، ۴، ۳۰۔

۱۱۔ خورشید حسن خاں: ''رشید حسن خاں کی ادبی و غیر ادبی شخصیت کے مختلف پہلو''۔ ایضاً، ص ۱۱۔

۱۲۔ ایضاً: ''رشید حسن خاں کا ایک یادگار خط بنام محمد اسداللہ (مقیم برلن، جرمنی)''۔ سہ ماہی ''روشنائی'' (کراچی)۔ جلد ۷، شمارہ ۲۶: جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۶ تا ۱۵۸۔

۱۳۔ رشید حسن خاں: ''کچھ اپنے بارے میں''۔ مجلہ ''بازیافت'' (لاہور)۔ شمارہ اوّل: جنوری ۲۰۰۲ء، ص ۱۵۱ تا ۱۶۶۔

۱۴۔ رفعت سروش: ''رشید حسن خاں''۔ سہ ماہی ''روشنائی'' (کراچی)، جلد ۷، شمارہ: ۲۶: جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء، ص ۱۴۷ تا ۱۴۹۔

۱۵۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: ''رشید حسن خاں..... اُردو تحقیق کا رجل رشید''۔ ماہنامہ ''کتاب نما'' (نئی دہلی)۔ جلد ۴۶، شمارہ ۸: اگست ۲۰۰۶ء، ص ۴۷ تا ۵۱۔

۱۶۔ ریحانہ، ڈاکٹر ٹی آر: ''رشید حسن خاں: یادوں کے آئینے میں''۔ ہفت روزہ ''ہماری زبان'' (نئی دہلی)۔ جلد ۶۵، شمارہ ۳۳ تا ۳۶: یکم تا ۲۸ ستمبر ۲۰۰۶ء (رشید حسن خاں نمبر)، ص ۱۸، ۱۹، ۴۲، ۴۳۔

۱۷۔ شمس بدایونی، ڈاکٹر: ''رشید حسن خاں کی یادیں''۔ ایضاً، ص ۹، ۱۰، ۳۰ تا ۳۲۔

۱۸۔ شمیم حنفی: "خاں صاحب رشید حسن خاں" ماہنامہ "کتاب نما" (نئی دہلی)۔ جلد ۳۰، شمارہ ۸: اگست ۱۹۹۰ء۔ ص ۴۲ تا ۴۶۔

۱۹۔ عبداللہ ولی بخش قادری: "ہمارے خاں صاحب"۔ مشمولہ: "رشید حسن خاں (شخصیت اور ادبی خدمات)"۔ مرتب: اطہر فاروقی، نئی دہلی، ماہنامہ "کتاب نما" پہلی بار: جولائی ۲۰۰۳ء۔ ص ۱۳۴ تا ۱۳۷۔

۲۰۔ قدوائی، (ڈاکٹر) صدیق الرحمٰن: "رشید حسن خاں" ہفت روزہ "ہماری زبان" (نئی دہلی)۔ جلد ۶۵، شمارہ ۳۳ تا ۳۶: یکم تا ۲۵ ستمبر ۲۰۰۶ء (رشید حسن خاں نمبر)۔ ص ۲، ۴۲۔

۲۱۔ گیتا رضا کالی داس: "ہمارے خان صاحب"۔ سہ ماہی "ترسیل" (ممبئی) شمارہ ۲۱، ۲۲: جنوری تا جون ۱۹۹۹ء۔ ص ۶ تا ۱۳۔

۲۲۔ گیان چند جین، ڈاکٹر: "خدائے تدوین کا چوتھا صحیفہ: مثنویات شوق"۔ سہ ماہی "ترسیل" (ممبئی) شمارہ ۲۱، ۲۲: جنوری تا جون ۱۹۹۹ء۔ ص ۱۹ تا ۳۵۔

۲۳۔ محمود سعیدی: "خانِ والا شان"۔ مشمولہ: "رشید حسن خاں (شخصیت اور ادبی خدمات)"۔ مرتب: اطہر فاروقی، نئی دہلی، ماہنامہ "کتاب نما" پہلی بار: جولائی ۲۰۰۳ء۔ ص ۵۳ تا ۵۷۔

۲۴۔ معین الدین جینابڑے (مکالمہ نگار): "خاں صاحب سے بات چیت"۔ سہ ماہی "ترسیل" (ممبئی) شمارہ ۲۱، ۲۲: جنوری تا جون ۱۹۹۹ء۔ ص ۲۰ تا ۴۷۔

۲۵۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر: "اُردو تحقیق اور املا کے مسائل سے متعلق رشید حسن خاں سے ایک انٹرویو"۔ ہفت روزہ "ہماری زبان" (نئی دہلی)۔ جلد ۶۵، شمارہ ۳۳ تا ۳۶: یکم تا ۲۵ ستمبر ۲۰۰۶ء (رشید حسن خاں نمبر)۔ ص ۲۰ تا ۲۲۔

۲۶۔ ممتاز احمد خاں، ڈاکٹر: "رشید حسن خاں: میرے مشفق، میرے استاد"۔ ایضاً، ص ۱۵، ۴۲۔

۲۷۔ نامی انصاری: "رشید حسن خاں" سہ ماہی "روشنائی" (کراچی)۔ جلد ۷، شمارہ ۲۷: جولائی تا ستمبر ۲۰۰۶ء۔ ص ۱۵۰ تا ۱۵۲۔

۲۸۔ نگہت بریلوی: "رشید حسن خاں کی یاد میں"۔ ایضاً، حاشیہ از مدیر، ص ۱۵۵۔

۲۹۔ یعقوب میراں مجتہدی: "رشید حسن خاں: چند یادیں"۔ ہفت روزہ "ہماری زبان" (نئی دہلی)۔ جلد ۶۵، شمارہ ۳۳ تا ۳۶: یکم تا ۲۵ ستمبر ۲۰۰۶ء (رشید حسن خاں نمبر)۔ ص ۱۲۔

۳۰۔ مذاکرہ: اُردو زبان میں تحقیق کی اہمیت اور موجودہ صورتِ حال"۔ شخصیت: رشید حسن خاں۔ شرکائے گفتگو: ڈاکٹر معین الرحمٰن، سجاد باقر رضوی، جیلانی کامران، مسعود اشعر، اکرام چغتائی، ذوالفقار تابش۔ ماہنامہ "کتاب نما" (نئی دہلی)۔ اگست ۱۹۹۰ء۔ ص ۵۱ تا ۵۹۔

پروفیسر سید محمد ابوالخیر کشفی

محمد حمزہ فاروقی

میں ۱۹۶۳ء میں کشفی صاحب کے قریب آیا۔ شعبۂ اردو میں بی اے آنرز سال اوّل کے طلبہ ان سے براہ راست تو مستفید نہ ہوئے لیکن ان کی مرتب کردہ میر امن کی "باغ و بہار" ان کے نصاب کا جز و تھی۔ کشفی صاحب اس زمانے میں دو باتوں کے لیے معروف تھے۔ ایک تو "شائبگی صفت" تھی اور دوسرے ان کے عقائد میں پرویزی اثرات کا غلبہ تھا۔ "شائبگی" صفت کا اظہار مختلف مباحثوں اور مذاکروں کے دوران مخالفین پر پلٹنے جھپٹنے اور جھپٹ کر پلٹنے کے روپ میں ہوتا۔ اس میں آپ مولے اور شہباز کی تخصیص روا نہ رکھتے۔ کلاس میں لیکچر کے دوران اگر کسی لڑکے نے شور مچایا، یا خلاف مزاج حرکت کی تو آپ پڑھانا ترک کر دیتے۔ طلبہ منت سماجت کے بعد آپ کے موڈ کو روبراہ لاتے۔

وقت گزرنے کے ساتھ آپ غلام احمد پرویز کے اثر سے نکل آئے اور اقرار حدیث اور عشقِ رسول کو اپنایا بلکہ بعد میں تو دین کو عملی زندگی میں داخل کیا۔ اس کا ایک سبب آپ کا خانقاہی پس منظر تھا۔

کشفی صاحب کا مزاج شعلہ و شبنم کا امتزاج تھا لیکن یہ طے کرنا محال تھا کہ وہ کس وقت شعلہ بداماں اور کب شبنم افشاں ہوتے۔ ان کی تنک مزاجی کا ایک سبب ان کا خلوص اور مصلحت نا اندیشی تھی۔ اگر کوئی بات ان کے مزاج کے خلاف ہوتی تو وہ موقع ملتے ہی جی کی بھڑاس نکال لیتے۔ اس کے بعد نہ دل میں خلش رہتی نہ دماغ پر بوجھ رہتا۔ یہ الگ بات تھی کہ یہ دونوں سامعین کی طرف منتقل ہو جاتیں۔

آپ کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع تھا۔ چنانچہ یونی ورسٹی کے جلسوں میں اکثر بلائے جاتے۔ طبیعت حاضر ہوتی تو ان کی تقریر خاصی معلومات افزا اور دل چسپ ہوتی۔ بے تکلف دوستوں کی محفل میں خوب چہکتے۔ آدمی مخلص اور منافقت سے کوسوں دور تھے۔

کشفی صاحب نے تدریس کا آغاز اسلامیہ کالج کراچی سے ۱۹۵۲ء میں کیا تھا۔ اس زمانے میں آپ ایم اے کے طالب علم تھے۔ دوران تعلیم آپ کے روابط مولوی عبدالحق سے استوار ہوئے۔ مشفق خواجہ نے بیان کیا کہ کشفی صاحب ہندوستان جانا چاہتے تھے، پیسہ پاس نہ تھا۔ آپ مولوی صاحب کے پاس گئے۔ ارادۂ سفر میں ہندوستان سے نادر و نایاب مخطوطات خرید کر لانے کا عزم بھی شامل کر دیا۔ اس مقصدِ عظیم کے ساتھ زادِ راہ کی کمیابی کا ذکر بھی ضمنی طور پر کیا۔ مولوی صاحب نے نہ صرف اس جذبے کو سراہا بلکہ مخطوطات کی خریداری کے لیے کچھ رقم بھی دی۔

رقم ملتے ہی آپ ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے۔ کانپور میں بچھڑے رشتہ داروں سے ملے۔ مختلف شہروں میں گھومے

پھرے، پھر جیسے گئے تھے ویسے ہی خالی ہاتھ لوٹ آئے۔ مولوی صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مخطوطات کے بارے میں دریافت کیا۔ کشفی صاحب نے فرمایا کہ وہ انھیں ساتھ لا رہے تھے لیکن سرحد پر ہندوستانی کسٹم حکام نے انھیں روک لیا اور کہا کہ ہم ان نوادر کو ملک سے باہر نہ جانے دیں گے۔ غالباً اس رکاوٹ میں ہندوانی تعصب بھی کارفرما رہا ہو گا۔ غرض انھوں نے اس "فنکارانہ" انداز میں اس ابتلا کا ذکر کیا کہ مولوی صاحب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے حالانکہ کسٹم کے حکام مخطوطہ شناس تو کجا خطوط شناس بھی نہیں ہوتے۔

کشفی صاحب اور مولوی صاحب کے تعلقات میں اتار چڑھاؤ آتا رہا۔ ابتدائی دور میں آپ مولوی صاحب کے نیازمندوں میں شامل تھے لیکن جس نوعیت کی نیازمندی کا کشفی صاحب مظاہرہ کرتے رہے، اس میں اس کاٹھ کی ہنڈیا کا دیر تک سلامت رہنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب کے دورِ آخر میں کشفی صاحب مولوی صاحب کے مخالف کیمپ میں شامل تھے۔ مولوی صاحب بھی ادھار رکھنے کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے کشفی صاحب کے نام کی مرمت کر ڈالی اور انھیں "ابوالخیر کفشی" قرار دیا۔

کشفی صاحب اور مشفق خواجہ میں استادی شاگردی کا تعلق تھا لیکن ان کی عمروں میں زیادہ فرق نہ تھا۔ آپ ۱۹۵۲ء میں ایم اے کے طالب علم تھے کہ مشفق خواجہ نے اسلامیہ کالج میں انٹر آرٹس داخلہ لیا۔ دونوں عمر کے اس دور میں تھے جب آتش کچھ زیادہ ہی جوان تھا۔ دونوں میں علمی اور ادبی ذوق مشترک تھا لیکن اس کا مظہر غیر علمی مجالس میں ہوتا تھا۔ مثلاً کافی ہاؤس کا پھیرا یا اکٹھے فلم دیکھنا۔ ایک دفعہ ان کے دل میں فلم دیکھنے کی سمائی لیکن "دام و درہم" سے دونوں ہی محروم تھے۔ کشفی صاحب کے زرخیز ذہن نے ایک ترکیب وضع کی۔ جہانگیر روڈ جہاں مشفق خواجہ رہتے تھے، کے قریب ایک سگریٹ والے کی دکان تھی جس سے خواجہ صاحب کا ادھار چلتا تھا۔ کشفی صاحب نے سگریٹ والے سے دس بارہ پیکٹ ادھار لیے اور آگے چل کر ایک پنواڑی کے ہاتھ فروخت کر دیے۔ اس طرح جو رقم ہاتھ آئی وہ فلم بینی کے بعد ہوٹل میں چائے نوشی کے کام آئی۔ اس زمانے میں سینما میں آخری درجے کا ٹکٹ چھ آنے کا ہوتا تھا۔ ان حضرات نے اسی درجے میں بیٹھ کر فلم بینی کا شوق پورا کیا۔

طلبہ کشفی صاحب کی "گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ" کیفیت دیکھ کر ان سے دور رہنے میں ہی عافیت محسوس کرتے تھے لیکن چند طلبہ سے ان کے مراسم خاصے دوستانہ تھے۔ یہ خوش نصیب طلبہ کشفی صاحب کے ناز برداری کرتے جس کا اکثر امتحان کافی ہاؤس میں ہوتا۔ ان مقامات پر کشفی صاحب گفتگو میں شریک غالب رہتے لیکن بل کی ادائیگی میں غلبہ طلبہ کو میسر آتا۔

دیسی طلبہ کے ساتھ مصیبت یہ تھی کہ ایک تو ان کی کرنسی "دیسی" تھی، دوسرے ان میں "استادپرستی" کا وہ جذبہ نہ تھا جس کی غیر ملکی طلبہ میں فراوانی تھی۔ یہ طلبہ کشفی صاحب کے حسنِ طلب پر بخوشی نثار ہو جاتے۔ کشفی صاحب نے چند اشیا کی فرمائش کی۔ غیر ملکی طلبہ وطن سے واپس آتے تو ان کی فرمائشوں سے لدے پھندے آتے۔ ان اشیا کی وصولی کے بعد جب ادائیگی کا مرحلہ آتا تو "فرمائشیں"، "تحفوں" کا روپ دھار لیتیں۔ کشفی صاحب کے لیے فرمائشوں کو تحفوں اور "فتوحات" میں بدلنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اور دائیں ہاتھ کا کھیل وہ مضامین تھے جو کبھی کبھار ان کے قلم سے صادر ہوتے تھے۔ طالب علم اگر چیں بہ چیں کرتا یا اپنی بے زری یا "بے ڈالری" کا رونا روتا تو آپ اس موقع پر استاد کے حقوق اور شاگردوں کی سعادت مندی پر طویل لیکچر دیتے اور ان طلبہ کی مثالیں دیتے جو اساتذہ کی خدمت کر کے بلند مناصب تک پہنچے۔

کشفی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع و متنوع تھا۔ جدید ادب اور مذہبیات کے علاوہ اس میں ابن صفی کے ناول بھی شامل

تھے۔جیسے ہی کوئی ناول شائع ہوتا، آپ اسے اہتمام سے خریدتے، پھر سفر وحضر میں وہ ان کا رفیق رہتا۔بس کے تکلیف دہ سفر کے دوران وہ اس سے آسودہ ہوتے، حتیٰ کہ پیدل چلتے ہوئے بھی ناول خوانی جاری رہتی۔

ان کا دوسرا شوق کرکٹ کمنٹری سننا تھا۔اس زمانے میں ٹیلی ویژن تو تھا نہیں، ریڈیو کے ریڈیو تھا جو لوگوں کے من کی آس اکساتا اور کانوں کی پیاس بجھاتا۔جمشید مارکر اور عمر قریشی اس انداز سے کمنٹری سناتے کہ دیدہ نادیدہ کا فرق مٹ جاتا۔

کشفی صاحب کے متنوع اور دل چسپ مشاغل میں جم کر علمی کام کرنے کی گنجائش نہ تھی۔مطالعہ خاصا وسیع تھا لیکن وہ آوارہ خوانی کو ترجیح دیتے۔آپ کے لیکچروں میں خاص جذب وکیف پایا جاتا تھا۔کشفی صاحب میں مذہبی اقدار کی پاسداری اور تہذیبی روایات کا احساس ابتدا سے تھا اور اسی احساس کو وہ طلبہ میں اجاگر کرنا چاہتے تھے۔نصاب ختم کرانے سے زیادہ ان کا زور ادب فہمی اور زندگی کے حقائق کے حصول پر تھا۔ان کی معلومات سے کئی نسلوں نے فیض پایا۔کراچی یونیورسٹی میں اس زمانے میں منتخب روزگار اساتذہ جمع تھے اور وہ طلبہ کی تعداد میں اضافے کے بجائے اعلیٰ معیار کو ترجیح دیتے تھے۔اب طلبہ کی تعداد تو بہت بڑھ گئی لیکن علمی اور اخلاقی معیار پست ہوتا چلا گیا۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد جب کراچی یونیورسٹی میں تدریسی سرگرمیوں کا آغاز ہوا تو پورے ملک میں جنگ کے اثرات نمایاں تھے۔ہر شخص کی زبان "جنگ زدہ" تھی۔اس سے کشفی صاحب جیسے صاحب دل بھی متاثر ہوئے۔کلاس میں لیکچر کے دوران وہ ادھر ادھر کی باتوں میں نا الجھتے تھے لیکن اس زمانے میں وہ ضمنی طور پر اس کا ذکر کرتے تھے۔انھیں اس جنگ میں اپنوں کی کم حوصلگی اور قیادت کی بزدلی سے شکایت تھی۔

۱۹۶۵ء میں ان کے چھوٹے بھائی سیّد ابوالبرکات نے ایم اے میں داخلہ لیا۔یہ اس زمانے میں نکسلی تھے۔ان کی مستقل رہائش کانپور میں تھی، چنانچہ انھیں ساتھیوں کی جانب سے "بھارتی جاسوس" کا خطاب ملا۔حالانکہ وہ بے چارے اتنے ہی پاکستان دوست تھے جتنے ان کے رفقا پاکستان دوستی کے دعوے دار تھا۔یہ ایم اے کی تکمیل کے بعد ہندوستان لوٹ گئے۔

کشفی صاحب کا مستقل لباس تو پتلون، قمیص یا بش شرٹ ہوتا تھا۔اس پر اضافہ اساتذہ کا مخصوص گاؤن کا ہوتا جسے اساتذہ تدریس کے دوران اوڑھنے کے پابند تھے۔یہی کیفیت طلبہ کی تھی۔وہ یونی ورسٹی کی حدود میں سیاہ گاؤن پہنتے تھے۔اس زمانے میں کرتا شلوار گھریلو لباس تصور کیا جاتا تھا۔ایک دفعہ میری اور یونس شرر کی جو شامت آئی تو ہم کرتے اور پاجامے میں ملبوس یونی ورسٹی چلے آئے۔کشفی صاحب کی نظر پڑی تو ہمیں ڈانٹا کہ شب خوابی کے لباس میں کلاس میں چلے آئے ہو۔اس وقت تو ہمیں ان کا ڈانٹنا برا لگا لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ یہ بھی ہماری تربیت کا ایک حصہ تھا۔وہ دل میں دشمنی کے جذبات پالنے کے قائل نہ تھے لیکن انھیں طلبہ کے معاشرتی رویوں کی تہذیب کا احساس ہمہ وقت رہتا تھا۔

وقت کے ساتھ کشفی صاحب میں دینی رجحان بڑھتا گیا۔پہلے وہ بالالتزام داڑھی مونڈتے تھے، سر منڈانے کا اہتمام قدرت نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔میرے زمانۂ طالب علمی میں ان کے آدھے سر کے بال جھڑ چکے تھے۔بعد میں جب ان سے ملاقات ہوئی تو خاصے "فارغ البال" تھے اور چہرے پر تل چاولی داڑھی سجی ہوئی تھی۔نماز روزے کی پابندی کے ساتھ دین کا مطالعہ بھی شدومد سے جاری تھا۔سیرت اور قرآنی موضوعات پر ان کی کتابیں ان کے اخلاص اور وسعت علم کی مظہر تھیں۔

ایک میمن جماعت ان کی مذہبیت سے بہت متاثر تھی۔غالباً اس جماعت کو ایک زندہ پیر کی ضرورت تھی جسے کشفی صاحب

نے پورا کیا تھا۔ وہ نذر و نیاز کے چکر میں تو نہیں پڑے لیکن کشفی صاحب کی ہر سال خانہ کعبہ اور روضۂ رسول کی حاضری کی مالی ذمہ داری قبول کر لی۔ کشفی صاحب نے اسے اللہ کے در پہ بلاوے کا سبب جانا۔

۲۰۰۱ء میں میں عمرے کے لیے گیا تو کشفی صاحب سے صحن کعبہ میں ملاقات ہوئی۔ دیکھتے ہی گلے سے لگا لیا۔ اس وقت ان کے صاحبزادے عاکف امریکہ گئے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی فرمایا کہ شاگرد بھی بیٹے کی مانند ہوتا ہے۔ میں ان کے خلوص سے بہت متاثر ہوا۔ میں نے ان کی قیام گاہ کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے قریب کے کسی ہوٹل کا نام لیا۔ ایک دو دن بعد اس ہوٹل میں گیا تو آپ وہاں سے کوچ کر چکے تھے۔

اب کشفی صاحب اس دنیا میں نہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

جدید تنقیدی ولسانی نظریات

قاسم یعقوب

اُردو زبان وادب میں دَر آنے والے جدید تنقیدی ولسانی نظریات نے جہاں فکری سطح پر نئے دَر کھولے، وہاں نئے خدشات کو بھی جنم دیا۔ اُردو زبان سے وابستہ اہلِ ادب کا ہمیشہ سے یہ محتاط رویہ رہا ہے کہ تخیل پسندی کو ایک حد تک رکھا جائے۔ چوں کہ اُردو جس معاشرے کی نمائندہ زبان ہے اُس کی "اے پس ٹمک" تنیا دھکومانہ اور حقائق سے چور نظری پر دلالت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کا ذخیرۂ فکر، علمی وادبی سطح پر دائرے کے سفر پر رواں دواں ہے۔ صبح کے بھولے کو شام کے وقت لوٹنے کی کھلی اجازت بلکہ اخلاقی وسماجی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ جمود، ٹھہراؤ اور یکسانیت ہمارا مزاج، لذت، عیش کوشی اور طمانیت ہمارے مقاصدِ اوّلیں ٹھہرائے گئے ہیں۔

اوپر "خدشات" کا ذکر ہوا۔ ہمارے خدشات قضیاتی پیچیدگیوں سے جنم نہیں لیتے بلکہ ذاتی اور روایتی شکست وریخت کے تصورات سے پیدا ہوتے ہیں۔ چوں کہ ہماری ذات اور روایت، ورثے میں گو روقی اور بدذائقی پاتی ہے اس لیے ہم ان کے یک سرأنٹ فضا کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جدید تنقیدی ولسانی نظریات کی مغربی فضا نے بھی ہمارے ناقدین کو ناکوں چنے چبا رکھے ہیں۔ ہماری انشائی وتاثراتی علمی استعداد نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ لسانی وتنقیدی نظریات کی فکری اپچ فلسفے کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور سماجی ومعاشرتی تناظرات کی ثقافتی تشکیل سے زبان میں اپنا وجود بناتی ہے۔ چوں کہ اُردو میں تشریحی اور تاثراتی فکر کی طویل روایت سے اس کا میل نہیں کھاتا جس سے یہ رویہ عام ہو رہا ہے کہ ایسے نئے مباحث مغرب سے درآمد اور ہماری فکری فضا سے یک گونہ اختلاف رکھتے ہیں۔

ادب کی ترویج وتخلیق وتنقید میں عموماً تخلیق کار، ناقدین اور اہلِ ذوق شامل ہوتے ہیں۔ ہمارے تخلیق کار (جن کا بڑا حصہ غزل گو شعرا پر مشتمل ہے) کسی بھی قسم کے تنقیدی رویوں سے خال خال ہی واقف ہوتے ہیں، کیوں کہ ہمارے ہاں "تخلیق" میں "تکنیک" غالب عنصر کے طور پر عمل آرا ہوتی ہے۔ تکنیک کسی بھی صنف کے ڈھانچے کی تعمیر ہی میں مصروف ہوتی ہے۔ وہ ادب کے رس کو ثانوی درجہ عطا کرتی ہے۔

اہلِ ذوق (جو ادب کے تخلیقی عمل میں حصہ دار نہیں) نے بھی ادب کی فکریات کو چیلنج کرنے کے بجائے حظ اندوزی کو فوقیت دی۔ عموماً قارئین نے سطحی شاعری اور کہانی کو قبولیت کا درجہ دیا جس کے پیچھے یہی فکر کارفرما نظر آتی ہے۔ تنقید ہمارے ہاں تذکرہ نویسی

سے ہجرت کر کے اصلاح نویسی کی طرف آئی۔ تذکروں میں شعرا کے اشعار کو ذاتی پسند و ناپسند کے معیار پر انتخاب کیا جاتا اور شعر کی تاثراتی جمالیات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اسے اہم یا غیر اہم قرار دیا جاتا۔ اسی تنقیدی رویے میں بھی جذبے کی حکمرانی کے بجائے شعر کی فنی دروبست کا زیادہ خیال رکھا جاتا۔ حالی، آزاد اور مولانا شبلی کا تنقیدی اجتہاد، ادب کی ناقدانہ شناخت بنانے سے زیادہ اصلاحی نقطۂ نظر میں پوشیدہ تھا۔

شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''ہم لوگوں نے حالی، آزاد، امداد امام اثر اور پھر شبلی کو تنقید نگار کے طور پر سمجھا اور قبول کیا۔ یہ لوگ خود کو بھلے ہی کچھ اور سمجھتے ہوں، لیکن ہمارے لیے وہ نظری اور عملی نقاد ہیں۔ ہمارے ادبی معاشرے پر، ہمارے تخلیقی فن کاروں پر اور ہمارے تنقید نگاروں پر ان لوگوں نے بہ حیثیت نقاد سکہ قائم کیا اور اپنا نقش بٹھایا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر میں ہمارے ادبی معاشرے کو کسی رہنمائی، کسی ہادیت، کسی نئی سوجھ بوجھ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، ان بزرگوں کی تحریروں کے ذریعے ہماری یہ ضرورت پوری ہوئی، اور چوں کہ ان کی تحریروں میں ادب کی تخلیق کے بارے میں نظری اور عملی باتیں کثرت سے تھیں لہٰذا ہم نے ان کے پورے پیغام کو ادبی تنقید قرار دیا۔ اس پیغام میں اصلاح ادب اور اصلاح معاشرہ کے لیے بھی گوشوارۂ عمل موجود یا مضمر تھا اور وہ گوشوارۂ عمل بھی تنقید کے تحت قبول کر لیا گیا، یعنی ہمارے یہاں تنقید اور نقاد کی باقاعدہ پیدائش سے پہلے ہی تنقید اور تنقید نگار، ادبی رہنما، ہدایت دہندہ اور اصلاح کوش استاد کی حیثیت سے قائم ہو چکے تھے۔''[۱]

یہی وجہ ہے کہ ہمارے تنقیدی رویوں میں ادب کی تشریح و توضیح سے آگے بات نہیں بڑھتی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ادب کی تخلیق و قرأت دو سطحوں پر وجود میں آتی ہے، تخلیقی کیفیات میں اور تخلیقی ادب کی قرأت میں۔ متن کی تعبیر و تخلیق جذبات کی آمیزش سے وجدان یا قیاس سے گزرنے کے بعد ایک نئے تجربے کی شکل میں ظہور میں آتی ہے جبکہ دوسری کیفیت متن کے مواد کو تجزیاتی سطح پر تعبیر و تخلیق کی بھٹی سے گزارنا۔ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی متن جذباتی سطح پر کچھ اور نتائج دے رہا ہوتا ہے جبکہ تجزیاتی سطح پر بالکل ہی کچھ اور...... ایک تخلیق کار فن پارے کو کسی اور آنکھ سے دیکھتا ہے جب کہ ایک نقاد اس کے جذباتی نظام کو محسوس کرنے کے باوجود تجزیاتی (Analytical) آنکھ سے ہی اس کا جائزہ لے سکتا ہے۔ ایک ناقد دونوں کیفیات پر عبور رکھنے کے بعد ہی اعلا تنقیدی فن پارہ تعبیر کر سکتا ہے۔ Analytical ہونے کے لیے بھی فن پارے کی وجدانی شعریات سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ یہ اور بات کہ Analytical ہوتے ہی فن پارے سے جنم لینے والی تاثراتی جمالیات کو تنقید کے Machanism سے دیکھنے سے ہی تنقیدی عمل ممکن ہے، ورنہ وہ ذاتی اور لمحاتی سطح تک محدود رہے گا۔ تخلیقی قیاس اور اس کے نتائج ہر وقت ایک سے نہیں رہتے۔ ایک جذباتی کہانی جو رات کی تنہائی میں سرہانے سے لگ کے پڑھتے ہوئے دل پہ اثر انداز ہوتی ہے وہ بس میں بیٹھ کر کیفیتی اعتبار سے

اس سے مختلف نتائج دے گی۔ ہمارے اکثر ناقدین بہت اچھے تخلیق کار نہیں تھے، وہ متن کے جذباتی پھیلاؤ میں اُترنے کے پوری طرح اہل نہیں تھے لہٰذا انھوں نے تنقید کو جذباتی یا تاثراتی انداز سے بھی نہیں دیکھا۔ یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ شاعری اور شاعروں پہ لکھنے والے بہت سے ناقدین عروض اور آہنگ کے بنیادی مسائل سے بھی آگاہ نہیں ہیں۔ اوزان کی تقطیع اور زحافات سے مکمل نا آشنائی کے باوجود وہ اصناف کی درجہ بندی کرتے اور آزاد نظم اور نثری نظم کے صوتی تفاوت پہ دلائل دیتے ہوئے ملتے ہیں حالانکہ عروض اور غیر عروضی کلام میں فرق محض موسیقی کے تال میل کا سا سیدھا سادہ نہیں۔

تنقید اور تخلیق کا رشتہ عمل اور ردِ عمل کے معنوں میں نہیں، تنقید کے اپنے پیرامیٹرز ہیں اور تخلیق کے اپنے۔ تنقیدی عمل اصل میں ادب کی تفہیم (Understanding) ہے جو موضوعی اور معروضی سطح پہ ہو سکتی ہے۔ یہ تخلیقی تجربے کی تجزیاتی تعبیر (Analytical Interpretation) ہے۔ محدود تخلیقی تجربہ اس صلاحیت سے محروم ہوتا ہے یا اُسے تفہیم کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ ہمارے ہاں عموماً شاعر، وہ بھی غزل کے شاعر، ادب کی اعلیٰ درجے کی تفہیم نہیں رکھتے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مخصوص طرز کی ادبی درجہ بندیوں میں تقسیم ہوتے ہیں، مخصوص جذبے مخصوص سانچوں میں پیش کر کے تخلیقی عمل میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ ادب کی تفہیم با قاعدہ اپنی میکانکیات رکھتی ہے، اس کے اصول و ضوابط ہیں، اس کے Machanism کے اندر اُترتے ہی جذباتی سطح سے یک دم تجزیاتی تعبیر (Analytical) اپنانا پڑتی ہے۔ بعض جگہوں پر معروضی مباحث، ادب کی نظری تفہیم پیش کرتے ہوئے تخلیق سے براہِ راست رابطے سے بہت دور ہو جاتے ہیں۔ تنقید چوں کہ ادب کی تفہیم (Understanding) ہے اس لیے اس میں ابہام، انہدام اور امکان کے رجحانات نظر آتے رہتے ہیں۔ تنقید اپنی میکانکیات کے اندر از خود تخلیق کا درجہ اختیار کر جاتی ہے۔ ادب کی تخلیق ایک متن کی تشکیل کا عمل ہے۔ اس متن کی تعبیر بعض اوقات ایک اور تخلیقی رویے کو جنم دے دیتی ہے، یعنی تفہیم (Understanding) بھی ایک تخلیقی رویہ ہو سکتی ہے۔ معاصر تنقیدی رویوں میں محض فن پارے کی تنقید نہیں رہی بلکہ زبان کی ثقافتی تشکیل کی میکانیات کو جاننے کا عمل ہے، شعر و نثر کے امتیازات، شعری و ثقافتی کوڈز کی کھوج، ادب کے اندر جملہ Texts کی دریافت، بین اللسانی مطالعے، جذبے اور اطلاع (Information) کے بنیادی تفاوت پر ادب کی عمارت کی تعمیر، وغیرہ بہت سے نظری مباحث محض تخلیقی فن پاروں تک محدود تنقیدی رویے نہیں ہیں۔ یہ تنقیدی روایت غیر محسوس طریقے سے فن پاروں کو متاثر تو کر رہی ہے مگر فن پاروں کی تشریح کا محدود عمل نہیں ہے۔ جدید تنقید نے فلسفہ، سماجیات، جمالیات، سیاسیات اور بڑی حد تک سائنسی علوم سے بالواسطہ یا بلاواسطہ مدد نہیں لی بلکہ ان کو فیض یاب (Rich) کر کے ادب کے محدود دائرہ کار کو پھیلایا ہے۔ ادب، بہت سے علوم میں ایک معیاری علم کے طور پر شامل ہوا ہے۔ گویا تخلیق کے محدود پیراڈائم نے جست بھری ہے اور تنقید جیسی صنف میں اپنے اثرات آشکارا کیے ہیں۔

ہمارے ہاں عموماً تنقید کو تخلیق کی تشریح و تعبیر کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے، یعنی تنقید، فکشن، شاعری اور دیگر تخلیقی اصناف کے محاسن و معائب اور اُن کے تخلیقی امکانات کو روشن کرتی ہے۔ چوں کہ اس کا سارا دارومدار تخلیق پر منحصر ہے اور اس کا وجود تخلیق کے بعد

وقوع پذیر ہوتا ہے اس لیے تخلیق ایک فوقیتی عمل ہے۔ اب تنقید محض فن پاروں کی تشریح تک محدود نہیں بلکہ ادب میں دیگر علوم کے دَر وا ہونے سے تنقید ایک تخلیقی رویہ بن کے سامنے آئی ہے۔ تنقید نے فلسفے کی کوکھ سے دوبارہ اپنا جنم لیا ہے۔ خالص فلسفہ اب کہیں بھی نہیں رہ گیا۔ سائنس اور سماجی علوم نے فلسفے کو اپنے درمیان تقسیم کرلیا ہے۔ دیگر علوم کی طرح ادب کے اندر بھی سوالات کی پے در پے آمد نے کائنات کے اندر ہر سچائی کو ادب کے معنیاتی نظام کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا ہے، جب کہ ہم نے بند ذہن کی کھڑکیوں کو کھولنے کی بجائے ان کو مضبوطی سے مقفل کرنے کا ارادہ کرلیا اور تخلیق کو صرف غزل کی سکہ بند جمالیات سے آگے نہیں جانے دیا۔ آج بھی ہمارے ہاں ایک بڑا ادبی حلقہ تخلیقی عمل کو غزل کے علاوہ کسی اور فارم میں کم تر درجہ پر قبول کرتا ہے۔ فیصل آباد شہر میں ایک معروف شاعر اپنے شاگردوں کی غزلیں درست کرتے ہوئے مشورہ دیتے ہیں کہ یہ ایک مشکل صنفِ سخن ہے اس لیے آپ آزاد نظم لکھیں اور اس پر بھی ناکامی پر وہ انھیں نثری نظموں کا مشورہ دیتے ہیں۔ اگر کسی طرح بھی دال نہ گلے تو وہ آخر پر فکشن کا انتخاب کرواتے ہیں۔ ہمارا ادبی مزاج آج بھی غزل، نظم، افسانہ اور ناول کو بتدریج کم توجہ دیتے ہوئے قبول کرتا ہے۔

دوسری طرف نثری نظم کو تو ادبی عمل سے ہی خارج قرار دیتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اُردو طبقہ تخلیق کے مروجہ سانچوں سے باہر دیکھنے کا عادی نہیں اور مخصوص خیالات سے باہر نئے خیال و جذبے کی آمد بھی حیرانی کا باعث بنی۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کی کہانی اور عبدالرشید کی امیجری ہماری آنکھوں کے پپوٹوں پر حیرانی چھوڑنے لگی۔

تنقیدی رویّوں میں کچھ اسی قسم کی فضا تھیوری کے دَر آنے سے بن چکی ہے۔ اُردو میں اس کا چلن ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی تحریروں سے عام ہوا۔ بعد میں بہت سے اہم نام ضمیر علی بدایونی، فہیم اعظمی، قمر جمیل، محمد علی صدیقی، عتیق اللہ، وہاب اشرفی اور قاضی افضال احمد شامل رہے۔ عموماً اُردو میں تھیوری پر تحریروں کا مزاج خود سمجھنے کا عمل رہا ہے مگر موجودہ دَور میں ناصر عباس نیّر کی تحریروں میں باقاعدہ سمجھانے کا عمل نظر آتا ہے۔ انھوں نے پہلی دفعہ تھیوری کے بنیادی مسائل کی تفہیم کے لیے اصلاحاتی سطح پر جامع فرہنگ تیار کی اور اُس کے بنیادگزاروں کا مفصل تعارف پیش کیا۔[۲]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو میں تھیوری کے مباحث بڑی حد تک سمجھنے اور سمجھانے سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ اس کی وجہ سے اوپر تفصیل سے بات ہو چکی ہے کہ ہمارا طرزِ تنقید تاثراتی و تشریحی نوعیت کا رہا ہے۔ پہلے ہمیں ان مسائل کو سمجھنے میں خاطر خواہ مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اور پھر جن کو سمجھایا جا رہا تھا، وہ اس کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ہمیں مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے چیزوں کو قضیاتی سطح پر قبول کرنے کی عادت بنا لینی چاہیے۔ ہمیں ادب کی Understanding کے لیے تاثراتی نہیں بلکہ تجرباتی (Analytical) ہونا پڑے گا۔

حوالہ جات

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی: ''تعبیر کی شرح''، اکیڈمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۷۰

۲۔ ناصر عباس نیّر، ڈاکٹر: مابعد جدیدیت کے نظری مباحث، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۷ء

ایضاً، ساختیات۔ ایک تعارف، ایضاً ۲۰۰۶ء

سرقہ، توارد اور جعل سازی

تحقیق و تنقید میں

ڈاکٹر سلیم اختر

"فرہنگ آصفیہ" کے بموجب عربی لفظ "سرقہ" کا مطلب ہے "چوری، دُزدی، دوسرے کے شعر یا مضمون کو اپنے شعر میں داخل کرنا" جبکہ عربی لفظ "توارُد" کے لغوی معنی "باہم ایک جگہ اترنا، اصطلاحی دو شاعروں کا باہم مضمون لڑ جانا، ایک ہی مضمون دو شخصوں کے ذہن میں آنا، شعر لڑ جانا۔"

سرقہ اور توارد کا شاعری سے اساسی تعلق سہی لیکن تحقیق و تنقید میں بھی اس عمل کی کارفرمائیاں دیکھی جا سکتی ہیں، شعر تو چھوٹی سی چیز ہے یار لوگ تو مقالات اور کتابوں پر بھی ہاتھ صاف کر لیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو شاعر پر بھی!

سرقہ، توارد کا اساسی تعلق شاعری، تنقید اور تحقیق کے ساتھ ہے تاہم اس کے آغاز یا قدامت کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن انسانی فطرت کے پست پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں بھی شعر و شاعری جتنا ہی قدیم قرار دیا جا سکتا ہے، پاکستان کی مقبول عام اصطلاح کے بموجب یہ بھی "قبضہ گروپ" کی کارستانی ہے۔

سوال یہ ہے سرقہ کیوں؟

جواب انسانی فطرت کے غیر اخلاقی پہلوؤں میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح معاشرہ میں "زر چور" مل جاتے ہیں اسی طرح ادب میں "شعر چور" بھی پائے جاتے ہیں، دیوان چور بھی اور کبھی کبھی تو شاعر چور بھی!

حضرت داتا گنج بخش نے "کشف المحجوب" میں لکھا کہ تصوف کی جانب آنے سے پہلے وہ شاعری کرتے تھے، ایک دوست نے مطالعہ کے لیے دیوان مانگا، وہ دیوان تو کیا واپس کرتا اس نے ان کے اشعار اپنے نام سے سنانے شروع کر دیے، آپ کیونکہ داتا تھے اس لیے اپنا دیوان واپس مانگنے کے بجائے اسے بخش دیا۔ شیخ سعدی کا بیان ہے کہ وہ ایک شہر میں گئے تو دیکھا کہ ایک شخص سعدی بن کر، ان کے اشعار سنا کر، داد وصول کر رہا ہے۔ جب انھوں نے کہا کہ سعدی تو میں ہوں اور یہ میرے اشعار ہیں تو اس نے جواب دیا دنیا میں صرف تم واحد سعدی تو نہیں اور بھی تو سعدی ہو سکتے ہیں:

چہ دلاور دزد است کہ بکف چراغ دارد

شاعری کی اصطلاح کے طور پر توارد کا یہ مطلب ہے کہ زمانی اور مقامی بُعد کے باوجود بھی ایک ہی خیال کا بیک وقت مگر بلا ارادہ دو شعرا کے ذہن میں وارد ہونا اور تقریباً ملتے جلتے اسلوب میں اظہار پانا، ایسا اگر حسن اتفاق سے ہو تو کوئی حرج نہیں لیکن

سوئے اتفاق ہو تو یہ عمل بدنیتی اور بددیانتی کا مظہر بن جاتا ہے۔

توارد کی صورتوں میں:

(۱) بعض اوقات غیر شعوری طور پر شاعر کسی اور زبان کے شعر کا ترجمہ کر دیتا ہے۔

(۲) طرحی مشاعروں میں بعض اوقات مختلف شعرا کے ہاں توارد کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ غزل میں بالعموم خیال قافیہ سے مشروط ہوتا ہے۔ اس لیے بیک وقت شعرا کا ایک طرحی مشاعرہ میں ملتے جلتے خیال کے حامل اشعار پڑھنے کا امکان ہو سکتا ہے۔

(۳) بعض اوقات عصری شعور کے زیر اثر مختلف شعرا میں مشترک سوچ اشعار میں ظہور پا لیتی ہے۔

(۴) ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ماضی کے کسی شاعر کے شعر کا مفہوم تحت الشعور میں خوابیدہ ہو جو "آمد" کی صورت میں اپنا محسوس ہو۔

(۵) غیر شعوری طور پر فارسی اشعار سے خیال یا تو اخذ کر لیا جاتا ہے یا غیر ارادی طور پر اس کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے، اس صورت میں ترجمہ اور توارد کے درمیان بہت باریک پردہ رہ جاتا ہے، اگر ترجمہ کا اعتراف کیا گیا ہو تو درست ورنہ بصورت دیگر توارد کی صورت میں شاعر کو رعایتی نمبر دینے کے برعکس شعر سرقہ قرار دیا جانا چاہیے۔

"آبِ حیات" میں محمد حسین آزاد نے میر اور سودا کے ہم خیال اشعار درج کیے ہیں۔ صرف دو تین مثالیں درج کی جاتی ہیں:

گلا میں جس سے کروں تیری بے وفائی کا
جہاں میں نام نہ لے پھر وہ آشنائی کا
میر تقی میر

گلا لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا
محمد رفیع سودا

چمن میں گُل نے جو کل دعویٰ جمال کیا
جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا
میر

برابری کا تیری گُل نے جب خیال کیا
صبا نے مار تھپیڑا منہ اس کا لال کیا
سودا

دل پہنچا ہلاکت کو بہت کھینچ کسالا
لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ
میر

میں دشمن جاں ڈھونڈ کے اپنا جو نکالا
سو حضرتِ دل سلمہ اللہ تعالیٰ

سوداؔ

آزادؔ نے میرؔ، سوداؔ اور جرأتؔ کے بھی ہم خیال اشعار درج کیے ہیں۔ میرؔ اور سوداؔ کے یہ اشعار مشہور ہیں:

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

میرؔ

سوداؔ کے جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت
خدامِ ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

صنعتِ تضاد کے استعمال کے باوجود میرؔ مینائی کا یہ شعر میرؔ اور سوداؔ کے خیال کا چربہ ہے:

شورِ محشر امیرؔ کو نہ جگا
سو گیا ہے غریب سونے دے

مولانا حالیؔ نے "مقدمہ شعروشاعری" میں نواب مرزا شوق کی مثنوی "بہارِ عشق" پر میر اثرؔ دہلوی کی مثنوی "خواب وخیال" کے اثرات کا اس اسلوب میں ذکر کیا کہ سرقہ یا توارد کے الفاظ استعمال نہ کرنے کے باوجود بین السطور یہی مفہوم نکلتا ہے۔ "ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر دہلوی نے جو ایک مثنوی لکھی ہے جس کا نام غالباً "خواب وخیال" رکھا تھا اور جس کی شہرت ایک وجہ سے زیادہ تر پورب میں ہوئی تھی، اس مثنوی میں جیسا کہ ہم نے اپنے بعض احباب سے سنا ہے تقریباً ۴۰، ۴۵ شعر اس قسم کے ہیں جیسے کہ شوقؔ نے "بہارِ عشق" میں اختلاط کے موقع پر ان سے بہت زیادہ لکھے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شوق کو ایسی زبان بر متنے کا خیال اسی مثنوی کو دیکھ کر پیدا ہوا اور چونکہ وہ ایک شوخ طبع آدمی تھا اور بیگمات کے محاورات پر بھی اس کو زیادہ عبور تھا اس نے اپنی مثنوی کی بنیاد "خواب وخیال" کے انھیں ۴۰، ۴۵ شعروں پر رکھی۔ "خواب وخیال" کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے "بہارِ عشق" میں موجود ہیں۔

اس اقتباس سے یہ تو واضح ہے کہ مولانا حالیؔ نے خود "خواب وخیال" نہ دیکھی تھی لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی، مولوی عبدالحق نے جب میر اثر دہلوی کی مثنوی "خواب وخیال" مرتب کی تو اپنے مقدمہ میں بحث کرتے ہوئے پہلے تو مولانا شبلی نعمانی کی یہ رائے نقل کی:

"نواب مرزا نے خواجہ میر اثرؔ کی مثنوی دیکھی تھی اور اس کا طرز اڑایا تھا۔"[1]

مولوی عبدالحق اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"اب جو یہ مثنوی ہمارے سامنے موجود ہے تو ہم بلاشبہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزاؔ کا ماخذ اور نمونہ تھی اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالیؔ کا قیاس کس قدر صحیح تھا۔ اس خاص موقع کے چند شعر دونوں مثنویوں

سے نقل کیے جاتے ہیں:

خواب وخیال	بہارِ عشق
ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا	ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا
کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا	چھوٹے کپڑوں کو ڈھانپتے جانا
ہولے ہولے پکارنے لگنا	چپکے چپکے پکارتی تھی کبھی
ڈھیلے ہاتھوں سے مارنے لگنا	ڈھیلے ہاتھوں سے مارتی تھی کبھی
وہ ترا پیار سے لپٹ جانا	کھول کر دل چمٹ چمٹ کے ملا
اور دل کھول کے لپٹ جانا	کیسا کیسا لپٹ لپٹ کے ملا
وہ ترا منہ سے منہ بھڑا دینا	کبھی منہ سے دیا چبا کر پان
وہ ترا جیب کا لڑا دینا	کبھی مل کر لڑی زباں سے زبان

اگر دونوں مثنویوں کے اس قسم کے اشعار برابر رکھ کر پڑھے جائیں تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ مرزا شوق نے ''خواب و خیال'' ہی کو اپنا نمونہ بنایا۔[۲]

اشعار میں شعوری طور پر خیال لیا گیا یا غیر شعوری طور پر ایسا ہوا، اس سے قطع نظر، یہ امر توجہ طلب ہے کہ ایسے اشعار شعرا کے تقابلی مطالعہ کے لیے بالخصوص کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دو شعرا کی شخصیت اور نفسیاتی مطالعہ میں بھی سودمند ثابت ہو سکتے ہیں۔

ژونگ نے مقامی اور زمانی بُعد کے باوجود پیدا ہونے والی ہم خیالی کے لیے "PARTICIPATION MYSTIQUE" کی اصطلاح وضع کی تھی، اگر تواردکی روشنی میں شعرا کا نفسیاتی مطالعہ مقصود ہو تو ژونگ سے استفادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ میرؔ اور سوداؔ کے درج کیے گئے اشعار کے مطالعہ سے ان دونوں کی جداگانہ شخصیات کا تقابل بھی کیا جا سکتا ہے۔

قصہ مختصر! توارد کا تو کوئی نہ کوئی جواز ہو سکتا ہے لیکن سرقہ کا نہیں کہ یہ کھلی چوری ہے۔ البتہ ایسی چوری جس کی F. I. R درج نہیں ہوتی۔ ادبی سرقہ کا محرک بھی وہی جذبہ ہے جو انسان کو چور بنا دیتا ہے یعنی محنت سے کچھ حاصل کرنے کے طویل سفر سے بچتے ہوئے سرقہ کی صورت میں شارٹ کٹ اختیار کر لینا۔ دراصل یہ شارٹ کٹ ہی سب برائیوں کی جڑ ہے۔

علامہ اقبال نے کہا تھا جب اچھا شعر سنو تو سمجھ لو کہ کوئی مصلوب ہوا ہے۔ مصلوب ہونا اس ریاضت کا استعارہ ہے جسے انھوں نے ''خونِ جگر'' سے تعبیر کیا تھا۔ جس میں جگر خون کرنے کی اہلیت، سکت، استعداد، ہمت نہیں ہوتی تو وہ دوسروں کی محنت پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔

اب تک صرف سرقہ اور توارد پر صرف شاعری کے حوالہ سے بات کی گئی لیکن سرقہ صرف شاعری تک ہی محدود نہیں بلکہ سرقہ، جعل سازی (اور ان سے مشابہ اعمال) تنقید اور تحقیق میں بھی مل جاتے ہیں۔

تحقیق وتنقید کی دنیا قدرے شعر سے جداگانہ ہے، اس کے اپنے اصول وضوابط ہیں جن کی پاسداری کی ناقدین اور محققین سے توقع کی جاتی ہے، اگرچہ تنقید اور تحقیق کا ایک سانس میں نام لے دیا جاتا ہے لیکن یہ دونوں بھی مخصوص امتیازات کی حامل ہیں۔ لمبی چوڑی تفصیلات

میں جائے بغیر اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ تنقید کا بنیادی فریضہ تخلیقات کی چھان پھٹک سے ان کی قدر و قیمت کا تعین ہے اس کے برعکس تحقیق میں یا تو کسی مسلمہ سمجھے جانے والے امر کی تردید یا تصحیح کی جاتی ہے یا کسی مفروضہ کی توثیق۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں تنقید اور تحقیق کی تعریف..... تحقیق کے ضمن میں تدوین متن کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے جس میں ماضی کے کسی مخطوطہ یا معدوم کتاب کے تمام ممکن الحصول ذرائع کی امداد سے متن کی درستی کی جاتی ہے۔

آلاتِ تحقیق میں خواہ کتنا ہی تنوع کیوں نہ ہو مگر ان سب کی اساس مستند حوالوں پر استوار ہوتی ہے۔ اساسی طور پر تحقیق حوالوں کا کھیل بلکہ حوالوں کی جنگ ہے، ایسی جنگ جس میں حوالے اسلحہ ہوتے ہیں اور حوالے ہی ڈھال بھی۔ رشید حسن خاں نے تحقیق کو کلاسیکی موسیقی سے تشبیہ دی تھی اگر یہ درست ہے تو پھر تحقیق میں حوالے وہی کردار ادا کرتے ہیں جو موسیقی میں سُروں کا ہوتا ہے۔

حوالے دو طرح سے بروئے کار لائے جاتے ہیں:

۱۔ اپنا مفروضہ/تصور/دعویٰ ثابت کرنے کے لیے اساسی دلیل کے طور پر۔

۲۔ دوسرے کو غلط ثابت کرنے، بالفاظِ دیگر اس کے حوالوں کو غلط ثابت کرنے کے لیے۔

اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ کارخانۂ تحقیق کی اساس حوالوں پر استوار ہے تو اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے۔ حوالہ سند بھی ہے اور سند کی سند بھی۔ اسی لیے محقق سب سے پہلے حوالوں اور ان سے متعلق کتب، جرائد یا دیگر مواد کی چھان پھٹک کرتا ہے۔ تحقیق کی شریعت میں ظاہری حیثیت میں حوالہ کو درست تسلیم کر لینا کفر کے مترادف ہے۔ اسی بات کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ تحقیق کی مملکت میں حوالے کا سکہ چلتا ہے۔

بحیثیت مجموعی حوالے کا عالم کوہ کندن و کاہ برآمد جیسا ہوتا ہے، موزوں حوالہ کی تلاش میں کتنی لائبریریوں کی خاک چھاننا پڑتی ہے، کتنے دروازوں پر دستک دی جاتی ہے، کتنے جرائد کی گرد پھانکی جاتی ہے اس کا اندازہ صرف وہی اصحاب لگا سکتے ہیں جو اتنی محنت (بعض صورتوں میں تو مشقت) کے اہل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ سعی لاحاصل ثابت ہوتی ہے اور کارآمد حوالہ دستیاب نہیں ہوتا۔

INSTANT COFFEE کی مانند تحقیق میں INSTANT RESULT نہیں ہوتا اسی لیے تحقیق میں شارٹ کٹ نہیں ملتے اور اسی وجہ سے تحقیق میں سرقہ کی یہ عام بلکہ کسی حد تک تو ''مقبول'' صورت جنم لیتی ہے یعنی دوسروں کے حوالوں کو اپنے حوالوں کے طور پر (بلا حوالہ) استعمال کرنا، حوالوں کی بنیادی اور ثانوی دو اقسام کی جاتی ہیں۔ بنیادی حوالہ اپنی محنت کا ثمر ہوتا ہے لیکن دوسروں کے حوالوں کو مقالہ میں استعمال کرنا ثانوی حوالہ ہوگا، اس ضمن میں اگر ''ذریعہ'' (Source) درج کر دیا جائے تو ثانوی حوالے کا استعمال جائز ہے لیکن اگر اصل کا حوالہ دیے بغیر کسی کے حوالہ کو اپنا لیا جائے تو یہ سرقہ ہوگا جو تا عام ہے کہ ایسا کرنے والا خود کو سارق نہ سمجھے گا۔

کہتے ہیں نقل را چہ عقل..... دوسروں کی تحقیق سے حوالہ اچک لینے والے اور ثانوی کو بنیادی حوالہ کے طور پر درج کرنے والے اس وجہ سے پکڑے گئے کہ کتابیات، حواشی یا کمپوزنگ/کتابت کی اغلاط بھی نقل کرنے میں درج کر دی گئیں (درست سمجھتے ہوئے) اور یوں حوالہ چور پکڑا گیا۔

ثانوی ماخذ کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں صرف اتنے اخلاق کا مظاہرہ کافی ہوتا ہے کہ اس کا اعتراف کر لیا جائے۔ اس صورت میں اصل کی غلطی نقل ہو جانے کی صورت میں مواخذہ سے بھی بچا جا سکتا ہے۔ جن محققین کو اپنی عزت کا پاس ہوتا ہے وہ تو اس ضمن میں اتنے محتاط ہوتے ہیں کہ اس امر کا بھی اعتراف کر لیتے ہیں کہ یہ کتاب/ جریدہ/ مقالہ/ حوالہ/ مشورہ فلاں صاحب نے دیا۔ چنانچہ رشید حسن خاں نے "سحر البیان" (انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی ۲۰۰۰ء) میں اس کا بھی اعتراف کیا کہ:

"انجمن کے دوسرے مخطوطات کے ساتھ یہ نسخہ بھی اب نیشنل میوزیم (کراچی) میں ہے۔ اس کا عکس مشفق خواجہ صاحب نے بھیجا ہے۔" (ص: ۹۳)

"یہ نسخہ..... مشفق خواجہ کی عنایت اور کوشش سے اس کا عکس پیش نظر ہے۔" (ص: ۹۹)

"ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مطلع کیا تھا کہ خدا بخش لائبریری میں اس اشاعتِ اوّل کا ایک نسخہ ہے۔" (ص: ۱۱۰)

حوالے دیے بغیر دوسروں کے مواد سے استفادہ کی مثالیں خاصی عام ہیں، حال کے ساتھ ساتھ ماضی میں بھی، چنانچہ حافظ محمود شیرانی کے بموجب "آبِ حیات" کے ضمن میں آزاد نے کئی کتب سے استفادہ کیا مگر حوالہ نہ دیا جیسے "مجموعۂ نغز" (از: میر قدرت اللہ قاسم) "طبقاتِ شعرائے ہند" (از: مولوی کریم الدین)

ایم اے اور ایم فل (اردو) کے لیے لکھے جانے والے "تحقیقی" مقالات میں عموماً سرقہ کے اس انداز کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ایسے مقالات کی جانچ کرنے والے اساتذۂ کرام نے یقیناً اس فنِ شریف کے مظاہرے دیکھے بلکہ پکڑے بھی ہوں گے۔ مجھے اس کا خاصہ تجربہ ہے۔ سب کہاں، کچھ، مثالوں میں سے صرف ایک پیش کرتا ہوں جو حوالوں کے سرقہ سے بڑھ کر پورے مقالہ ہی کا سرقہ تھا۔

مجھے ایم فل (اردو) کے "وائی وا" کے لیے ایک بہت بڑی یونیورسٹی میں جانا ہوا۔ امیدوار نے اُس مقالہ کی مکمل نقل کر رکھی تھی جو (اس کی بدقسمتی سے) چند برس قبل میرے ہی نگرانی میں لکھا گیا تھا ابھی جو میں نے لکھا تھا کہ نقل را چہ عقل..... تو وہی معاملہ یہاں بھی ہوا یعنی لڑکی نے کتابیات میں (اصل تھیسس کے بموجب) جن شخصیات سے امرو یو کا ہونا کیا ان میں سے بعض کا انتقال بھی ہو چکا تھا خود مجھ سے بھی امرو یو منسوب تھا (جبکہ مجھے وہ کبھی ملی تھی، یہ بھی اس نے اصل تھیسس سے حاصل کیا تھا) اصولاً تو یہ تھیسس مسترد ہونا چاہیے تھا لیکن یوں لڑکی کی ڈگری بھی مشکوک قرار پاتی، مستقبل خراب ہوتا، شادی نہ ہوتی وغیرہ وغیرہ چنانچہ کم سے کم مارکس دے کر اسے معاف یعنی "پاس" کر دیا گیا۔

ہماری مانند ہندوستان میں بھی ایسے واقعات ہوتے ہیں جن میں سے ایک کی بازگشت سرحد کے اِدھر بھی سنی گئی۔ ۱۹۷۴ء میں صدر شعبہ اردو (جے پور: راجستھان یونیورسٹی) سیّد محمد علی زیدی کی کتاب "مطالعۂ داغ" (ناشر: کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ) شائع ہوئی۔ "عرضِ مصنف" میں صاحب مقالہ نے لکھا:

"میں نے داغ پر ایک مربوط اور منضبط تحقیقی اور تنقیدی مقالے کی ضرورت محسوس کی تا کہ ان کے بارے میں صحیح حقائق سامنے آئیں، ان کی ادبی اور لسانی خدمات نمایاں ہوں اور ان کی انفرادیت اور کمال کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر اپنی تحقیق کے لیے داغ کا انتخاب کیا اور ان کی حیات اور کارناموں پر تحقیقی مقالہ مکمل کر کے راجستھان یونیورسٹی میں ڈاکٹر آف فلاسفی کے لیے داخل کیا اور یونیورسٹی نے ممتحن کے فیصلہ کے مطابق مجھے ڈگری عطا کی۔" (ص: ۱۶)

۱۹۷۰ء میں اس مقالہ پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی، اگر مقالہ الماری اور کتاب بند رہتا تو شاید بھرم رہ جاتا لیکن کتاب چھپی تو انکشاف ہوا کہ یہ تو مبینہ طور پر اس مقالہ کی نقل ہے جو امیر مینائی پر لکھا گیا تھا، چنانچہ ان کی ڈگری منسوخ کی گئی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ دونوں کے نگران پروفیسر احتشام حسین تھے جبکہ "مطالعۂ داغ" کے ممتحن آل احمد سرور تھے۔ یہ مجھے مکرمی ڈاکٹر اسلم فرخی نے بتایا انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ان دنوں کراچی یونیورسٹی میں بھی ایسے ہی کیس کے سلسلہ میں شعبہ صحافت میں انکوائری ہو رہی ہے۔

۲۰۰۷ء میں پنجاب یونیورسٹی شعبہ فزکس کے ڈائریکٹر سمیت پانچ اساتذہ اس الزام کے تحت جناب خالد مقبول گورنر پنجاب کے حکم سے ملازمت سے برطرف کیے گئے کہ انھوں نے انٹرنیٹ سے ایک تحقیقی مقالہ چرا کر اپنے نام سے پیش کر دیا تھا۔ HEC نے ان کا بھانڈا پھوڑا۔

چند برس قبل گورنمنٹ کالج کے مرحوم صدر شعبہ ڈاکٹر پروفیسر سیّد معین الرحمٰن کے ایک کارنامے نے لاہور کے تعلیمی حلقوں میں "سنسنی" پھیلا دی۔ اتفاق سے میں اس واقعہ کا چشم دید ہوں، ہوا یہ کہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ اس لڑکی کے "ادا جعفری پر ایم اے کے تھیسس کی نگرانی کریں، مجھے ایک ہفتہ کے اندر ہی اندازہ ہو گیا کہ غیر نصابی سرگرمیوں میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے والی یہ طالبہ تھیسس کی محنت نہ کر پائے گی۔ اسے یہ توقع تھی کہ میں اسے مقالہ لکھوا دوں گا لیکن اسے یہ علم نہ تھا کہ بحیثیت استاد میں اس بات کے تحت خلاف ہوں کہ استاد لڑکی کو سارا سارا دن اپنے سامنے ڈیکوریشن پیس کے طور پر سجائے رکھے اور بالآخر خود اسے مقالہ لکھ دے۔ چنانچہ ایک ہفتہ بعد میں نے صدر شعبہ سے کہہ دیا کہ یہ لڑکی تھیسس لکھنے والیوں میں سے نہیں اور میں اس کے ساتھ اپنا وقت ضائع کرنے کو تیار نہیں ہوں۔

صدر شعبہ نے اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا اور خود مقالہ لکھ دیا جو کہ ان کے مخصوص انداز نگارش کی منہ بولتی تصویر تھا۔ لڑکی نے امتحان دیا اور امریکہ چلی گئی۔ کبھی نہ آنے کو دنیا میں اس مقالہ کی صرف چار کاپیاں تھیں اور بھلا ایم اے کے مقالات سے کسی کو کیا لینا۔ ان کے بارے میں کون تردد کرتا ہے لہٰذا صدر صاحب نے یہ مقالہ "نقوش" میں اپنے نام سے چھپوا دیا۔ ظاہر ہے تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں، چنانچہ بھانڈا پھوٹ گیا لیکن کالج کی نیک نامی اور شعبہ کی عزت کی خاطر یہ سکینڈل دبا دیا گیا۔ ان ہی حضرت نے دیوانِ غالب کے سلسلہ میں جو کچھ کیا وہ جداگانہ مقالہ کا متقاضی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تحسین فراقی کے پمفلٹس، ڈاکٹر صدیق جاوید کی کتاب "ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن تحقیق کے چراغ تلے اور جعفر بلوچ کی مرتبہ "محاکمہ" کا مطالعہ چشم کشا ثابت ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند جین، سیّد قدرت نقوی، خلیل الرحمٰن داؤدی، ڈاکٹر عارف ثاقب اور بعض دیگر حضرات کے مقالات بھی لائق توجہ ہیں۔

میں نے پوچھا یہ آپ نے کیا کیا فرمایا اسے مقالہ میں نے لکھ کر دیا تھا اگر میں نے اسے چھپوا دیا تو اس میں کیا خرابی ہے۔ طالبہ کو خود لکھ کر دیا تو برا کیا لیکن جب اسے لکھ ہی دیا تو پھر تحریر اسے بخش دینی چاہیے تھی لیکن جب اسے اپنے نام سے چھپوا دیا تو (خود لکھنے کے باوجود بھی) سرقہ شمار ہو گا کیونکہ لڑکی اس کی مالک بن چکی تھی (اور ان کی تحریر کے باوجود) یہ مقالہ اس کی ملکیت تھا۔

جامعات میں اس نوع کے واقعات ہوتے رہتے ہیں لیکن مقالہ بخش دیا جاتا ہے اور اسے اپنے نام سے شائع نہیں کرایا جاتا۔

دراصل ول پھینک پروفیسروں کا بھی المیہ ہے کہ لڑکی بھی ہاتھ سے جاتی ہے اور مقالہ بھی۔ جھوٹی شہرت تاش محل (تاج محل نہیں لکھا) جیسی ہوتی ہے۔ جیسے جیسے تاش کے پتے، ایک کے اوپر ایک، جتے جاتے ہیں ویسے ویسے ہی تاش محل بلند اور نظر افروز ہوتا جاتا ہے لیکن تب تک، جب تک اسے ٹھیس نہ پہنچے لیکن معمولی سے دھچکے سے ہی یہ تاش محل زمین بوس ہو جاتا ہے۔ اسی لیے شہرت مضبوط بنیاد پر استوار ہونی چاہیے اور اس کے لیے خونِ جگر کے علاوہ دیانت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

ادب، شاعری اور تحقیق وتنقید میں سرقہ کی مثالیں اگر عام نہیں تو اتنی نایاب بھی نہیں۔ چند برس قبل شعبہ تصنیف وتالیف جامعہ کراچی نے اس کارِ خیر میں مبتلا لوگوں کو EXPOSE کرنے کے لیے اپنے مجلّہ "جریدہ" (شمارہ: ۲۷) کا خاص نمبر مرتب کیا۔ مزید انکشافات کے لیے اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے ملک کی معروف ومقبول اصطلاحات میں سے ایک "قبضہ گروپ" بھی ہے لہٰذا ان سارق حضرات کو بھی عالمِ نقد کا "قبضہ گروپ" قرار دیا جا سکتا ہے کہ یہ کسی اور کی محنت پر قبضہ کر لیتے ہیں۔

میرے سامنے ایک کتاب "بکف چراغ دارد" (مرتبہ: ممتاز لیاقت، ناشر، مکتبہ میزان الادب، ۱۹۶۸ء) رکھی ہے جس میں اردو دنیا کے دو معروف اساتذہ اور ناقدین وقار عظیم اور سجاد باقر رضوی کے مبینہ سرقہ کی مثالیں یوں دی گئی ہیں کہ ایک صفحہ پر ان کی اردو تو بالمقابل صفحہ اصل انگریزی عبارت جس کے ترجمہ کیا مگر حوالہ نہ دیا۔ مقالات کے عنوانات یہ ہیں:

۱۔ سید وقار عظیم: "تاریخی ناول اور اس کا فن" جس انگریزی مقالہ کا یہ ترجمہ ہے اس کا عنوان ہے:

"The art and practice of historical novel" مقالہ نگار ہے۔ Alfred Tresidder She Vpard

۲۔ سجاد باقر رضوی: "ہنسی کے متعلق عرب حکما کے چند نظریات" جس مقالہ کا ترجمہ ہے اس کا عنوان ہے۔

"Humour in Early islam: appendix: On Laughter"

مقالہ نگار ہے: Franz Rosenthal ان دو مقالات کے بعد سیّد وقار عظیم کا مقالہ "امانت لکھنوی" ہے۔ ایک کالم میں سیّد وقار عظیم کی تحریر اور اس کے سامنے کالم میں سیّد مسعود حسن رضوی ادیبؔ کی تحریر درج ہے۔

جہاں تک تحقیق وتنقید میں جعل سازی کا تعلق ہے تو اس موقع پر بہادر شاہ ظفر کا یہ دلچسپ شعر ملاحظہ ہو:

جعل سازی کا تماشا تم نے دیکھا اے ظفرؔ
سب کے لتے چھن گئے اور سب کے دفتر پھٹ گئے

جعل سازی کا ایک تماشا لوگوں نے اس وقت دیکھا جب ایک صاحب کمرہ ٹرک کے ذریعہ رشید احمد صدیقی کے ساتھ اپنی تصویر بنوا کر اسے کتابوں میں شائع کرتے رہے۔

تحقیق وتنقید میں جعل سازی کی مثالیں اگرچہ عام نہیں لیکن پھر بھی مثالیں نایاب نہیں تحریف جعل سازی کا دوسرا نام ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے یہ ثابت کیا کہ محمد حسین آزادؔ نے دیوانِ ذوقؔ کی ترتیب کرتے وقت نہ صرف یہ کہ ذوقؔ کے متعدد اشعار میں "اصلاح" کر دی بلکہ خود لکھ کر غزلیں بھی دیوان میں شامل کر دیں۔

ذوقؔ کے کلام پر "اصلاح" اور ذوقؔ کے نام سے آزادؔ کی اپنے قلم سے لکھی گئی غزلوں اور اشعار والے کاغذات شائع ہو چکے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی مقالہ "شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد اور دیوانِ ذوقؔ میں" (ص ۳۴۲) رقم طراز ہیں کہ:

''یہ مسودے منجملہ دیگر پرانے کاغذات کے حضرت مولانا کی ردی سے، جو کچھ سال قبل آتش زدگی سے بچائی گئی تھی، دستیاب ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا کے نبیرے آغا محمد باقر سلمانی ایم اے نے مجھے عنایت کیے تھے۔ میں نے اُس ردی کے ڈھیر میں سے کئی چیزیں کام کی نکالی تھیں ..... جب یہ کاغذات میرے مطالعے میں آئے تو میرا پہلا خیال یہی ہوا کہ یہ استاد ذوق کے ہاتھ کے مسودے ہیں لیکن سیاہی اور کاغذ پر غور کرنے سے مجھے بہت جلد اپنی رائے میں ترمیم کرنی پڑی اور معلوم ہو گیا کہ یہ کاغذات مولانا کے اپنے زمانے کے ہیں۔ چھ کاغذ طالب علموں کے امتحان کی کاپیوں سے لیے ہیں، دو کاغذ نارتھ ویسٹرن ریلوے کے مطبوعہ فارموں پر ہیں جو جنوری ۱۹۸۸ء میں چھپے تھے، ایک کاغذ ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب کے دفتر سے مارچ ۱۸۸۰ء کی تاریخ کی مولانا کے نام چٹھی ہے۔ ہلکی اودی روشنائی میں مسودے تیار ہوئے ہیں ..... مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ حیران کیا، یہ تھی کہ ذوق کی غزلوں کے مسودے حضرت مولانا کے خط میں بیان کیا کر رہے ہیں آخر مطبوعہ دیوان میں، جو مولانا نے مرتب کیا تھا، ان غزلوں کو تلاش کیا، اس میں تمام غزلیں بہ تفاوت قلیل مل گئیں۔ اُدھر حافظ دیران کے مرتبہ دیوان میں پوری پوری غزلیں تو کجا، ان کا ایک شعر تک نظر نہ آیا، نہ تذکرہ نگاران سے واقف ہیں۔ آخر یہ رائے قائم کرنی پڑی (خدا کرے غلط ہو) کہ مولانا نے یہ غزلیں تصنیف کر کے ذوق کے دیوان میں اضافہ کر دی ہیں اور استاد کے بچپن کے کلام سے انھیں موسوم کر دیا ہے۔'' (ص: ۲۶۴)

(مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد سوم، مرتبہ مظہر محمود شیرانی مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۹ء)

محققین میں ''الحاقیات'' کی چھان پھٹک سے وابستہ امور دراصل جعل سازی ہی ہے۔ امیر خسرو کے نام سے جو پہیلیاں، انمل، دوہے، کہہ مکرنیاں، دوسخنے، گیت، اقوال وغیرہ مشہور ہیں ان میں سے بیشتر مشکوک ہیں، سب سے اہم بحث وہ ہے جو امیر خسرو کی ''خالق باری'' کے بارے میں ہے۔ یہ منظوم لغت ہے اور طالب علموں کے لیے تحریر کی گئی تھی اس میں عربی، فارسی اور ہندوی الفاظ کے معانی ہیں۔ اس منظوم لغت کا انداز سخن یوں ہے:

خالق باری سرجن ہار
واحد ایک بدا کرتار
رسول پیغمبر جان بیٹھ
یار دوست بولی جا اٹھ
اسم اللہ خدا کا ناؤں
گرما دھوپ سایہ چھانو

اگرچہ بیشتر محققین اسے امیر خسرو کی تحریر مانتے ہیں لیکن حافظ محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' (ص ۱۸۳) میں دلائل سے ثابت کیا کہ ''خالق باری'' دراصل ضیاء الدین خسرو کی تحریر کردہ ہے۔ بقول حافظ محمود شیرانی:

''میں امیر کی طرف اس تالیف کا انتساب امیر کی ہتک سمجھتا ہوں۔''

دراصل بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بر بنائے عقیدت لوگ کسی بزرگ ہستی سے اقوال، حکایات بلکہ کتابیں تک منسوب

کر دیتے ہیں اور یہی امیر خسرو کے ساتھ بھی ہوا۔

پنجابی میں ''ہیر وارث شاہ'' میں متعدد الحاقی اشعار ملتے ہیں، چنانچہ پنجابی تحقیق میں ''ہیر'' میں سے الحاقی اشعار کی تلاش ایک اہم تحقیقی مسئلہ بن چکی ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ وارث شاہ کے ہاتھ کا تحریر کردہ مسودہ ناپید ہے اس صورت میں قدر دان حضرات ''ہیر'' یاد کرتے رہے، اپنے شوق کی وجہ سے یا محفلوں میں سنانے کے لیے، اس لیے امکان ہے کہ ہیر خواں حضرات نے اصل ہیر میں اپنے اشعار کے اضافے کر لیے ہوں گے۔ ہیر کی شہرت پنجاب سے نکل کر لکھنؤ تک جو جا پہنچی تو یہ بھی ہیر خوانوں ہی کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔

انشاء کہتے ہیں:

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھا کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بعض اصحاب نے غالب کے جعلی خطوط تیار کیے، اسی طرح اقبال شناسوں میں کسی زمانہ میں یہ بحث ہوتی رہی کہ علامہ اقبال کے نام ''اقبال نامہ'' میں لمعہ کے جو خطوط درج ہیں وہ حقیقی نہیں ہیں۔ سنا ہے کہ بھارت میں کسی نے اسی موضوع پر تحقیقی مقالہ قلم بند کیا لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ انھوں نے کیا ثابت کیا۔

جامعات میں ایم اے اور ایم فل کے مقالات میں سہل پسند طلبا/ طالبات بعض اوقات ایسے حوالوں کا اندراج کرتے ہیں جو جعلی ہوتے ہیں یعنی کتاب دیکھے بغیر اس میں سے جعلی اقتباس درج کر کے مقالہ کی علمی سطح بلند کرنا، علمی سطح تو ''بلند'' ہو جاتی ہے لیکن افشاء ہو جانے کی وجہ سے مقالہ بے وقعت ہو جاتا ہے۔ میں نے ایک بہت بڑی جامعہ میں ایسی ہی ایک مقالہ نگار کے جعلی اقتباسات پکڑ لیے تھے حسب روایت لڑکی رونے لگی لہٰذا اسے کچھ نہ کہا گیا لیکن میں نے اپنی رپورٹ میں بطور خاص یہ لکھا کہ کتابیں دیکھ کر تمام جعلی اقتباسات درست کر دیے جائیں۔

اسی طرح جامعات کے تحقیقی مقالات میں بالعموم یہ لکھا جاتا ہے ''بقول فلاں مغربی مفکر''، ''فلاں دانشور کی اس ضمن میں یہ رائے ہے''، ''اس سلسلہ میں فلاں مشہور نقاد نے یہ لکھا ہے'' وغیرہ وغیرہ، ایسے غیر مستند حوالے بالعموم جعلی ہوتے ہیں۔ اگر مقالہ کا نگران توجہ دے تو ایسی جعل سازی روکی جا سکتی ہے لیکن نگران حضرات مقالہ کے بجائے مقالہ نگار (لڑکی) کو دیکھنے میں زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ہمارے بعض ناقدین یہ کرتے ہیں کہ انگریزی مقالات کی اپنے الفاظ میں (حوالہ دیے بغیر) تلخیص کر کے مقالہ کے اختتام پر انگریزی کتابیات درج کر دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ تلخیص ترجمہ سے جداگانہ ہے اور دونوں کی اپنی اپنی حدود ہیں۔ ''اصولِ انتقادِ ادبیات'' میں سیّد عابد علی عابد نے روایت پر جو کچھ قلم بند کیا وہ ٹی ایس ایلیٹ کے مشہور مقالہ "Tradition and the indvidual talent" کی تلخیص ہے۔

اب تحقیق کی بات ہو رہی ہے تو اس ضمن میں یہ عرض بھی کروں کہ جامعات کے تحقیقی مقالات کی عمومی بے توقیری کا ایک سبب (بلکہ بنیادی سبب) یہ بھی ہے کہ ''احوال و آثار'' والے مقالات کا ایک فارمولہ بلکہ سانچہ بن چکا ہے جس میں مقالہ کا موضوع بننے والی شخصیت کو فٹ کیا جاتا ہے، اس طرح کے مقالات میں بالعموم ایک باب ''سیاسی اور سماجی پس منظر'' کے لیے لازماً وقف ہوتا ہے

پاکستان میں بھی اور انڈیا میں بھی۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ڈاکٹر جلیل اشرف کے ڈاکٹریٹ کے لیے تحریر کردہ تحقیقی مقالہ کی کتابی صورت میں اشاعت کے موقع پر اپنے "پیش لفظ" میں اس ضمن میں یہ لکھا:

"اکثر و بیشتر مقالات میں پہلا باب کچھ اس طرح کا ہوتا تھا "معاشرتی و سماجی پس منظر" اور نہایت کم تعداد میں مقالات کو چھوڑ کر اس باب میں بالعموم خرافات کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا.....اس عنوان کے زیر تحت لکھا ہوا باب اور باقی کتاب ایک ایسے شعر کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو وحدتِ معرعوں سے مل کر بنا ہو اور اگر ایک معرع کو حشو سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے تو دوسرے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مجھے یاد ہے جب دہلی کے ایک پروفیسر نے ایک ادبی موضوع پر مقالہ لکھا اور اس کا بیشتر حصہ معاشرتی، سماجی اور سیاسی پس منظر پر مبنی لاتعلق مباحث کی نذر کر دیا تو قاضی عبدالودود کا یہ جملہ ملک بھر میں گونج اٹھا تھا کہ جس ادبی موضوع پر یہ تحقیقی مقالہ لکھا گیا ہے اس کے سوا اس کتاب میں سب کچھ موجود ہے۔"

(جلیل اشرف، ڈاکٹر؛ "ڈاکٹر سلیم اختر: بحیثیت نقاد" منشا پبلی کیشنز، ہزاری باغ، (بہار) ۱۹۹۸ء ص ۱۱)

تحقیقی اور تنقیدی مقالات و کتب میں حوالہ نقل کرنے کے سلسلہ میں جتنی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے بالعموم اسے ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ انگریزی کی بیشتر کتب پر یہ تحریر ہوتا ہے کہ مصنف/ ناشر کی اجازت کے بغیر کتاب کا کوئی حصہ نقل یا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ وہاں کتاب کمرشل چیز ہے، ہمارا رویہ اس کے برعکس ہے۔ اقتباس تو چھوٹا سا ہوتا ہے یہاں تو چند کتابوں سے مقالے یا افسانے جمع کیے اور مصنفین یا ناشرین سے اجازت لیے بغیر ایک کتاب مرتب کر کے مفت میں مصنف بننے کا کریڈٹ حاصل کر لیا۔

انگریزی میں حوالہ نقل کرنے میں کتنی احتیاط برتی جاتی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس طرح کسی خاص نکتہ پر زور دینے کے لیے ہم کچھ سطروں کے نیچے خط کھینچ دیتے ہیں انگریزی میں اس مقصد کے لیے "Italics" سے کام لیا جاتا ہے۔ حوالہ نقل کرنے والا اگر عبارت کے کچھ الفاظ "Italics" میں لکھے تو حاشیہ میں یہ لکھ کر اس کی وضاحت کر دیتا ہے:

"Italics Mine"

کسی کی رائے نقل کرنے میں احتیاط پسند ناقدین/ محققین اتنی احتیاط برتتے ہیں کہ اگر متن میں املا، سنہ وغیرہ کی غلطی ہو تو اسے اسی طرح نقل کر کے حاشیہ میں غلطی کی نشان دہی کر دی جاتی ہے اور مناسب طریقہ بھی یہی ہے۔

سرقہ، جعل سازی، تحریف، الحاقات اور ان سے ملتے جلتے افعال کی روک تھام کے لیے تعزیری قوانین تو نہیں اس لیے ان افعال کے مرتکب حضرات جب Expose ہو جاتے ہیں تو ان کے خلاف (سرکاری ملازم ہونے کی صورت میں) تحکمانہ کارروائی نہیں ہوتی بس ذرا سی بدنامی ہو جاتی ہے۔ اظہر جاوید نے ماہنامہ "تخلیق" (لاہور۔ اگست ۲۰۰۸ء) کے اداریہ میں یہ بھی لکھا:

"یہ کہنا فلاں خاتون نے پی ایچ ڈی کا تھیسس فلاں مرد سے لکھوایا ہے.....اور جو مرد حضرات مخملیے پر تھیسس حاصل کر لیتے ہیں ان کو گریبان سے کون پکڑے؟

مرحوم احمد ندیم قاسمی نے ایک ڈاکٹر بننے والے نوجوان (اب مرحوم) کے اعزاز میں ہونے والی تقریب میں سرعام کہہ دیا تھا، مبارک تو عبداللہ قریشی کو ملنی چاہیے جنھوں نے تمام محنت کی ہے۔ ابھی دو چار ماہ پہلے، لاہور کے ایک لیکچرار کو، جو شاعر، کالم نگار اور

پتا نہیں کیا کیا ہیں، ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی ہے.....تمام اردو دان حلقوں میں یہ افواہ خبر کی طرح گشت گردش کر رہی ہے کہ یہ تھیسس ملتان سے آیا ہے۔وہ غیرت مند، جی دار، اور دلیر مرد جو صرف خواتین کو گالیاں دے سکتے ہیں، ان کی ڈگریوں پر شک کر سکتے ہیں کیا انھیں نظر نہیں آتے.....کیا مرد قیمتاً شعر نہیں لکھواتے.....یہاں تک کہ کالم اور مضمون لکھنے کے لیے بھی مشقتی رکھے ہوئے ہیں۔"

حوالہ جات کے سلسلہ میں ایک صاحب نے دوسرے کے بارے میں کتاب لکھ دی۔وہ صاحب شرمندہ ہونے کے بجائے مجھ سے کہنے لگے.....میں تو ہیرو بن گیا۔کیا تمھارے خلاف کسی نے کتاب لکھی ہے۔خدا نہ کرے کہ میں یوں ہیرو بنوں، میں ویلن ہی ٹھیک ہوں۔

دراصل بنیادی طور پر یہ اخلاقیات کا مسئلہ ہے۔قانونی تعزیرات سے اس کا سدباب نہیں ہو سکتا۔سخت قوانین چوری، ڈاکا اور قتل نہیں روک سکتے تو پھر تحقیق وتنقید میں دوسرے کی محنت سے (حوالہ دیے بغیر) استفادہ کیسے روکا جا سکتا ہے۔

تحقیقی اور تنقیدی چوریاں کرنے والوں میں اگر ضمیر ہو تو وہ حوالہ چوری سے باز رہ سکتے ہیں انھیں زبردستی باز نہیں کرایا جا سکتا۔تاہم کچھ تجاویز پیش ہیں:

۱۔ملک کی تمام جامعات میں علمی سطح پر روابط کا فقدان ہے جس کے نتیجہ میں بعض اوقات کئی جامعات میں بیک وقت یکساں یا ملتے جلتے موضوعات پر کام ہو رہا ہوتا ہے۔بالخصوص اس وقت جب کسی تازہ مرحوم پر "احوال وآثار" والے مقالات لکھے جا رہے ہوں۔اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام جامعات تحقیقی مساعی سے ایک دوسرے کو باخبر رکھیں۔اصولاً تو ایم اے، ایم فل اور ڈاکٹریٹ کے تمام مقالات کی نقول تمام جامعات کو مہیا کی جائیں اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم تحقیقات کا موضوع بننے والے مقالات کے عنوانات اور کتابیات تو ضرور ہی بھیجی جانی چاہیے۔اس مقصد کے لیے انٹرنیٹ سے کام لیا جا سکتا ہے۔HEC اس کے مقصد کے لیے مخصوص Cell قائم کر سکتا ہے اور تمام جامعات کو پابند بنایا جائے کہ HEC کے سیل کے لیے تمام تحقیقی مقالات کی ایک کاپی ضرور ارسال کریں۔

۲۔ایم اے (اردو) کا مقالہ لکھنے کے بعد اسی کو ایم فل اور پھر ایم فل کے مقالہ کو بعض اوقات ڈاکٹریٹ کے مقالہ میں تبدیل کر دیا جاتا ہے جو کہ اس بنا پر غلط ہے کہ ایم اے کے بعد ایم فل اور ڈاکٹریٹ کے لیے کون سی نئی معلومات اور انوکھے کوائف ایجاد کیے جائیں گے۔

میں جن جامعات کے بورڈ آف سٹڈیز کا رکن رہا ہوں میں نے وہاں ہمیشہ اس روش کے خلاف آواز بلند کی کہ یوں موضوع کو سیڑھی بنانے کے رویے کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے مگر بوجوہ میری بات نہ مانی گئی۔

۳۔ہمارے ہاں کتابیات اور اشاریوں پر "تحقیق" کرائی جاتی (جو اونچے درجہ کی کلرکی ہے) ایسے "موضوعات" سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ ان کا سرقہ باآسانی ہو سکتا ہے۔

۴۔مقالہ نگار جب مقالہ تحریر کر رہا ہو تو نگران/سپروائزر خصوصی توجہ سے اس امر کو یقینی بنائے کہ وہ تحقیق کی صراطِ مستقیم سے انحراف نہ کرنے پائے لیکن ضرورت سے زیادہ "معروف" نگران پروفیسر کے پاس نگرانی جیسے فضول کام کے لیے وقت نہیں ہوتا، ویسے بھی یہ نگرانی بلا معاوضہ ہوتی ہے تو پھر کون سر کھپائے۔

۵۔جامعات میں کی گئی تحقیق میں خرابیوں کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ صرف جامعہ کا استاد ہی مقالہ کا نگران بن سکتا ہے۔

ایم اے تک تو یہ ٹھیک ہے لیکن ایم فل اور بالخصوص ڈاکٹریٹ کے لیے تحریر کردہ مقالات کے نگران متذکرہ موضوع کے بارے میں خصوصی مہارت یا شہرت رکھنے والے باہر کے ناقدین یا محققین بنانے چاہئیں اور انھیں معقول معاوضہ دیا جانا چاہیے۔ ادب ونقد اور زبان کی خدمت کے زمانے لد گئے ہیں لہٰذا نگران بننے والے کی محنت کا حق اسے ملنا چاہیے۔

۶۔ جامعات کے صدر شعبہ اور شعبہ کے اساتذہ پرچے دیکھنے اور سیاست گردی میں اتنے معروف بلکہ ملوث ہوتے ہیں کہ ان کی زیرِ نگرانی مقالہ نگار کی درست راہنمائی نہیں ہو سکتی اس لیے مقالہ نگار جو بھی تحقیق فرما دے وہ درست باور کی جاتی ہے اور یہی باعث خرابی ہے۔

۷۔ جامعات کی اخلاقیات کی رو سے سرقہ کے مرتکب طالب علموں یا سکالرز کے خلاف کارروائی نہیں کی جاتی اگر سرقہ پر مبنی تھیسس مسترد کر دیا جائے یا تادیبی کارروائی کی جائے تو اس کا خاطر خواہ اثر ہوگا اس ضمن میں بھی HEC اہم اور فعال کردار ادا کر سکتا ہے کیونکہ HEC کے پاس وسائل بھی ہیں اور اختیارات بھی۔

۸۔ یقیناً انٹرنیٹ کا بہت فائدہ ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انٹرنیٹ سرقہ کا موثر ذریعہ بھی ثابت ہو رہا ہے۔ گذشتہ برس پنجاب یونیورسٹی کے ایسے چھ اساتذہ کے خلاف تادیبی کارروائی ہوئی جنھوں نے انٹرنیٹ سے مقالہ چرا کر اپنے نام سے پیش کر دیا تھا۔ لہٰذا انٹرنیٹ کے استعمال کے سلسلہ میں کڑی نگرانی کی ضرورت ہے۔

۹۔ اردو (ایم فل، پی ایچ ڈی) کا تحقیقی مقالہ صرف ایک شخص قلم بند کرتا ہے جبکہ سائنس کے موضوعات کی تحقیق فردِ واحد کے بجائے گروپ کی اجتماعی کاوش ہوتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ بالعموم جونیئر کام کرتے ہیں لیکن پہلا نام صدر شعبہ یا سینئر پروفیسرز کا ہوتا ہے۔ HEC کو اس پر پابندی عائد کرنی چاہیے اور جو بھی موضوع ہو صرف فردِ واحد ہی اس کا ذمہ دار ہو، اس صورت میں کسی خامی یا غلطی کی اصلاح کرتے ہوئے صرف ایک ہی کو ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے اسی کی توصیف یا برعکس بات کی جا سکتی ہے۔

۱۰۔ مقالہ کا نگران زیرِ نگرانی کام کرنے والے سکالر کی کارکردگی کی سہ ماہی رپورٹ HEC کو پیش کرتا ہے جو بالعموم رسمی ہوتی ہے۔ نگران کو پابند کیا جائے کہ وہ تمام کام کی واقعی نگرانی کرتے ہوئے حقائق پر مبنی رپورٹ تحریر کرے۔

۱۱۔ اگر سرقہ یا اور کسی نوع کی بدعنوانی کے سراغ ملیں تو تعلقاتِ عامہ اور لڑکی کی شکل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے مقالہ کی تحریر کے دوران ہی سرقہ کرنے والے کو متنبہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی ضمن میں ڈین اور وائس چانسلر پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ یہ ان کی یونیورسٹی کی عزت اور وقار کا بھی مسئلہ ہے۔

۱۲۔ جامعات میں تحقیق کی نہج مقرر کرنے میں صدر شعبہ اساسی کردار ادا کرتا ہے، موضوع کی منظوری سے لے کر مقالہ کی تکمیل اور روائی وا تک۔ لہٰذا سرقہ کے انسداد کے سلسلہ میں صدر شعبہ فعال کردار ادا کر سکتا ہے بہ شرطے کہ جامعی سیاست میں ملوث صدر شعبہ کے پاس اس کارِ خیر کے لیے کچھ وقت بھی ہو۔

حوالہ جات

۱۔ ''خواب وخیال'' مقدمہ صفحہ ک انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۵۰ء (بار دوم)

۲۔ ''ایضاً'' صفحہ ل

مجید امجد کی نظم ''رفتگاں'' کا تجزیاتی مطالعہ

مشتاق احمد بیگ

رفتگاں

رات تھی اور نیم تاباں مشعلوں کی روشنی
رات تھی اور پیاسی آنکھوں، ہنستے چہروں کے ہجوم
سامنے میزوں پہ رنگا رنگ جام
پی رہے تھے ہونٹ ارمانوں کی آگ!

جب بھی تارِ رغنوں سے آ کے ٹکراتی کسی وحشی تمنا کی پکار
جھن جھناُٹھتیں دلوں کی بستیاں
اپنی پلکوں کو جھکا لیتیں چراغوں کی لویں
ناچتے جسموں کے جنگل میں بھڑک اُٹھتی ارمانوں کی آگ

آہ وہ محدود آہنگوں میں اپنے زمزمے
جیسے طوفاں میں گھری کشتی سے کوئی ساحلِ گم گشتہ کو آواز دے!
آہ وہ مجروح سینوں سے اُبلتے قہقہے
جیسے انگاروں بھرے جھگڑ میں کوئی بے اماں راہی پکارے
منزلِ روپوش کو!

ہائے وہ مدہوش لوگ
مست پنچھی، جن کے جلتے پنکھوں کی آتشِ دل کو ہوا دیتے گئے
کس گپھا میں کھو گئے؟
کیا انھیں سکھ کی کہیں بھی وہ کرن حاصل ہوئی
وہ کرن، جو رات بھر ان نیم تاباں مشعلوں کے روپ میں ہنستی رہی
وہ کرن، جو ان کی دنیا میں چمک کر ان کے دل میں بجھ گئی!

رات یاس ہے اور روشنی آس۔ انسانی زندگی ہو یا سفر شاعری یہ تصورات ازل سے قائم ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ صحرا کی لامحدود وسعت ہو یا جنگل کی وحشت ناک ہیئت، رات تاریکی میں نیم تاباں مشعلوں کی روشنی ایک طرف بھٹکے ہوئے مسافروں کے لیے سراغِ منزل ہے تو دوسری طرف اس فضا اور ماحول کے لیے بھی امید افزا جہاں انسانی زندگی کے قافلے کچھ دیر ستانے کے لیے ٹھہرتے ہیں۔ تاہم زندگی کی تلخیوں سے گھبرائے لوگ جب شراب سے لبریز پیمانوں، موسیقی کے سریلے سُروں اور تھرکتے، ناچتے انسانی جسموں میں سکون تلاش کرتے ہیں تو زندگی کی حقیقتوں سے اُن کا یہ فرار اُن کی ناکام اور نا تمام حسرتوں کا نوحہ بن جاتا ہے۔ ایسے میں لاحاصل جستجو انسانی وحشت کا سبب تو بنتی ہی ہے اُس جنون کا باعث بھی ہو جاتی ہے جس کے ہر گام پر تخریب اپنا دامن پھیلائے کھڑی ہے۔

انسان فطرتاً خود غرض ثابت ہوا ہے اس لیے اپنی خواہشات کی تکمیل کو زندگی کا حاصل سمجھتا ہے۔ مگر اس کے کبھی ارمان فانی دنیا میں کم ہی پورے ہوتے ہیں۔ موت انسان کے فنا کے ساتھ ساتھ اس کے ارمانوں کا بھی گلا گھونٹ دیتی ہے۔ یوں انسان کی عارضی خوشیاں کسی ابدی و حقیقی مقام سے آشنا ہوئے بغیر ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ امید نا امیدی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے اور آس یاس میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

نظم "رفتگاں" میں شاعر نے ایسی ہی ایک تاریخی حقیقت کو موضوع بنایا ہے۔ تاریخ جن لوگوں کے کارناموں اور داستانوں سے بھری پڑی ہے مجید امجد کی نظر میں وہ سب لوگ اپنی نا تمام تمناؤں کے ساتھ فنا ہو گئے۔ اُن کے ارمان اُن کے دل میں رہے اور اُن کے خواب ادھورے رہ گئے۔

اس نظم کو اگر واقعاتی حقائق کی روشنی میں پرکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ ماضی سے تعلق رکھنے والے خاص و عام لوگ ایک قافلے کی صورت اکٹھے ہیں یعنی کسی بیاباں میں رات کی تاریکی ہے اور نیم تاباں مشعلوں کی روشنی میں ایک انسانی ہجوم پیاسی آنکھوں مگر ہنستے چہروں کے ساتھ زندگی کی میز پر خواہشات کے رنگا رنگ جام سجائے محوِ رقص ہے۔ بظاہر اس مصرعے میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ پیاسی آنکھوں کے ساتھ ہنستے چہروں کی آمیزش عجیب تاثر پیدا کرتی ہے کیونکہ آنکھوں کی پیاس، ہوس اور طلب کا استعارہ ہے اُس جستجو کا جس نے ابھی پروان چڑھنا ہے جبکہ چہرے پر مسکراہٹ کے تاثرات کچھ پا لینے کی سرشاری سے جنم لیتے ہیں۔ بات سیدھی ہے اگر سرشاری ہو تو ہوس باقی نہیں رہتی اور اگر طلب موجود ہو تو سرشاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ممکن ہے "ہنستے چہروں" سے شاعر کی مراد اُس کارواں کی زندگی سے عدم سنجیدگی ہو یا پھر اُن کا زندگی پر طنز، جب انسان بے بس ہوتا ہے تب اُس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے اور پھر آنکھوں کا پیاسا ہونا بھی تو اس بات کو ثابت کرتا ہے البتہ پوری نظم کے باطنی تاثر کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وہ لوگ دراصل اپنی خواہشات کے حصول میں سرگرداں ہیں مگر بے بس اور مجبور کیونکہ نظم کا اگلا مصرعہ "پی رہے تھے ہونٹ ارمانوں کی آگ!" اُن کی تمام آرزوؤں کی عکاس ہے۔ اس مصرعے میں جہاں آگ کا پینا انکا رنا سف ہے تو اپنی دوسری صورت میں خوشیوں کی تہہ میں چھپا اُس کرب اور دُکھ کا استعارہ بھی جسے وہ خواہشات کے پورا نہ ہونے کی صورت میں قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ یا یوں کہیے کہ امید اور نا امیدی کی کشمکش میں مبتلا وہ ہجوم اگرچہ زندگی کی حقیقتوں سے بے نیاز دکھائی دیتا

ہے مگر اُس کی ہستی سے زندگی کی سفاکی اور بے رحمی پر طنز کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ ہجوم صرف خواہشات کی رنگا رنگ شراب سے ہی دل نہیں بہلا رہا بلکہ وہاں موسیقی کے درد بھرے ساز کسی وحشی تمنا کی پکار کو مزید پُر سوز بنانے کے لیے موجود ہیں۔ ایسے میں ''تارِ رغنوں'' سے نکلنے والے دردناک سر اور دیوانگی سے بھرپور نغمات اُن کی مخفی آرزوؤں کو ہوا دے رہے ہیں اور پھر ''جھن جھنا اٹھتیں دلوں کی بستیاں''۔اس مصرعے میں ''جھن جھنا اٹھتیں'' کی ترکیب سے جہاں صوتی آہنگ مقصود ہے وہاں اس جذبے کا اظہار بھی ہے جو اس ہجوم کے دلوں میں ارمانوں کی صورت مچل رہا ہے۔اس سے پہلے مصرعے میں شاعر نے ''تارِ رغنوں'' اور ''وحشی تمنا کی پکار'' کی تراکیب کی مناسبت سے ''جھن جھنا اٹھتیں'' کو استعمال میں لا کر جو معنوی ربط پیدا کیا ہے اس سے نظم کے مجموعی تاثر میں اضافہ ہوا ہے۔ایک منظر ہے جو آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے اور قاری خود کو ان لوگوں کے درمیان محسوس کرتا ہے۔تاہم بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ موسیقی اور گائیکی کے ساتھ ساتھ رقص کے مناظر بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔''اپنی پلکوں کو جھکائیں چراغوں کی لویں'' ناچتے جسموں کے جنگل میں بھڑکنے لگتی ارمانوں کی آگ۔''

رقص کے یہ دلفریب مناظر جہاں نظم کی فضا کو پُر کیف بناتے ہیں وہاں بے پایاں انسانی جذبات کے اظہار کی عکاس بھی ہیں۔کھلی فضا میں جب چراغ جلائے جاتے ہیں تو ہوا کے دباؤ سے پھیل کر تھرتھرانے لگتے ہیں اُن کے یوں پھیلنے اور تھرتھرانے سے شاعر کارقص مراد لینا اور پھر ناچتے جسموں سے اُنھیں تشبیہ دینا پوری نظم کے ماحول کو سحر کن بنا رہا ہے۔چراغ چونکہ زیادہ ہیں اور اُن کی روشنی ہوا کے دباؤ کے باعث حرکت بھی کر رہی ہے تو شاعر نے روشنی کی اس تحریک کو انسانی خواہشات کی شدت کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔دراصل وہ چراغ بھی اپنی ناتمامی کے خوف سے متحرک ہو رہے ہیں اور یوں لگ رہا ہے جیسے اُن کے دل میں بھی کئی ارمان مچل رہے ہیں جبکہ وہاں موجود ہجوم بھی اپنے اپنے ارمانوں کا بوجھ اُٹھائے اسی جذبے سے محوِ رقص ہے۔جوں جوں روشنی، یعنی اُمید کی کرنیں پھیل رہی ہیں اس ہجوم کی خواہشات بڑھتی جا رہی ہیں اور ان میں پہلے سے زیادہ شدت آ رہی ہے مگر شاعر کی نظر میں اُس ہجوم کی یہ کیفیت مستقل نہیں کیونکہ کبھی کبھار اُن کے جذبات میں ٹھہراؤ بھی آ جاتا ہے اور وہ دھیمے سروں سے لپٹے درد بھرے نغمات میں ڈوب کر اپنی تمناؤں کے خلا کو پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''آہ وہ محدود آہنگوں میں لپٹے زمزمے'' ''جیسے طوفاں میں گھری کشتی سے کوئی ساحلِ گم گشتہ کو آواز دے!'' آلاتِ موسیقی میں ''تارِ رغنوں'' کے برعکس ''محدود آہنگ'' کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔موسیقی سے شغف رکھنے والے سمجھتے ہیں کہ دُکھ کا اظہار اپنی بہترین صورت میں دھیمے سروں ہی سے کیا جاتا ہے۔اس نقطۂ نظر سے یہاں ''محدود آہنگ'' کی اصطلاح کا استعمال نہ صرف شاعر کے علمِ موسیقی سے گہرے لگاؤ کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ نظم کی فضا میں ایک ایسا موڑ بھی ہے جس سے اس ہجوم کے کرب اور شدتِ غم کا اظہار نمایاں ہونے لگتا ہے اور پھر متذکرہ بالا مصرعۂ ثانی بذاتِ خود غم واندوہ کی اس کیفیت کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے جو اس ہجوم کے پیشِ نظر ہے جبکہ اگلے مصرعہ میں ''آہ وہ مجروح سینوں سے اُبلتے قہقہے'' زخموں سے کراہنے اور تکالیف کے اظہار کو نمایاں کرنے میں معاون و مددگار ہونے کے ساتھ ساتھ بیان کی انوکھی وانفرادی کاوش ہے۔موسیقی کی فنونِ لطیفہ میں انفرادیت یہی ہے کہ اُس کے زور دار اور دھیمے سر انسانی جذبات کو اُبھارنے اور اُن سے حظ حاصل کرنے کا باعث بنتے ہیں۔جب انسان کے درد کا اظہار نثر سے ہوتا ہے

تو وہ چیخنے چلانے کی بجائے ''واہ، واہ'' کر کے اپنے جذبات کا کتھارسس کرتا ہے۔ یوں جذبات کے اظہار کی سرشاری، سرخوشی میں بدل جاتی ہے تاہم اس سرشاری و سرخوشی میں گہرا طنز چھپا ہوتا ہے جسے شاعر کی عمیق نظریں خوب پہچانتی ہیں۔ جبھی تو ''جیسے انگاروں بھرے جھکڑ میں کوئی بے اماں راہی پکارے' امنزلِ روپوش کو!' اِن دونوں مصرعوں میں ''انگاروں بھرے جھکڑ''، ''بے اماں راہی' اور'' منزلِ روپوش'' کی تراکیب میں ایک فکری وحدت بھی ہے اور نا تمام آرزوؤں کے دُکھ کا اظہار بھی۔ یہ تینوں کیفیات کسی بہت بڑی اور مصائب سے آراستہ زندگی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں یا یوں کہیے کہ انسان کی تمام عمر کسی افتاد سے کم نہیں اور وہ ہمیشہ اپنے آپ کو پر سکون رکھنے کے لیے ان مصائب کا مقابلہ کرتا ہے مگر بے سود، کیونکہ اس بے اماں کو ازل سے ہی ان مشکلات کا سامنا ہے۔ اُسے کہیں سکون میسر نہیں آتا، اسے اس کی گم شدہ منزل کا ادراک نہیں ہوتا اور وہ درماندہ مسافروں کی طرح ہمیشہ اپنے ارمانوں کی تکمیل میں مارا مارا پھرتا ہے یہاں تک کہ اُس کا وجود فنا کی لذت سے آشنا ہو جاتا ہے۔ تاہم زندگی کے اس سفر میں اس کی جستجو دیوانوں کی سی ہوتی ہے اور اُس کا جنون کم ہونے کی بجائے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ شاعر جب اس جنون کے پردے میں چھپا تمام ارمانوں کا درد بھانپ لیتا ہے تو اُن کی ناکامیوں پر پکار اُٹھتا ہے ''ہائے وہ مدہوش لوگ' امست پنچھی، جن کے جلتے پنکھ اُن کی آتشِ دل کو ہوا دے گئے!'' کس گپھا میں کھو گئے؟'' ان تین مصرعوں میں شاعر کی سوچ ہمدردانہ بھی ہے اور مفکرانہ بھی۔ لفظ ''ہائے' اپنے وجود میں حسرت و بے بسی کا ایک عالم آباد کیے ہوئے ہے۔ یہ لفظ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل اور ان میں بسنے والے تمام انسانوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ شاعر جب کہتا ہے کہ ''وہ مدہوش لوگ'' تو اس سے مراد صرف ''رفتگاں'' ہی نہیں بلکہ اس قبیل سے تعلق رکھنے والے وہ تمام انسان ہیں جن کی زندگیاں اس لاحاصل جستجو کی نظر ہو گئیں اور پھر ''مست پنچھی'' کی ترکیب دیکھیے۔ انسان کی روح کی طرف اشارہ ہے جو ایک پنچھی کی مانند جانے کب اُڑ جائے اور پھر اس ترکیب کی مناسبت سے ''جلتے پنکھ'' اور آتشِ دل کی تراکیب کا استعمال جہاں انسان کی بے ثباتی کو ظاہر کرتا ہے، وہاں اُس کیفیت کو بھی جس میں کائنات میں بسنے والے تمام انسانوں کے درد و غم کا اظہار بھی ہے۔ جب وہ کہتا ہے ''کس گپھا میں کھو گئے؟'' تو اس کے لہجے میں استفہام کے ساتھ ساتھ طنز بھی پوری آب و تاب سے ظاہر ہوتا ہے اور یہ تین مصرے نظم ''رفتگاں'' کے کلی تاثر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

انسان زندگی بھر جن آرزوؤں کی تکمیل کے لیے تکالیف برداشت کرتا ہے در در کی ٹھوکریں کھاتا ہے، ظلم اور زیادتی کے بازار گرم کرتا ہے، خون کی ہولی کھیلتا ہے، بڑی بڑی سلطنتیں قائم کرتا ہے مگر ایک دن اپنی تمام خواہشات سمیت فنا ہو جاتا ہے اور شاعر ایسے انسانوں کی ناتمامی اور بے بسی پر نظم کے آخری تین مصرعوں میں چند سوالات اُٹھاتا ہے جن کا تعلق اگرچہ گزرے ہوئے لوگوں سے نظر آتا ہے مگر اس کا مقصود وہ تمام لوگ ہیں جو گزرتے ہوئے حال اور آنے والے مستقبل میں اپنا وجود رکھتے ہیں۔ آخری تین مصرعے ملاحظہ ہوں۔

''کیا انھیں سُکھ کی کہیں بھی وہ کرن حاصل ہوئی۔''
وہ کرن، جورات بھر ان نیم تاباں مشعلوں کے روپ میں ہنستی رہی۔''
''وہ کرن جوان کی دنیا میں چمک کر اُن کے دل میں بُجھ گئی۔''

کرن روشنی سے ماخوذ ہے اور روشنی حقیقت، ایک ایسی امید جو انسان کو زندہ رہنے پر مائل رکھتی ہے۔ شاعر کے نزدیک زندگی کا مقصد حقیقتِ ازلی کا حصول ہے کیونکہ ہمیشہ رہنے والا سکھ حقیقت کے ادراک میں ہے اور زندگی بذاتِ خود ایک حقیقت جس نے اسے سمجھ لیا اُسے کائنات کی تمام حقیقتوں کا ادراک ہو گیا۔ تاہم جو افراد زندگی کے فریب میں مبتلا ہو کر جسمانی و عارضی لذت کو تلاش کرتے ہیں اُن کے حصے میں فنا سے زیادہ کچھ نہیں آتا اور ایک پچھتاوا اُن کی زندگی کا حرفِ آخر ٹھہرتا ہے۔

شاعر چونکہ روشنی کی کرن کو انسان کے سکھ سے تعبیر کرتا ہے اس لیے وہ ان تاریکیوں سے نجات کا طالب ہے جو انسان کو مایوسیوں کے اندھے کنوؤں میں دھکیلنے کا موجب بنتی ہیں۔ وہ گزرے ہوئے افراد کی ناتمامی اور ناکامی پر نوحہ کناں ہے اور اُن کے عبرتناک اور لاحاصل انجام سے حال اور مستقبل کو بہتر بنانے کا آرزومند ہے۔ وہ گزرے ہوئے کل میں آج کی تصویر دیکھنے کا خواہشمند ہے۔ وہ انسان کی اس بے بسی پر آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ اُس کے ''محض مجبور'' ہونے کا اعتراف بھی کرتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی دنیاوی خواہشات تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا مقصد اپنی ذات سے ماورا ہو کر انسانیت کے اجتماعی مفادات اور بقا میں ہے۔

مجید امجد کی خوبی یہ ہے کہ وہ زندگی کا باریک بین اور مخلص پارکھ ہے۔ وہ ایک فرد کی بجائے معاشرے کے تمام افراد کے درد کو محسوس کرتا ہے یہی باعث ہے کہ اس کی شاعری میں بالعموم اور اس نظم میں بالخصوص اس کے اس اجتماعی شعور کی جھلک بڑی نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ زندگی کی کیفیت پر یقین رکھتا ہے اور روشنی کو امید اور عمل کا استعارہ گردانتا ہے۔ وہ لمحۂ موجود کی قدر و قیمت سے پوری طرح آشنا ہے اس لیے لاحاصل جستجو اور ناتمام آرزوؤں کی بجائے زندگی کی حقیقی خوشیوں کا طلب گار ہے۔ وہ یاس کی تاریکیوں میں آس کے چراغ روشن کرتا ہے اور اُن چراغوں سے جنم لینے والی کرنوں کو انسانی دلوں میں جگمگاتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ محبت کے لافانی جذبات پر یقین رکھتا ہے اس لیے مادی آلائشوں اور جسمانی خواہشات سے دور بھاگتا ہے۔ اس کے نزدیک جو لمحات حقیقی محبت کے حصول میں بسر ہو جائیں وہ زندگی کا حاصل ہیں ورنہ تمام عمر ناتمام ارمانوں اور ناکام آرزوؤں کی آگ میں جلنا ہوگا جہاں حرص و ہوس کے آرے جسم کو کاٹتے رہیں گے اور انسانی وجود کے فنا کا باعث بنیں گے۔

فنی اعتبار سے نظم ''رفتگاں'' اپنی عام فہم مگر منفرد تراکیب اور بے مثال صوتی آہنگ سے مزین ہے۔ اس کے ارکان یہ ہیں۔

فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن۔ اس نظم میں مجموعی لحاظ سے اُنیس مصرعے ہیں۔ پہلے آٹھ مصرعوں میں قافیہ، ردیف کا التزام نہیں ملتا جبکہ نواں، دسواں، گیارھواں اور بارھواں مصرعہ ہم قافیہ ہے۔ پندرھواں اور سولھواں مصرعہ ایک ہی قافیہ رکھتا ہے آخری تین مصرعے ہم قافیہ رکھے گئے ہیں۔ اس نظم میں چوتھا اور آٹھواں مصرعہ بھی ایک ہی قافیہ رکھتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ نظم کی اعلیٰ ہیئت اور آہنگ اس کے مفہوم کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ نظم کی فکری گہرائی اعلیٰ ہیئت اور آہنگ کا تقاضا کرتی ہے۔ ان دونوں حوالوں سے مجید امجد کی اس نظم کا مطالعہ نئی سمتوں کی خبر دیتا ہے۔

-----☆-----☆-----

حسرت موہانی کی صحافت

سہ ماہی تذکرۃ الشعرا واخبار مستقل

شفقت رضوی

(مولانا حسرت موہانی کی صحافت کے سلسلہ میں ان کے رسالے "اردوئے معلّٰی" کا تفصیلی ذکر ہمارے مضمون "اردوئے معلّٰی" مشمولہ رسالہ مخزن شمارہ (۱۲) میں ہو چکا ہے۔ اس سلسلے کا دوسرا مضمون "سہ ماہی کتابی سلسلہ تذکرۃ الشعرا" کا حال درج ذیل ہے۔)

مولانا حسرت موہانی کا رسالہ "اردوئے معلّٰی" جو جولائی ۱۹۰۳ء میں علی گڑھ سے جاری ہوا تھا، سیاسی مضامین کی وجہ سے حکومت کی نظر میں کھٹکتا تھا۔ اس کی طباعت مولانا کے اپنے "اردو پریس" میں ہوتی تھی۔ ۱۳ مئی ۱۹۱۳ء کو حکومت کی جانب سے انھیں نوٹس ملا کہ رسالے میں خلاف منشا پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء مضامین شائع ہوتے ہیں اس کی پاداش میں تین ہزار روپیہ زرضمانت اندرونی ایک ہفتہ مجسٹریٹ ضلع کے پاس جمع کروائے جائیں۔ ورنہ اردو پریس ضبط کرلیا جائے گا۔ مولانا نے ضمانت جمع کرنے سے انکار کردیا۔ ایک ہفتہ کے دوران جون ۱۹۱۳ء کا شمارہ اردوئے معلّٰی شائع کردیا اور ۱۹ مئی سے اردو پریس کے ساتھ رسالہ اردوئے معلّٰی بھی مسدود ہوگیا۔

مولانا کو شاعری کے علاوہ تذکرہ نویسی اور صحافت سے خاصی دلچسپی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی انجمن اردوئے معلّٰی علی گڑھ کی نظموں میں وہ شاعروں کے بارے میں مضامین پڑھا کرتے تھے۔ رسالہ اردوئے معلّٰی میں بار بار اردو شاعروں کا تذکرہ لکھنے کے منصوبے بھی پیش کر چکے تھے اور اس سلسلے کے مضامین بھی شائع کیے تھے۔ اردوئے معلّٰی کے مسودہ کے بعد خیال ہوا کہ غیر سیاسی نوعیت کی صحافت شروع کی جائے کیونکہ سیاسی مضامین پر مشتمل کسی رسالے کو کوئی بھی پریس چھاپنے کو تیار نہ ہوتا۔ باقاعدہ ماہوار رسالہ نکالنے کی صورت میں حکومت سے ڈیکلریشن حاصل کرنا ضروری ہوتا اور پریس ایکٹ کے تحت جب تک زرضمانت جمع نہ کی جاتی ڈیکلریشن ملنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ انھوں نے اردو صحافت میں نیا تجربہ کرنے کی ٹھانی۔ بجائے باقاعدہ ماہوار رسالہ نکالنے کے انھوں نے سہ ماہی کتابی سلسلہ شروع کیا۔

سہ ماہی کتابی سلسلہ کا حصہ اول جز واول جولائی ۱۹۱۴ء کو شائع ہوا۔ اس کے دیباچے میں انھوں نے صراحت کی کہ:

"مئی ۱۹۱۳ء میں حکومت نے اردو پریس سے ۲۰۰۰ کی ضمانت طلب کی جو ادا نہیں کی گئی اس لیے اردو

پریس کا خاتمہ ہو گیا اور اسی کے ساتھ اردوئے معلّٰی بھی بند ہو گیا۔سیاسی حیثیت سے اردوئے معلّٰی اپنا فرض ادا کر چکا چنانچہ اس کا اظہار آخری رسالے میں ہو چکا ہے۔البتہ ادبی حیثیت سے اس کے بہت سے مقاصد ناتمام رہ گئے تھے جن کی تکمیل کے لیے یہ تذکرہ کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے۔فی الحال اس کتاب کے ہر سال چار جزو اور ہر جزو میں کم سے کم ۱۰۰ صفحات شائع ہوا کریں گے اور ہر چار اجزا کی پیشگی قیمت دو روپیہ مع محصول ڈاک لی جائے گی۔ہر جزو میں کچھ حصہ تذکرۃ الشعرا کا ہوگا باقی اوراق میں کلام اساتذہ کا انتخاب ہوگا جس کا بیشتر حصہ اس وقت تک غیر مطبوعہ اور کمیاب ہے۔"

(تذکرۃ الشعرا، حصہ اوّل جزو اوّل، ٹائٹل کی پشت پر)

تذکرۃ الشعرا کے ہر جزو کے لازمی حصے ایک یا دو شاعروں کے حالات اور کئی شعرا کے کلام کا انتخاب لازمی ہوتے۔ان میں کسی کی طوالت کی کوئی قید نہ ہوتی۔شعرا کے احوال میں ایک صفحہ کے مختصر متنوں سے لے کر ۱۵، ۱۶، صفحات تک پھیلے ہوئے مضامین بھی شائع ہوتے۔شعرا کے کلام کے انتخاب میں یہ لحاظ رکھا جاتا کہ جہاں تک ممکن ہو ایک استاذِ فن اور ان کے شاگردوں کا کلام منتخب کیا جائے کہ ایک دبستان کی نمائندگی ہو سکے۔انتخاب میں لحاظ رکھا جاتا کہ مطلع اور مقطع چاہے کمزور ہی کیوں نہ ہوں انتخاب میں شامل رکھے جائیں تاکہ غزل کی ظاہری صورت میں فرق نہ آئے۔زیادہ تر انتخاب غیر مطبوعہ دواوین سے کیا جاتا۔مولانا نے بے حد دوڑ دھوپ کر کے اور منہ مانگی قیمت ادا کر کے سیکڑوں شاعروں کے غیر مطبوعہ کلام کو جمع کر لیا تھا۔

نظم طباطبائی کی کتاب "ادب الکاتب والشاعر" کے صفحات قسط وار اردوئے معلّٰی میں بھی چھپتے رہے تھے۔اس کا سلسلہ تذکرۃ الشعرا کے ہر جزو میں شامل رہا۔

مولانا نے علی گڑھ کے محلّہ رسل گنج میں "سودیشی اسٹور" قائم کر رکھا تھا۔اس کا اشتہار آخری صفحہ پر ضرور ہوتا جس میں اسٹور میں دستیاب اشیاء کی مکمل فہرست ہوتی۔

تذکرۃ الشعرا، حصہ اول جزو اول:

یہ حصہ جولائی ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا، اس میں مولانا کے مضمون "حیات بخش رسا" کے علاوہ محمد علی عرش ملیح آبادی کا مضمون "ثاقب بدایونی" شامل ہیں۔ڈاکٹر احمر لاری سے سہو ہوا ہے انھوں نے ثاقب بدایونی پر مضمون کو مولانا کا لکھا ہوا بتلایا ہے حالانکہ مضمون کے آخر میں واضح طور پر مضمون نگار کا نام درج ہے۔

حیات بخش رساؔ کے بارے میں مولانا کا مضمون نہایت مختصر اور تشنہ ہے اس میں رسا کے پیدائش اور وفات کے سنین کا ذکر نہیں۔انھیں داغ دہلوی کا شاگرد بتلایا ہے اور جلال لکھنوی کا حوالہ دیا ہے کہ انھوں نے کہا "شاگردانِ داغ میں داغ کے رنگ میں کہنے والا ان سے بہتر نہیں ہے"۔رساؔ کی شاعری پر مولانا کا تبصرہ ہے کہ "داغ کے ان چند قدیم اور سربرآوردہ شاگردوں میں ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کو استاد کی شاعری کے ساتھ یہاں تک ہم رنگ کر دیا ہے کہ ایک کو دوسرے سے تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

تعزیتی نوٹ: احسان رام پوری، احسان شاہ جہاں پوری، ہجرت شاہ جہاں پوری، رئیس اکبر آبادی، کیف اور عظمت اللہ خاں برق کے انتقال کی اطلاع اور اظہار افسوس۔

انتخاب کلام: شاگردان مصحفی: اسیر لکھنوی، محمد عیسیٰ تنہا اور کرامت علی خاں شہیدی کے دواوین کا انتخاب۔

تازہ کلام: غزل حسرت موہانی

تذکرۃ الشعرا، حصہ اوّل، جزو دوم، اشاعت، اکتوبر ۱۹۱۴ء

تذکرۃ الشعرا: محمد امان نثار شاگرد شاہ حاتم۔ نہایت مختصر تعارف ہے البتہ ایک اہم اطلاع یہ ہے کہ "کمال مانک پوری شاگرد قائم چاند پوری نے ایک تذکرہ اور ایک نایاب انتخاب دواوین اساتذہ کا مرتب کیا تھا۔ حسن اتفاق سے راقم حروف کو یہ مجموعہ حضرت عرش ملیح آبادی کے ذریعے سے دستیاب ہو گیا اس میں بعض ایسے شاعروں کا کلام موجود ہے جن کی نسبت خیال تھا کہ ان کا دیوان دنیا سے ناپید ہو گیا ہوگا۔ منجملہ ان کے ایک نثار کا دیوان ہے جس کا انتخاب ۲۶ صفحوں میں آیا ہے۔ اس میں غزلیات، رباعیات، قطعات ہیں"۔

بقا اللہ خاں بقا شاگرد شاہ حاتم (۱۱۴۵ھ تا ۱۲۰۶ھ) مولانا نے ان کے حالات مرزا علی لطف، مصحفی اور منشی کریم الدین کے تذکروں کے حوالوں سے لکھے ہیں جو بہت مختصر ہیں۔

مرزا محمد تقی مائل دہلوی شاگرد قائم چاند پوری، ان کا حال نصف صفحے سے زائد نہیں ہے۔

انتخاب دواوین: مخمور لکھنوی، عیش، آتش، غافل شاگردان مصحفی کے دواوین کے انتخاب۔

تازہ کلام: غزل از حسرت موہانی، غزل از اسیر بدایونی

تذکرۃ الشعرا، حصہ اوّل، جزو سوم: اشاعت، جنوری ۱۹۱۵ء

مضمون: غزل گوئی اور اس کے شرائط از امداد امام اثر

انتخاب دواوین: مومن خان مومن۔ حسرت موہانی کے دواوین کے انتخاب

تعزیت: شبلی، حالی، اور منشی سجاد حسین (ایڈیٹر اخبار اودھ پنچ)

تذکرۃ الشعرا حصہ اوّل جزو چہارم: اشاعت اپریل ۱۹۱۵ء

تذکرۃ الشعرا، شبلی نعمانی: علاوہ شبلی کے انتقال کے بعد حسرت موہانی نے تذکرۃ الشعرا حصہ اول جزو چہارم میں ان کے بارے میں تین مضامین شائع کیے۔ ایک مولوی حبیب الرحمٰن شروانی کا لکھا ہوا ہے (ص ۱ تا ۱۱) دوسرا "دیوان شبلی" از مولوی عبدالسلام ندوی (ص ۱۱ تا ۱۹) یہ رسالہ اردوئے معلّٰی ۱۹۰۶ء سے ماخوذ ہے۔ تیسرا مضمون حسرت موہانی کا ہے (ص ۱۲ تا ۱۵) اس کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں علامہ شبلی کے فارسی کلام "دستۂ گل و بوئے گل" پر تبصرہ ہے۔ دوسرا حصہ اردو شاعری کے حوالے سے

متعلق ہے۔سوانحی عنصر بالکل نہیں ہے۔علامہ کے بارے میں حسرت موہانی کا تبصرہ ہے:

''علامہ شبلی کے نتائج افکار زیادہ تر فارسی زبان میں ہیں۔آخر عمر میں سیاسی اور اخلاقی بحث پر ان کے چند اردو قطعات نقاد، کشاف اور اوصاف کے نام سے الہلال میں چھپے ہیں ان سے اردو ادب کی کتاب میں گویا ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا ہے۔ پختگی کلام، برجستگی مضمون، آزاد خیالی، ندرت بیان اور نوطرز سخن غرضیکہ ہر حیثیت سے یہ قطعی اپنا آپ جواب ہیں۔کچھ عجب نہیں کہ غالب کے اردو کلام کی مانند رفتہ رفتہ شبلی کی بھی اردو شاعری ان کی فارسی شاعری پر غالب آ جائے۔مولانا نے ایک جملہ میں نہ صرف کلام کی خصوصیات سمیٹ لی ہیں بلکہ اس کے شان نزول کے حوالے سے کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ گئے ہیں۔فرمایا:

''خوبی محاورات وستواری کلام کے علاوہ اشعار درد و تاثیر کی خوبیوں سے مالا مال ہیں۔علامہ شبلی انکار کیے جائیں لیکن ہم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس شیوہ دل پذیر کو وہ ''تہمت دوستاں'' سے تعبیر کرتے ہیں اس سے ان کی شاعرانہ طبیعت یقیناً بہرہ وافر رکھتی ہے۔

انتخاب دواوین: دیوان مومن۔دیوان نسیم۔دیوان تسلیم۔

تذکرۃ الشعرا حصہ اوّل، جز و پنجم۔اشاعت یکم جولائی ۱۹۱۵ء

تذکرۃ الشعرا: (۱) حالی، مولانا الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء) کے حالات زندگی اور صفات شاعری پر یہ ایک بھرپور مضمون ہے جو صفحات ۳ تا ۲۰ پر پھیلا ہوا ہے۔مولانا حسرت، حالی کے مداحوں میں تھے ان کی شاعری اور نثر نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ہر پہلو کو اجاگر کیا ہے۔ذاتی صفات کے بیان میں صحیح واقعات بھی درج کیے ہیں تا کہ تحریر با اثر ہو جائے۔ان کی تصانیف کا بھی تفصیلی حال ہے کوئی ایسی تصنیف نہیں ہے جس کے بارے میں اس مضمون میں ذکر نہ ہو۔

(۲) سجاد حسین (۱۸۵۵ء۔۱۹۱۵ء) منشی سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ اپنے اخبار اور اس کے طرز خاص طنز و مزاح کے لیے مشہور ہیں۔ان کے سیاسی خیالات مولانا حسرت کے خیالات سے مختلف نہیں تھے۔بدیسی راج کے خلاف جدوجہد میں انھوں نے مولانا حسرت کی طرح اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔مولانا نے ان کو ایک اصول پسند صحافی کے طور پر پیش کیا اور تعریف کی جس کے وہ ہر طرح مستحق تھے۔

(۳) ثاقب اکبر آبادی (ستمبر ۱۸۹۳ء۔۱۹۱۴ء) ثاقب اکبر آباد سے ایک رسالہ بہ زبان فارسی ''قند پارسی'' نکالا کرتے تھے۔وہ فارسی کے شاعر اور اچھے نثر نگار تھے۔نام ان کا احسن اللہ خاں تھا۔مولانا حسرت سے شخصی روابط تھے اور وہ انھیں مولانا شبلی، عزیز لکھنوی کے برابر فارسی دان شمار کرتے تھے۔شاعری میں محسن کاکوری اور امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔مولانا نے مختصر حالات زندگی بیان کرتے ہوئے ان کے علم و فضل کی تعریف کی ہے اور تصانیف و تالیفات میں دیوان فارسی، مجموعہ نثر فارسی، مجموعہ نظم ریختہ، شرح حسن و عشق اور مکتوبات امیر مینائی بتلائے ہیں۔

(۴) مست بنارسی (۱۸۷۶ء۔۱۹۱۴ء) سید عبدالمجید مست بنارسی صوبہ بہار کے رہنے والے تھے۔پیشے کے اعتبار

سے وکیل تھے۔ شاعری میں حفیظ عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی، اور امیر مینائی سے مشورہ سخن کیا تھا۔ صاحب دیوان تھے۔ حالات زندگی مختصراً بیان کرکے بعد ان کے کلام پر یوں تبصرہ کیا:

''مست کا کلام صفائی اور سادگی کے علاوہ تازگی مضامین، جدت خیال اور تاثیر بیان کے لحاظ سے بھی قدر دانی اور ستائش کا سزاوار ہے۔'' (ص ۴۵)

انتخاب دواوین: اشکی، حالی، بےنظیر، مست بنارسی، مضطر خیر آبادی

تذکرۃ الشعرا: حصہ دوم، جز واوّل

تذکرۃ الشعرا: غالب

غالب کے حالات زندگی نہایت تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ ان کی جملہ دس تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے فارسی اور اردو شاعری پر تفصیلی حاصل تبصرہ کیا ہے۔ غالب کے شاگردوں میں معروف شعرا کے علاوہ کم معروف کا حال بھی ہے۔ حسرت موہانی کے مضامین کی اہم خصوصیت ان کے تبصرے میں ہر بڑے شاعر کے کلام کا بغور مطالعہ کرکے اس کا انتخاب تیار کرنا اور شاعرانہ صفات کی نشان دہی کرنا ان کا وصف خاص ہے۔ اس خصوص میں انھوں نے ہم عصر شاعروں کے کلام کا موازنہ بھی کیا ہے۔ ذوق، مومن اور غالب کا موازنہ ایک سے زائد مضامین میں ملتا ہے۔

غالب کے بارے میں حسرت کے اس کتاب میں شامل بیان کے علاوہ بھی ان کی مزید تحریریں ملتی ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں انجمن اردوئے معلّٰی علی گڑھ کی نشستوں میں وہ غالب کے اشعار کی شرح بیان کیا کرتے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے باقاعدہ شرح مرتب کی اور ''دیوان غالب مع شرح'' کے نام سے شائع کی تھی۔ اس کے مقدمے میں بھی غالب کے خصوصیات کلام کا جائزہ لیا ہے۔ ایک مضمون ''کلام غالب'' کے عنوان سے رسالہ اردوئے معلّٰی، نومبر ۱۹۰۳ء (ص ۱۳ تا ۲۴) پر چھپ چکا تھا۔ غرض حسرت، غالب کے سچے مداح تھے اور اپنی تحریروں کے ذریعے سے غالب شناسی کے مرتبہ اولی پر نظر آتے ہیں۔

انتخاب دواوین: راسخ، میر حسن، درد، اثر، افسوس

تذکرۃ الشعرا: حصہ دوم، جز و دوم

تذکرۃ الشعرا: گستاخ رامپوری

کرامت علی خاں گستاخ رامپوری علی گڑھ کالج میں حسرت سے سینئر تھے۔ وہ حسرت کے دوستوں کے حلقے میں شامل تھے۔ تحصیل علم کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی۔ مختلف شہروں میں جیلر رہے۔ بے حد متضاد صفات کے مالک تھے اردو شاعری میں شوخی حد سے سوا ہے جس کی حدیں فحش نگاری سے ملتی ہیں۔ عملاً وہ بدراہ نہ تھے۔ کہا جاتا ہے ۱۹۰۲ء میں حسرت موہانی نے علی گڑھ میں شاندار مشاعرہ کا انعقاد کیا تھا۔ اس میں گستاخ کے اشعار کے پیش کیے گئے اشعار کو بنیاد بنا کر پرنسپل سے شکایت کی

گئی تھی کہ مشاعرہ میں اخلاق سے گرے اشعار پڑھ کر کالج کی نیک نامی کو متاثر کیا گیا تھا۔حالات گستاخ کے بعد طویل انتخاب اشعار کا درج ہے۔

انتخاب دواوین: ناظم رامپوری، عاشق اورنازش بدایونی

تذکرۃ الشعرا حصہ دوم کے دونوں جز وحسرت موہانی نے مرتب کر کے چھپوا لیے تھے۔انھیں شائع کرنے اور فروخت کرنے کی نوبت نہ آئی تھی کہ وہ اپریل ۱۹۱۶ء کو گرفتار کر لیے گئے۔تذکرۃ الشعرا حصہ اول کی بچی ہوئی کتب اور حصہ دوم کے تمام مطبوعہ نسخے گھر میں ڈھیر کی صورت پڑے رہے۔حسرت نے ۱۹۱۹ء میں رہائی کے بعد حصہ دوم کو شائع کیا مگر اس کی خاطر خواہ پبلسٹی نہ ہو سکی۔

اخبار مستقل (کانپور)

مولانا حسرت موہانی کے رسالے اردوئے معلّٰی تیسرے دور کا آغاز جنوری ۱۹۲۵ء میں ہو چکا تھا جو تقریباً ۱۲ ماہ بند رہنے کے بعد جاری ہوا تھا۔اس کی پہلے جیسی آب و تاب نہ تھی اشاعت خاصی تاخیر سے ہوتی اور تمام غیر سیاسی نگارشات چھپتی تھیں۔یہ بات یقیناً ان کے لیے گھٹن کی باعث تھی کہ سیاسی رہنما ہونے کے باوجود ان کے اپنا کوئی مؤثر ذریعہ اظہار نہیں ہے۔برصغیر جنوبی ایشیا کے حالات تیزی سے تغیر پذیر تھے۔مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کے لیے صحافتی ذرائع سے کام لینے اور گوشے گوشے سے اخبارات شائع کرنے کی ضرورت تھی۔مولانا حسرت نے ساری زندگی بے سروسامانی میں گزاری ان کے پاس نہ اتنی دولت تھی کہ کسی روزنامہ کو حوصلہ کے مطابق چلاتے اور نہ انھیں دولت بٹورنے کے ہتھکنڈوں کو استعمال کرنے کا حوصلہ تھا۔اگر کچھ تھا تو ملک کی آزادی اور مسلمانوں کی مستقبل کی فکر کا سرمایہ اور ان دونوں کے لیے جان نثار کرنے کا جذبہ!

اخبار مستقل کے اجرا کے حوالہ سے بھی اطلاع جو ہمیں ملی وہ دیوان حسرت حصہ یازدہم طبع اول کے ذریعہ تھی۔اس میں ان کی ایک نعتیہ اشعار پر مشتمل غزل تھی جس کا مطلع ہے:

مظہر شان کبریا صلی علیٰ محمد　　آئینہ خدا نما صلی علیٰ محمد

اس کے بارے میں صراحت ہے کہ غزل اخبار مستقل کانپور میں نومبر ۱۹۲۸ء میں چھپی تھی۔اس سے اندازہ ہوا کہ اخبار کا اجرا اواخر ۱۹۲۸ء میں ہوا۔بعد میں محمد حامد علی (مقیم کانپور) کی کتاب ''انتخاب مستقل'' سے توثیق ہوئی کہ اخبار یکم اکتوبر ۱۹۲۸ء سے جاری ہوا تھا۔ہماری نظر سے اخبار کے جو پرچے گزرے ہیں ان کا سائز وہی ہے جو اردوئے معلّٰی کا تھا۔آج کل کی طرح اخبار کا سائز بڑا نہ تھا۔اخبار کے مختلف ادوار اور حالتیں رہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔

روزنامہ اخبار مستقل: جلد اول کا آغاز یکم اکتوبر ۱۹۲۸ء سے ہوا اور اختتام دسمبر ۱۹۲۸ء تک جلد اول رہی۔ جنوری ۱۹۲۹ء سے جلد دوم کا آغاز ہوا اس طرح سال بہ سال جلد بدلتی رہی۔مستقل بطور روزنامہ ۲۶ جون ۱۹۲۹ء تک نکلا، گویا روزنامہ کی عمر صرف نو ماہ رہی۔

ہفت روزہ مستقل: روزنامہ کے ساتھ ساتھ ایک ہفت روزہ مستقل ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء سے جاری کر دیا۔ اسے چاہے روزنامہ کا ہفتہ وار ایڈیشن سمجھیں یا جداگانہ اشاعت! روزنامہ کے جلد اور شمارہ نمبر الگ ہوتے جبکہ ہفت روزہ کے جلد و شمارہ نمبر الگ۔ اس طرح اس کی نوعیت روزنامہ سے الگ ہی سمجھی جا سکتی ہے۔ یہ ہفت روزہ اشاعت ہر منگل کو ہوتی تھی۔ منگل کو دونوں اخبار الگ الگ نکلتے تھے ہفتہ وار مستقل رنگین کاغذ پر چھپتا تھا۔

دو روزہ مستقل: جولائی ۱۹۲۹ء سے اخبار مستقل ہر روز شائع ہونے کے بجائے ہر دوسرے روز چھپنے لگا جب کہ ہفتہ وار اشاعت حسب سابق جاری رہی۔

سہ روزہ اخبار مستقل: اکتوبر ۱۹۲۹ء سے اخبار ہفتہ میں تین دن ہفتہ، پیر اور جمعرات کو شائع ہونے لگا۔ اسی کے ساتھ ہفتہ وار خصوصی اشاعت بند کر دی گئی یہ سلسلہ ۱۰ فروری ۱۹۳۰ء تک جاری رہا۔

ہفت روزہ مستقل: ۱۷ فروری ۱۹۳۰ء سے مستقل ہفت روزہ ہو گیا۔ اس کا سلسلہ آخر دسمبر ۱۹۳۱ء تک جاری رہا۔

ماہانہ مستقل: جنوری ۱۹۳۲ء سے مستقل کو ماہانہ کر دیا گیا اس طرح ہر ماہ اردو معلّٰی ادبی رسالہ کے طور پر اور مستقل سیاسی رسالے کے طور پر چھپنے لگے۔ ۱۹۳۶ء میں دونوں کو ایک ہی کر دیا گیا اور مستقل اردوئے معلّٰی کے ضمیمے کے طور پر چھپتا رہا۔ بالآخر جنوری فروری مارچ ۱۹۴۲ء کے مشترکہ شمارے کے بعد دونوں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔

اردو کی سیاسی صحافت میں اخبار مستقل کو اہم مقام حاصل نہ ہوا۔ اس کی بنیادی وجہ اس کی اشاعت میں تسلسل کا نہ ہونا ہے۔ ویسے بھی سرمایہ کی کمی ہی نہیں مولانا کے مزاج کی وجہ سے اس میں وہ آب و تاب نہ پیدا ہو سکی جو عام نگاہوں کو خیرہ کرتیں اور شہرت کی وجہ بنتی۔ اخبار مولانا کے لیے کاروبار نہ تھا مشن تھا۔ ان کی تحریر میں وہی جوش، جذبہ حوصلہ اور ولولہ ملتا ہے جو ان کی تقریروں میں پایا جاتا ہے۔ سب سے بڑی بات "سچائی" ہے۔ مولانا نے سیاست میں جھوٹ فریب اور دھوکے کی آمیزش نہیں کی۔ پہلے تو بات صرف آمیزش تک کی تھی جو ترقی کر کے سیاست انہیں خصوصیات کا دوسرا نام قرار پایا ہے۔ وہ سچے آدمی تھے، کھری بات کرتے، چاہے انگریز سرکار کی طاقت و ثروت کا مقابلہ ہو یا کانگریس کی شعبدہ بازی کا وہ دونوں کی حقیقت کو اجاگر کرنے میں پس وپیش نہیں کرتے تھے۔ اخبار مستقل میں خبریں مقامی، قومی اور بین الاقوامی بھی ہوتیں ان میں اصل اہمیت اداریوں یا مضامین کی ہوتی تھی جو خود مولانا حسرت کی فکر اور مسلک کی غماز سچائی اور جوش سے لبریز ہوتیں۔ اگر اس دور کی مسلم سیاست کی دھڑکتی نبض پر ہاتھ رکھنے کا ارادہ ہو تو اخبار مستقل کے اداریے اور مضامین پڑھیے۔ تاریخ کی کتابوں میں مصلحتوں کی آمیزش سے واقعات کی جو جگالی کی جاتی ہے وہ یہاں نہیں ملے گی۔ یہاں کا مالی کھرا ہے اس میں لکھنے والے کی ذات کی پسند اور رغبت کو دخل نہیں ہے۔ مولانا حسرت ایک تجربہ کار سیاست دان تھے، انھوں نے اس میدان میں جو عمر کے دیکھے ان سے سبق حاصل کیا اور اپنے تجزیے سے نیتوں کی صداقت معلوم کرنے کی کوشش کی۔

تاریخ شاہد ہے کہ خلافت اور عدم تعاون کی تحریکات (۱۹۱۹ء۔ ۱۹۲۱ء) کے دوران برصغیر جنت نظیر بن گیا تھا۔ ہندو مسلم

اتحاد میں سارے امتیازات اور اختلافات ختم کر دیے تھے اس دیس کے رہنے والے باہم شیر و شکر ہو گئے تھے۔ سورج نے پکا تکت کے وہ مناظر دیکھے جو اس سے قبل کبھی نظر نہ آئے تھے۔ ان تحریکات سے ایوان اقتدار کے بام و در کانپ رہے تھے۔ حکومت برطانیہ کی ساری طاقت ہند کے وسائل کی رہین منت تھی۔ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء) میں اپنی پوری فوجی طاقت جھونک دینے کے بعد اسے کامیابی تو ملی تھی لیکن وہ مغلوب طاقت کی طرح مضمحل تھی۔ اسے ایک دھکے کی ضرورت تھی کہ ساری شان و شوکت زمین بوس ہو جاتی۔ ایک بار ہند اس کو سہارا دینے سے انکار کرتا تو اس کے لیے جزیرہ برطانیہ کے سوا کہیں پناہ نہ ملتی۔ ایسے سنہری موقع پر مولانا حسرت موہانی نے خلافت، مسلم لیگ اور کانگریس کے پلیٹ فارموں سے قرارداد آزادی منظور کرنے کا مطالبہ کیا اپنے مسلم لیگ اجلاس کے خطبہ صدارت میں یکم جنوری ۱۹۲۲ء سے خودمختاری کا اعلان کر دینے کی درخواست کی تو زمین و آسمان آزادی کے نعروں سے گونج اٹھے۔ انگریزوں کے ایوان اقتدار کی اینٹ سے اینٹ بجتی دکھائی دینے لگی تب کوئی اور نہیں بلکہ آزادی کے سب سے بڑے چیمپئن گاندھی جی نے مولانا کی مخالفت کر کے بازی کا رخ بدل دیا۔ گاندھی کی آزادی کی مخالفت نے مولانا حسرت سے تاریخی فتح چھین لی اور پھر ۱۹۲۲ء سے ہندو مسلم فسادات کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو شدھی تحریک، 'سنگھٹن' کا مرہون منت تھا کہ وقت کے ساتھ ساتھ تاریخی اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ گاندھی کا استدلال تھا کہ ۱۹۲۱ء میں ہندو مسلم اتحاد درجہ کمال کو نہیں پہنچا ہے۔ اجتماعی طاقت حاصل نہیں ہوئی ہے اس لیے آزادی کی بات کرنا قبل از وقت ہے۔ اور جب ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی مہم کامیاب ہوئی تو ایسی ہی قرارداد گاندھی جی نے لاہور کے کانگریس اجلاس ۱۹۲۹ء میں پیش کر کے منظور کروائی۔ مولانا حسرت کی نظر میں ان جیسے واقعات کی وجہ سے گاندھی جی کا کردار مشکوک رہا۔ وہ تو مقبولیت کے اس آسمان کو چھو رہے تھے کہ جن پر انگلی اٹھانے والے کا وجود خطرہ میں پڑ جاتا۔ ایسے میں مولانا حسرت ہی تھے جنھوں نے واضح الفاظ میں گاندھیائی سیاست کا پردہ فاش کیا۔ اس سلسلے میں اخبار مستقل کے دو اداریے لائق مطالعہ ہیں جو تاریخ کے طالب علموں کو ازبر ہونے چاہیے۔ گاندھی جی کی آزادی کی قرارداد (۱۹۲۹ء) کے بارے میں لکھا تھا:

"خرابی بسیار کے بعد آخر کار مہاتما گاندھی کی جانب سے آزادی کامل کی تجویز لاہور کانگریس میں پیش ہو کر پاس ہو گئی۔ تعجب ہے کہ ایک ایسی قرارداد کے منظور ہونے پر نہ حکومت کی جانب سے کسی اندیشہ و اضطراب کا اظہار ہوتا ہے نہ جمہور کی طرف سے کسی جوش و خروش یا عزم بالجزم کا اعلان۔

ہمارے نزدیک اس کے دو اسباب ہیں۔ اول یہ کہ یہ اعلان آزادی اتنی دیر اور اتنی لیت و لعل کے بعد کیا گیا کہ اس کے متعلق عوام الناس کا جوش و خروش مسلسل ناکامیوں کی بنا پر پہلے ہی سرد ہو چکا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس تجویز کو جامہ عمل پہنانے کے لیے جو تدبیریں سوچی گئی ہیں وہ سرتاسر ناکافی اور ناقابل عمل ہیں۔

خیال کرنے کی بات ہے جب عدم تعاون کے پورے پروگرام پر عمل کر کے جس میں عدالتوں اور اسکولوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا ہندو اور مسلمین کی متحدہ کوشش ۲۱ء، ۲۲ء میں آزادی ناقص بھی حاصل نہ کر سکی تو صرف کونسلوں کے بائیکاٹ اور کھدر پوشی

کے ذریعہ آزادی کامل کے حصول کی کہاں تک توقع کی جاسکتی ہے۔اور وہ بھی ایسی حالت میں کہ من حیث القوم مسلمان کانگریس سے علیحدہ ہیں اور ہندوؤں کا ایک گروہ اس سے عملی طور پر جدا ہو کر اپنی ایک نئی پارٹی اور نیا پروگرام بنا چکا ہے۔بعض لوگ تو مہاتما گاندھی سے یہاں تک بدگمان ہیں کہ ان کے نزدیک کانگریس کی ان دو مختلف پارٹیوں کی کشمکش جنگ زرگری کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔لوگ اس بدگمانی میں حق بجانب ہوں یا نہیں اتنا تو ہم کو بھی شبہ ہوتا ہے کہ آزادی کامل کے ایک سخت ترین دشمن کی جانب سے مکمل آزادی کی حمایت میں ضرور کوئی راز ہے۔''(کانگریس اور آزادی کامل:اخبار مستقل جنوری ۱۹۳۰ء)

گاندھی شناسی کے معاملے میں مولانا حسرت موہانی سے بڑھ کر کسی کا مقام نہیں۔وہ گاندھی جی کے افکار اور اعمال کا خوبی سے تجزیہ کرتے اور جو پروپیگنڈا ان کی حمایت میں ہوتا اس کو بے اثر کرنے کی کوشش کرتے۔گاندھی کی شخصیت کے بارے میں مولانا حسرت کا خیال تھا کہ وہ صرف چونکا دینے والی بات کرنے کے عادی تھے اور نہایت مہارت سے ایسے بیان دیتے کہ جن کا مطلب متضاد ہوتا۔اس کی تشریح میں انھوں نے لکھا:

''جین مت کے دو بنیادی اصولوں یعنی اہنسا اور سیادواد میں اہنسا یعنی کسی کی جان نہ لینے کا اصول عام طور پر مہاتما گاندھی کے عمل کی بدولت قریب ہر ہندوستانی کی سمجھ میں آ گیا ہے۔البتہ دوسرا اصول سیادواد جس کا مفہوم یہ ہے کہ بیک وقت کسی بات کے متعلق ہاں اور نہیں دونوں کا استعمال جائز رکھنا اس وقت تک معروف و مشہور نہیں ہوا ہے حالانکہ مہاتما گاندھی اس اصول کے بھی ہمیشہ سے نہایت سختی کے ساتھ پابندی کرتے چلے آتے ہیں۔ہاں اور نہیں یا اقرار و انکار کے درمیان کا راستہ جبر و اختیار یا بین بین مسلک کی طرح باریک اور عوام الناس کی دریافت سے بالاتر ہے اگر مہاتما گاندھی کے سیاسی کارناموں کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت تک ان کی کوئی کارروائی ایسی نہیں ہے جو سیادواد کو پیش نظر رکھ کر نہ کی گئی ہو۔''

(اخبار مستقل:۹فروری ۱۹۳۰ء)

مولانا حسرت موہانی اور مسلمانوں کی سیاست کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ کانگریس ہندو اکثریت کے زور پر سیاست کی اجارہ داری نہ کرے اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلے۔اسی مقصد کے تحت مسلمان قائدین مولانا محمد علی،مولانا حسرت موہانی اور مسٹر جناح کی کوششوں سے ۱۹۱۵ء میں میثاق لکھنو طے پایا تھا جو چند سال باقی رہا اور ۱۹۲۲ء میں داستان پارینہ بن گیا۔ ۱۹۳۰ء کی دہائی شروع ہوتے ہوتے تحریک آزادی نے زور پکڑ لیا کانگریس اور لیگ نے کامل آزادی کی قرارداد بھی منظور کر لی۔مسلمانوں کی سیاست ایک طرف انگریزوں سے برسر پیکار تھی تو دوسری طرف کانگریس سے مفاہمت کے لیے تقاضہ کر رہی تھی کہ مسلمانوں کے جان و مال اور حقوق کی قانونی یقین ضمانت فراہم کر کے مسلمانوں کو کانگریس کی جدوجہد کا حصہ بنا لے۔یہ مطالبات مسلم لیگ جمعیۃ العلمائے ہند اور تمام دیگر سیاسی جماعتوں کے تھے۔کانگریس اپنے محفوظ قلعہ میں مسلمانوں کو دراندازہونے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھی۔تاریخ کے کسی دور کا مطالعہ کر لیں تحریک عدم تعاون کے بعد کانگریس نے جو بھی اقدامات کیے ان میں مسلمانوں کی شرکت کو یقینی بنانے کی کبھی سعی نہیں کی۔ ۱۹۳۰ء میں شروع ہونے والی تحریک ستیہ گرہ کا اعلان کرتے ہوئے نہ تو مسلمانوں کی کسی سیاسی

جماعت کو شریک کار ہونے کی دعوت دی گئی اور نہ مسلمانوں کو بحیثیت قوم دست تعاون بڑھانے کو کہا۔ کانگریس کی مسلمانوں کو نظرانداز کرنے کی پالیسی تھی جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو کانگریس کی سیاست سے ہٹ کر سیاست کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ اخبار مستقل کے ایک اداریے سے مسلمانوں کی سوچ میں اس تبدیلی کی نشان دہی ہوتی ہے۔ ستیہ گرہ یا سول نافرمانی کی جو تحریک کانگریس نے ۱۹۳۰ء میں شروع کی تھی اس میں مسلمانوں نے اس طرح فعال کردار ادا نہیں کیا جس طرح تحریک عدم تعاون میں کیا تھا۔ ستیہ گری کے حوالہ سے مسلمانوں کے خیالات کی ترجمانی اخبار مستقل میں اس طرح ملتی ہے:

''آزادی ہند کی جو تحریک ہندوستان کے تمام بڑے شہروں کی طرح کانپور میں بھی بخوبی جاری ہو چکی ہے۔ اس میں چند قابل احترام مستثنیات کے سوا اس وقت تک مسلمانان کانپور نے من حیث القوم کوئی حصہ نہیں لیا ہے۔ ہم نے بھی تامل کیا اور کیوں نہ کرتے جب کہ ہم خود اس بات کو محسوس کرتے رہے اور اب بھی کرتے ہیں کہ ہنود کانپور نے جمہور مسلمین کے ساتھ مفاہمت یا مصالحت کی نہ کبھی کوشش کی نہ اس کی ضرورت کبھی سمجھی۔ ظاہر ہے کہ اسی حالت میں اگر مسلمانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تو کچھ بے جا نہیں ہوا کہ برادران وطن کو بظاہر ہماری پروا ہے نہ ضرورت۔ تو پھر خواہ مخواہ قید و بند یا زحمت و کشمکش کے جھگڑوں میں پڑنے کے بجائے ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ اس تحریک سے علیحدہ اور غیر جانب داروں کی طرح سے تماشائی بنے رہیں۔''

اس صورت حال میں مولانا نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ:

''تحریک سول نافرمانی کی تمام کارروائی جس سے خلاف ورزی قوانین اور قید و بند کی زحمت کش لازم آتی ہو مسلمان بطور احتجاج کوئی عملی حصہ نہ لیں مگر اس کی مخالفت بھی نہ کریں۔'' (اخبار مستقل: ۶ مئی ۱۹۳۰ء)

ان تحریروں سے مولانا کے جذبات کی ترجمانی نہیں ہوتی بلکہ یہ پوری قوم کے دلوں میں پائے جانے والے کرب کا اظہار معلوم ہوتی ہیں۔ یہ تاریخ کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ چھوٹا بھائی اپنے حقوق کی ضمانت مانگے تا کہ وہ جدوجہد آزادی میں یکسوئی کے ساتھ بڑے بھائی کا ساتھ دے مگر بڑے بھائی کے سربڑے ہونے کا جنون سمایا ہوا ہو اور وہ چھوٹے کی محبت کو سینے سے لگانے کے لیے تیار نہ ہو، یہ معاملہ ایک دن، دو دن کا نہیں دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ظرف کی خدمت میں سلام پیش کیے جو مایوسی کی آخری سرحد تک بڑے بھائی کا دامن چھوڑنے کو تیار نہ ہو۔

یہ مسئلہ کسی جماعت کا نہیں، مسلم لیگ کو برا کہا گیا، انگریزوں کے ایجنٹ ہونے کی تہمت لگائی گئی۔ اسے چھوڑیے۔ جمعیۃ العلما کے ساتھ کانگریس نے کیا سلوک کیا۔ مسلمانوں کے حقوق کی تحفظ کی بات اس نے کی اور کانگریس کے ساتھ وفادار رہنے کا بار بار عہد کیا۔ اس کے مطالبہ پر شنوائی نہ ہوئی۔ ماننا تو درکنار ان پر غور کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ مولانا حسرت، گاندھی جی اور ان جیسے لیڈروں کے ہم نوا اور حامی نہ ہونے کے باوجود جدوجہد آزادی میں کانگریس کی رہنمائی کے طالب رہے۔ وہ تو قدم قدم پر جان نثار کرنے کا جذبہ رکھتے تھے۔ سامراج سرکار کا ظلم و ستم ان کے لیے بچوں کے کھیل سے زیادہ اہم نہ تھا۔ وہ ہر موقع پر حکومت مخالف مہم میں پیش پیش رہتے تھے۔ ان کے جذبات کو کیسی ٹھیس لگی ہوگی کہ کانگریس ملک گیر سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کرے اور

مولانا اس تحریک کی ضرورت کو مانتے ہوئے بھی اس میں شامل ہونے سے انکار کر دیں اور پوری قوم کو اس تحریک سے دور ہی رہنے کی صلاح دیں۔

کانگریس کے رویے کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں نے ۱۹۳۰ء کی دہائی کے شروع ہوتے ہوئے جو فیصلہ کر لیا تھا اور جس کا اظہار جہاں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ہوتا رہا وہیں مولانا حسرت نے اخبار مستقل میں شائع ہونے والی تحریروں سے ہوا۔ ذیل میں ہم ''مقالات حسرت مرتبہ اشتیاق اظہر، کراچی، ۱۹۸۵ء کے حوالہ سے درج کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ مقالات حسرت دراصل اخبار مستقل کے منتخب اداریوں پر مشتمل ہے۔

''مسلمانوں کا صحیح مسلک یہ ہونا چاہیے کہ وہ آزادی کامل کی پوری اور دل سے تائید کرتے رہیں۔ وہیں مسلم حقوق کے تحفظ کو بھی کسی حالت میں نظر انداز نہ کریں۔'' (مقالات حسرت: ص ۳۴)

''جب تک اقوام ہند کے درمیان حقوق کا معاملہ باہمی رضامندی کے ساتھ طے نہ ہو جائے گا اس وقت تک کانگریس کے اعلان آزادی کامل سے بھی مسلمانوں کے دل سے بدگمانی دور نہ ہوگی۔'' (ایضاً: ص ۳۴)

''اب اگر مسلمان من حیث القوم کانگریس کی تحریک میں شرکت سے بیشتر کانگریسی لیڈروں سے اپنے حقوق کے متعلق کامل اطمینان چاہتے ہیں تو کوئی انصاف پسند انہیں مورد الزام قرار نہیں دے سکتا۔'' (ایضاً، ص ۳۷)

''جب زعمائے اسلام مہاتما گاندھی یا پنڈت موتی لال نہرو کے اس وعدہ پر کہ آئندہ ایسا کوئی دستور اساسی منظور نہ کیا جائے گا جس سے اقلیتوں کا پورا پورا اطمینان نہ ہو گیا اعتبار نہیں کرتے اور جب تک تفصیلی سمجھوتہ نہ ہو جائے اس وقت تک کانگریس کی ہر تحریک سے علیحدہ رہنا چاہیے۔ (ایضاً، ص ۷۶)

''ہم ایک بار پھر مسلمانوں کو یاد دلاتے ہیں کہ ان کے صحیح سیاسی مسلک کا خلاصہ مندرجہ ذیل دو فقروں میں آج سے بہت پہلے طے ہو چکا ہے: تحفظ حقوق مسلمین + حصول آزادی کامل۔ (ایضاً، ص ۸۲)

یہ وقت کی آواز تھی جو کانگریسیوں کو سنائی نہ دی جس کا منطقی نتیجہ قرارداد پاکستان کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اخبار مستقل کے صفحات اس دور کے قومی اور بین الاقوامی سیاسی معاملات اور ان کے بارے میں مولانا حسرت کی دوٹوک رائے کے حامل ہیں۔

اخبار مستقل کے شمارے نایاب ہیں پھر بھی دستیاب شماروں کی مدد سے محمد حامد علی نے ان کے اداریوں کو ''اخبار مستقل'' کے نام سے ساہتیہ اکیڈمی لکھنو کے ذریعہ ۱۹۸۳ء میں اور اشتیاق اظہر نے حسرت میموریل سوسائٹی کراچی کے ذریعہ ۱۹۸۵ء میں شائع کروائے ہیں۔

مولانا ظفر علی خان کی غیر مدوّن تحریریں

پروفیسر محمد حنیف شاہد

انجمن حمایت اسلام لاہور کا اکیاونواں (۵۱) سالانہ اجلاس ۱۰ تا ۱۲/اپریل ۱۹۳۶ء اسلامیہ کالج لاہور کی وسیع گراؤنڈ میں منعقد ہوا۔ دفتر انجمن کے عقب میں ایک عظیم الشان پنڈال تیار کیا گیا تھا جس کے چاروں طرف خوش نما اسلامی اور اخلاقی قطعات آویزاں تھے۔ اس اجلاس کی یہ خصوصیت تھی کہ علامہ ابوالنصر سید مبشر طرازی رکن دارالتحریر شاہی وعضو افتخاری انجمن ادبی کابل دولت خداداد افغانستان، محسن اردو ادیب جلیل بابائے اردو مولوی عبدالحق ناظم انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن اور شاعر اسلام حضرت علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبالؒ صدر انجمن نے برسوں کے بعد اپنی ایک تازہ اور غیر مطبوعہ نظم سے حاضرین جلسہ کو محظوظ و مستفید ہونے کا شرف عطا فرمایا۔ پہلا اجلاس ۱۰/اپریل ۱۹۳۶ء کو بروز جمعۃ المبارک بہادر شیخ انعام علی وائس پریزیڈنٹ انجمن سہ پہر انعقاد پذیر ہوا جبکہ دوسرا اجلاس نواب نثار علی خان قزلباش رئیس اعظم لاہور کے زیر صدارت ساڑھے آٹھ بجے تا ساڑھے دس بجے رات منعقد ہوا۔ ۱۱/اپریل ۱۹۳۶ء بروز شنبہ پہلا اجلاس (زنانہ نشست) ساڑھے آٹھ بجے سے لے کر ساڑھے گیارہ بجے تک مولانا ظفر علی خاں چیف ایڈیٹر و مالک روزنامہ زمیندار لاہور کی زیر صدارت انعقاد پذیر ہوا۔ اس اجلاس میں مولانا موصوف نے ایک نظم بھی پیش کی (جو درج ہے) اس کے علاوہ آپ نے صدارتی تقریر فرمائی جبکہ دوسرا اجلاس جسٹس سید آغا حیدر جج پنجاب ہائیکورٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ۱۲/اپریل ۱۹۳۶ء بروز یک شنبہ پہلا اجلاس نواب محمد شاہنواز ممدوٹ کی صدارت میں منعقد ہوا جبکہ دوسرا اجلاس ساڑھے چار بجے سہ پہر تا سات بجے شام (اردو نشست) مولانا عبدالحق ناظم انجمن ترقی اردو حیدرآباد دکن کی صدارت میں انعقاد پذیر ہوا۔ تیسرا اجلاس ساڑھے آٹھ بجے رات سے لے کر ساڑھے دس بجے رات تک شیخ امیر علی سیشن جج و سینئر وائس پریزیڈنٹ انجمن انعقاد پذیر ہوا جن قابل ذکر اور تاریخی شخصیات نے اجلاس میں شرکت کی اور حاضرین سے خطاب فرمایا۔ ان میں سید منصور علی چشتی، مولانا شاہ عزیز الدین، علامہ عبداللہ یوسف علی، مولانا احمد علی، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، ڈاکٹر ہادی حسن، مولانا آزاد صمدانی، حضرت نواب سراج الدین احمد خاں سائل دہلوی، مولانا ثناءاللہ امرتسری، میاں بشیر احمد، خواجہ دل محمد، مولانا غلام مرشد، ڈاکٹر نظام الدین، ملک برکت علی شامل ہیں۔ مولانا ظفر علی خان نے زیر نظر اجلاس میں دو تقاریر اور ایک نظم پیش کیں جو ہدیہ قارئین کی جارہی ہیں۔

مولانا ظفر علی خان صاحب کی تقریر

اس کے بعد مولانا ظفر علی خاں صاحب نے جناب مقرر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے حسب ذیل مفید و معرکہ آرا تقریر فرمائی۔

حضرات!

ہمارے بہت سے کام روپے کی قلت کے باعث رکے پڑے ہیں حالانکہ اگر ہم ہمت و مستعدی سے کام لیں تو بے شمار روپیہ فراہم ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں ہمارے اس قدر اوقاف ہیں کہ اگر ہم انھیں منظم کر لیں تو کروڑوں روپوں کی آمدنی ہونے لگے۔ مثلاً جامع مسجد بمبئی ایسا وقف ہے جس سے ایک کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے اور بھی ایسی مسجدیں ہیں جن سے کروڑوں کی آمدنی ہے۔ افسوس ہے کہ متولیوں سے اوقاف کی آمدنی کا کوئی حساب نہیں لیا جاتا۔ متولی اسی روپے سے ڈپٹی کمشنروں کو پارٹیاں دیتے ہیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہمیں کمال تن دہی سے کوشش کرنی چاہیے کہ یہ ضبط و نظم مکمل ہو جائے تو آئے دن کے چندوں سے نجات مل جائے۔ بار بار کاسۂ گدائی لے کر پھرنا نہ پڑے۔ اسی آمدنی سے سارے کاروبار چل سکتے ہیں۔

ہم ہندوؤں کو بنئے سمجھتے ہیں لیکن ان کے کام پر نظر ڈالو۔ مالوی جی کی یونیورسٹی کو دیکھو۔ اس کے لیے دو دو لاکھ روپیہ چندہ دینے والے مخیّر لوگ موجود ہیں جب تک ہم میں ایک عام بیداری پیدا نہ ہو جائے کام نہیں چل سکتا ہے۔ اس کے لیے دو سال صرف ہو جائیں یا چار سال بہر حال کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ اسی اصول پر عمل کرنا چاہیے جو حضرت سلطان ٹیپوؒ کے پیش نظر تھا۔ اقبال نے حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ کے متعلق کہا ہے:

ترکش ما را خدنگ آخریں

اس پر غور کیجیے۔ ذرے ذرے کے اندر حقیقت کے ایسے آفتاب چھپے ہوئے ہیں جو آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دیتے ہیں۔ مجلس اتحاد ملت قائم ہو گئی ہے۔ اس کے ارکان محلے کی مسجد سے اٹھیں گے۔ ان کا کام ہو گا کہ محلے کی مردم شماری کریں۔ بوڑھے بچے اور صاحب نصاب اس میں آجائیں گے۔ اسلام کا پانچواں رکن ہے زکوٰۃ۔ یہ بہت بڑا رکن ہے۔ مسلمان حلال کی روٹی کمانا اور کھانا چاہتے ہیں۔ سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ حاکم کے روبرو کلمہ حق کہہ دیا جائے دابنا ہاتھ دوست کے لیے بنایا گیا تھا۔ آج وہ کٹا ہوا ہے۔ ننانوے فیصدی مقطوع الاعضا ہیں، وہ مسلمان نہیں ملتے جو نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج پر پوری طرح عامل ہوں۔ ہمیں زکوٰۃ کے متعلق تنظیم کرنا ہے۔ یہ دیکھنا ہے کہ کتنے بے کار ہیں اور کتنے باکار۔ جتنے سرکاری ملازم ہیں ان سب پر ایک ٹیکس لگا دیا جائے۔ ایک آنہ مہینہ، ہماری جماعت یہ خدمت انجام دے گی کہ صبح اٹھے گی الصلوٰۃ خیر من النوم پکار کر مسلمانوں کو مسجد میں لے جائے گی۔ پھر اس محلے میں کوئی بے لکھا پڑھا نہیں رہے گا۔ مسجد میں تعلیم دی جائے گی۔ پھر یہی جگہ مکتب شبینہ کا مرکز ہو گی اور بتلایا جائے گا کہ نوکریاں نہیں مل سکتیں تو آؤ، تجارت اور صنعت و حرفت کی طرف آؤ۔ سارے شہر کو وارڈوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ پھر یہی کام دیہات میں شروع کیا جائے گا۔ جہاں دیہات کی ضروریات کے مطابق تعلیم دی جائے گی۔ ایک رنگ ہونا چاہیے۔ انجمن حمایت اسلام، صیانت لاسلام، انصار المسلمین اِن سب کے نام الگ الگ ہیں لیکن مقصد ایک ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک رنگی آجائے۔

سر مائیکل اڈوارڈ نے پنجاب کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ شہریوں اور گاؤں کے لوگوں کے خیالات میں اختلاف ہے۔ رواج کی لعنت میں پھنسے ہوئے ہیں جو نا خواندہ ہیں۔ انہیں قرآن کریم کا فلسفہ سکھانا چاہیے۔ ان دیہاتیوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ہمیں رواج کی اس لعنت کو بھی دور کرنا ہے۔ کونسلیں آ رہی ہیں۔ ہمیں ان کے ممبر بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان میں دیہات کے آدمی جائیں گے۔ غور کیجیے جب رسول کریم ﷺ کا وصال ہوا۔ تو یہی دیہاتی میدانِ عمل میں نکلے تھے۔ خلفائے کرام کہاں کے تھے؟ دیہات کے تھے۔ ان نئی کونسلوں میں خلیفہ شجاع الدین، ملک برکت علی اور میاں عبدالعزیز دیہات کی طرف سے آئیں گے۔ یہ ہمارے بھائی ہیں۔ "یا ایھا الناس انّ اکرمکم عند اللّٰہ اتقکم" ایک جنگلی اسلام لاتا ہے اور اپنے اعمالِ صالح سے آگے بڑھ جاتا ہے جو سلف صالحین کے اسوۂ حسنہ پر چلتا ہے۔ اللہ کے نزدیک وہی برگزیدہ ہے لیکن آج کل یہ فتنہ پیدا ہو رہا ہے کہ ارائیں ارائیں کو اور ککے زئی ککے زئی کو ووٹ دے۔ یہ بہت بڑی مصیبت ہے، بہت بڑی لعنت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ صحیح اسلامی تعلیم پیش کریں۔ ایک نظام ہونا چاہیے۔ اکیاون سال کی عمر میں انجمن حمایت اسلامی اس مقام پر پہنچی ہے، اسے کیا ملتا ہے، چار ہزار، لیکن ہمارے حریفوں میں کوئی پروپیگنڈا نہیں ہوتا اور وہ اپنی قوم کو کیا کچھ دیتے ہیں۔ ایک آدمی اٹھتا ہے اپنی کوٹھی دے دیتا ہے۔ دوسرا اٹھتا ہے تیس ہزار روپیہ دے دیتا ہے۔ کونسلوں میں ایسے آدمی جانے چاہئیں جو ہماری ہاں میں ہاں ملائیں، ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی خاص آدمی کی حمایت کریں۔ ہمیں ساری قوم کو دعوت دینا ہے۔ اس کے لیے ہمیں مسجد سے کام شروع کرنا چاہیے۔ پھر یہ جال سارے ملک میں پھیلا دینا چاہیے۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ہم ملت کی تنظیم چاہتے ہیں ایسے مسلمان پیدا کرنا چاہتے ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہوں۔ رسول کریم ﷺ پر مٹنے والے ہوں، ان کا ایک رنگ ہو، سب کے سب نیلی پوش ہوں، چندہ باقاعدگی سے دیا جائے اگر ایک کروڑ آنہ بھی جمع ہو جائے تو رقم کہاں تک جا پہنچتی ہے۔ اب انجمن حمایت اسلام ہماری ہو گئی ہے، اس کی مدد کرنا فرض ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسے تھوڑی دیر میں ایک لاکھ روپیہ دے دیں اگر ہم نے لاہور، امرتسر اور دو چار شہروں کو اور منظم کر لیا تو چندے سے بہت کچھ مدد ہو سکے گی۔ خواہ کوئی دھیلا دھیلا دے لیکن دے ضرور تا کہ ہر ایک کو دل بستگی ہو سب مسلمان ایک ایک آنہ دیں جب ہمارا سیل بے پناہ امڈے گا تو باطل کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائے گا۔

نوجوان اٹھ کھڑے ہوں انھیں کیا ہو گیا اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو حضور ﷺ کا جھنڈا ہاتھ میں لے کر بڑھتے چلے جاؤ اور قبل اس کے کہ وہ جھنڈا سرنگوں ہو بھی جھکے تمہارا سر اڑ جانا چاہیے۔

مولانا ظفر علی خاں صاحب کی تقریر

اَلْحَمدُلِلّٰہ وحدہ وَالسَّلام علی من لانبی بعدہ

حضرات سب سے پہلے مجھ پر اربابِ حل عقد انجمن کا شکریہ واجب ہے کہ ان کے حسنِ ظن کریمانہ نے میرے لیے اس سٹیج پر آپ حضرات کے ساتھ مخاطبت کا موقع بہم پہنچایا۔ میری خدمت گزار زندگی کے لیل و نہار کا اہم ترین واقعہ یہی ہے کہ میں نے ملک و ملت کے ہر مجمع اور ہر مجلس میں حاضر ہو کر اپنے قلم و بصیرت اور اپنی بساط و استطاعت کے مطابق اپنے بھائیوں کی بہتری،

برتری عروج اور علو کی سعی کی ۔اصلاح وارتقائے قوم ووطن کا کوئی ادارہ اور کوئی دائرہ ایسا نہیں ہے جس کی فضا کا دامن میری درد مندانہ صداؤں سے خالی رہے۔تنظیم وتعمیر کا کوئی مرحلہ اور کوئی منزل ایسی نہیں ہے۔

جس کے رہروؤں کے لیے میری آواز بانگ جرس نہ بنی ہو علم ادب، سیاست اور مذہب کی کوئی سطح ایسی نہیں جس پر میری آرزو، تمنا اور طلب سے بڑھ کر کھڑے ہونے کی سعادت مجھے نصیب نہ ہوئی ہو۔میں کبھی بھی سنیچوں کا تشنہ وگرسنہ نہیں رہا۔فرزندان توحید نے ہر مقام پر سے میری صدائیں سنی ہیں:

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابند نے نہیں ہے

خدمت کا سچا جذبہ موجود ہو تو ہر مقام نوید مقصود، ہر موقع عید مدعا اور ہر وقت نوروز کامرانی وکار براری ہے لیکن پھر بھی انجمن حمایت اسلام کے ارکان نظم کار کا دلی ممنون اور سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے میرے ناچیز جذبہ خدمت کے متعلق حسن ظن سے کام لیتے ہوئے شمالی ہند کے مسلمانوں کی سب سے بڑی تعلیمی انجمن کی سطح پر سے مجھے اپنی داستان درد سنانے کا موقع دیا۔اللہ تعالی مجھے ان کے اس حسن ظن کا اہل بننے کی توفیق مرحمت فرمائے اور میری درد بھری فریاد دل کے کانوں سے سنی جائے۔

میرا موضوع:۔حضرات میرا موضوع مسئلہ تعلیم نسواں ہے یہ مسئلہ بجائے خود بے حد اہم ہے لیکن مسلمانوں نے مخصوص معاشرتی اوضاع اور تربیت نسواں کے متعلق مخصوص اسلامی نظریات کی وجہ سے اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ہماری آنکھوں کے سامنے مشرقی تمدن فضاؤں میں عظیم الشان انقلابات برپا ہوئے جن کے اثرات سے ہماری نسوانی دنیا محفوظ نہیں رہ سکتی۔تمدن اور معاشرت کے جو بادل یورپ کے ہوش افگن جلوہ گروں سے عفت ربانی سمیٹ کر سماء مشرق پر محیط ہوئے اور ہر جگہ کھل کر برسے اور ہر سرزمین میں نئے خیالات وافکار اور نئے اوضاع واطوار کی روئیدگی کے ذخائر مہیا کر گئے اور ان اوضاع واطوار کے نشانات کم وبیش نمایاں ہو چکے ہیں۔مصر اور ایران میں بھی نئی ہوا چل رہی ہے۔بالخصوص ترکی تو آزادی نسواں کے نقطہ نگاہ سے بالکل یورپ کے ہمسر بن گیا ہے اور وہاں بظاہر ایسی صورت نظر آرہی ہے۔ہماری دیرینہ تصورات، تمدن اسلامی اس کی وجہ سے تذبذب میں مبتلا ہیں۔

مغربی مؤثرات:۔ہندوستان کے مخصوص حالات کے باعث ہماری مشکلات بہت زیادہ تھیں اول اجنبی تسلط اپنے ساتھ ایسی تمدن کی جو بیکڑوں بلائیں لایا تھا کہ جن کا نفوذ روز افزوں ہے اور ہماری وطنی بہنوں نے مغربی اثرات کو بلا تکلف قبول کر کے ان کی قوت استیلا میں خاص تیزی پیدا کر دی تھی۔آج سے پندرہ بیس برس پیشتر ہندو عورتوں کی حالت بالکل مختلف تھی۔سچ ہے کہ وہ سب کی سب ہماری طرح پردے کی پابند نہ تھیں لیکن پردے کے لوازم سے یک قلم فارغ بھی نہ تھیں۔ان کی طرز روش میں مشرقی اوضاع اور مشرقی حیا اس وجہ نمایاں ہے کہ بے پردگی کے باوجود ان کی طرف کسی کو آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن اب ان

میں یورپین فیشن اور افرنجیانہ اطوار اس قدر شائع ہیں کہ خود ہندو قوم کے ارباب فکر ونظر کے لیے بھی یہ حالت پریشانی اور تشویش کا موجب بن رہی ہے۔ سو حکومت وطنی میں عورتوں کے لیے حق نمائندگی کے تدریجی ارتقاء نے ایک نئی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ہم اس حق نمائندگی کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس سے استفادہ نہ کریں یا موجودہ اوضاع واطوار کو تغیرات سے محفوظ رکھ کر پورے استفادہ کا بندوبست کر سکیں۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں لیکن ہر سہ گونہ موثرات ہمارے گردوپیش موجود ہیں اور ان کی وجہ سے ہم جن مشکلات سے دوچار ہیں وہ ظاہر وباہر ہیں۔ ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ان موثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے لیے کوئی ایسا راستہ تلاش کریں جو حقیقی اسلامی نصب العین کے مطابق ہو اور ہماری روایات مقدسہ کی حفاظت کر سکے۔

ہماری ملی وقومی ترقیات کے جلیل القدر ترجمانوں کی کوشش شروع میں یہی تھی کہ تمدن معاشرت کا جو اندازہ قائم کر چکا تھا وہ بہرحال محفوظ رہے اور اس پر محولہ بالا موثرات اثر انداز نہ ہو سکیں۔ لسان العصر حضرت اکبرالہ آبادی نے جب یہ فرمایا تھا کہ:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں　　اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
میں نے کہا کہ آپ کا پردہ وہ کیا ہوا　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

تو ان کے پیش نظر یہی مقصد اور یہی نصب العین تھا کہ ہماری نسوانی دنیا ان معاشرت سے بالکل محفوظ رہے جن کا اجمالی تذکرہ میں ابھی کر چکا ہوں۔

مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم نے اسلامی تاریخ کو ناولوں کے رنگ میں پیش کرنے کا ارادہ فرمایا تھا تو جہاں وہ جانتے تھے کہ ناولوں میں حسن وعشق سے کام لیے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے کہ:

ع　　بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

وہاں وہ اس حقیقت کے احساس سے بھی غافل نہ تھے کہ مسلم خواتین کے مخصوص معاشرتی اوضاع کو مدنظر رکھتے ہوئے ہیروئنز کا لباس نہیں پہنایا جا سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں اپنے مشہور تاریخی ناولوں کے لیے زیادہ تر غیر مسلم تلاش کرنی پڑیں۔ فلورا، انجیلا، ورجنا، موہنا وغیرہ اس احساس کی شہادت دے رہی ہیں یعنی مولانا شرر مرحوم بھی ہماری اختیار کردہ اوضاع کو محفوظ اور قائم رکھنے کے آرزومند تھے۔ بلاشبہ ہمارا اولین فرض یہی تھا اور یہی ہے کہ ہم بدلے ہوئے حالات اور حد درجہ ناموافق ونا سازگار خارجی موثرات کے باوجود اپنی تہذیب اپنی ثقافت اپنی شاندار روایات اور عورتوں کے متعلق اسلامی نصب العین کو عزم راسخ اور ارادہ محکم کے ساتھ قائم رکھیں لیکن جن مشکلات سے ہم اس وقت دوچار ہیں ان سے بچاؤ اور حفاظت کا مناسب بندوبست کیے بغیر چارہ نہیں۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس الٰہی نظام سے تمسک اعتصام کو دنیا وعقبیٰ کی بہترین سعادتوں کا سرچشمہ یقین کریں جو آخری اور مکمل ترین آسمانی کتاب یعنی قرآن حکیم نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ ہمارا فرض ہے جو قرن اول کے فرزندان توحید نے ہماری رہنمائی کے لیے پیش کیں اور ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ اس کائنات میں پرورش پاتے ہوئے مسلمانوں نے پیش کیا۔ ہمارا فرض ہے کہ

ہماری ہدایت ورہنمائی کے اس درخشاں نظام شمسی سے اکتساب حق کا سامان کریں جو حضور خواجہ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مسعود سے ترکیب پذیر ہوا۔ یہی نور ہر ظلمت اور ہر تیرگی میں ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس کو اپنا مقصود بنا کر ہم ہر بلا اور ہر مصیبت سے نجات پا سکتے ہیں۔ اس لائحہ سعادت کی پابندی ہمیں دونوں جہانوں کی برکتوں کا مرجع بنا سکتی ہے۔ یہی وہ پاک مقدس نظام ہے جس نے دنیا میں سب سے پہلی مرتبہ عورت کے حقیقی رتبہ کا اعلان کیا۔ اس کی جائز آزادی محفوظ کی اور انسانی سوسائٹی کی بیش بہا دولت کو بنایا۔ گذشتہ ساڑھے تیرہ سو برس میں دنیا کے اندر بڑے بڑے انقلابات آئے، بڑے بڑے نظام ہائے شمسی بنے اور بگڑے، قوانین وضوابط کے بڑے بڑے سفائن واسفار تیار ہو کر معرض نفاذ میں آئے اور رد ہوئے۔ عورت کی آزادی اور عورت کے حقوق کے بڑے بڑے اعلان کیے گئے لیکن دنیا میں کوئی ارضی یا سماوی نظام ایسا مفید ثابت نہیں ہوا جس نے عورت کو صحیح معنوں میں کل مساوات عطا کی ہو۔

قبل از اسلام عورت کی حالت

ظہور اسلام بعثت حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل عورت کی کیا حالت تھی؟ اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جاتا تھا میں ان سوالات کا تفصیلی جواب یہاں نہیں دے سکتا۔ اسفار، تاریخ عمل اور دواوین قوانین اقوام پر جن ارباب علم کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اسلام سے قبل عورت کو عملاً انسانیت کے دائرے سے خارج سمجھا جاتا تھا وہ آج تک میکے میں رہتی تھی میکے والوں کی زرخرید ارلونڈی اور کنیز سمجھی جاتی تھی۔ شادی کے بعد سسرال والوں کے ہاں اس کے ساتھ نہایت افسوسناک برتاؤ ہوتا تھا۔ والدین یا شوہر کی جائیداد میں اس کے لیے کوئی حصہ نہ تھا وہ بچے پیدا کرنے کی ایک بے جان مشین یا حیوانی خواہشات کی تسکین کا ایک مجبور وسیلہ متصور تھی۔ اس کے حقوق کا انحصار صرف شوہر کی مرضی پر تھا۔ وہ راضی رہتا تھا تو اسے اچھی حالت میں رکھتا تھا، ناراض ہوتا تھا تو دنیا کی ہر تکلیف دہ اذیت پہنچانے کا حق دار سمجھا جاتا تھا۔ گویا اسلام سے قبل عورت میں بہائم وارارضی وآئینہ کی طرح ایک بے زبان جائیداد تھی جسے مرد اپنے اپنے وقتی جذبات واحساسات کے مطابق استعمال کرنے کا مجاز ہے اور کوئی قانون ان کے اس حق اقتدار سے تعرض کی جرأت نہیں کر سکتا تھا نہ عورتوں کے دلوں میں اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کی حس رہی تھی۔ اسلام دنیا میں آیا تو اس نے عورت کو نہ محض صحیح انسانی حقوق دلائے بلکہ انسانی حقوق میں عورت کو مرد کے برابر رکھا جو تفاوت بظاہر نظر آ رہا ہے۔ وہ صرف دوائر عمل میں تفاوت ہے۔ حقوق کا تفاوت نہیں ہے، اسلام نے عورت کو میراث میں شریک کیا، حسن معاشرت کے بہترین اصول مرتب کیے۔ مردوں پر عورتوں کے ایسے حقوق قائم کیے جن کی پابندی بعض بظاہر ناخوشگوار حالات میں بھی خانگی اور معاشرتی زندگی کی تمام معترتوں اور ناخوشگواریوں سے محفوظ رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ جس طرح مرد کو حق طلاق ہوا اسی طرح عورت کو حق خلع عطا ہوا یعنی اگر مرد خانگی زندگی کو ناخوشگواریوں سے محفوظ رکھنے کا کوئی راستہ مفارقت کے سوا نہ پائے اور اس وجہ سے زوجہ سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق دار بن سکتا ہے اسی طرح عورت بھی اس نوع کی جائز شکایات کے اثبات کے بعد رشتہ نکاح توڑ کر اور ایک زوج سے علیحدگی اختیار کر کے کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے دوسرا نکاح کر سکتی ہے۔ قرآنی تصریحات اس باب میں اتنی

جامع اور حاوی ہیں کہ آج بھی دنیا کی متمدن سے متمدن قوم آزادی رس مساواتِ نسواں کے بڑے بڑے اعلانوں کے باوجود عورتوں کو اپنے ضروری اور صحیح حقوق دینے کا دعویٰ نہیں کر سکتی جتنے کہ اسلام نے عطا کیے ہیں اور آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر عطا کیے جبکہ عورتوں کی طرف سے ان حقوق کے لیے کوئی آواز بھی بلند نہیں ہوئی تھی جبکہ عورتیں طلب حقوق کے لیے ہنگاموں، جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں سے قطعاً نا آشنا تھیں حضرت رحمۃ اللعالمین نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت اور اس باب میں اہتمام وحزم کے طور پر جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کا احصا واستقصا اس مضمون میں میرے لیے مشکل ہے لیکن میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضور سرور کائنات کی پاک تعلیم کو سامنے رکھ کر عورت کے ساتھ حسن سلوک کا جو مرقع تیار ہوتا ہے وہ سچ مچ اس دنیا میں معاشرت کے نقطۂ نگاہ سے جنت کا نمونہ پیدا کرنے کا ضامن ہے۔

اسلام نے محض تعلیم ہی پیش نہ کی بلکہ اس پر عمل کر کے دکھلایا کہ عورتیں بھی اپنے حقیقی وظائف کے دائرے میں رہ کر اپنے خداداد قویٰ کو ارتقا کے درجہ کمال تک پہنچانے کی پوری حق دار ہیں۔ قرن اول کی خواتین کے حالات سامنے رکھے جائیں تو ظاہر ہوگا کہ علم، ادب، سیاست اور مذہب کی دوڑ میں کیسی کیسی جلیل القدر ہستیاں پیدا ہوئیں جن کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ہماری خواتین نے پردے میں مستتر رہ کر جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ مردوں کے کارناموں سے باعتبار وسعت واہمیت نتائج کسی طرح کم نہیں ہیں۔ تاریخ کے اوراق گواہی دے رہے ہیں کہ بعض اہم قومی جنگوں میں مردوں کے پاؤں اکھڑ گئے تو عورتیں خیموں کی میخیں اور ڈنڈے اکھاڑ کر غنیم کے مقابلے پر کھڑی ہوگئیں اور ان کی حوصلہ افروز اور ولولہ افزا مثالوں نے مردوں میں استقامت کے وہ جوہر پیدا کر دیئے کہ غنیم کو فرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ تفصیلات میں نہ جایئے لیکن صرف یہی سوچ لیجیے کہ کیا نسوانی دنیا میں انسانی زندگی کے بہترین مضامین کے کمال نشوونما کا کوئی نمونہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی بہتر پیش ہو سکتا ہے۔ اسلام کی پاک تعلیم اور اس پر رحمۃ اللعالمین کی پاک صحبت نے محض صدیق، فاروق، عثمان اور علی رضی اللہ عنہما ہی پیدا نہ کیے بلکہ عائشہ، حفصہ، خدیجہ اور فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی پیدا کی جس پاک تعلیم کی یہ اعلیٰ عملی مثالیں موجود ہیں اس سے بڑھ کر حقیقی اور صحیح آزادیٔ نسواں کے پیش کرنے کا دعویٰ اور کون سی تعلیم کر سکتی ہے۔

میں یہاں پردے کی بحث نہیں چھیڑنا چاہتا۔ میری ذاتی رائے یہی ہے کہ پردے کے بارے میں مناسب حد تک اہتمام ضروری ہے، ہندوستان کے خاص حالات کی وجہ سے اس کے متعلق بے پروائی اور بے توجہی بہت زیادہ مضرتوں کی موجب نظر آتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورتیں صحیح اور ضروری تعلیم وتربیت سے محروم رہیں۔ تعلیم حد درجہ ضروری ہے اور اہم ہے اس وجہ سے یہ ضروری ہے کہ مردوں کے تعلیم پا جانے اور عورتوں کے ان پڑھ رہنے کی وجہ سے خانگی زندگی میں مطابقت کا ایک اہم مسئلہ ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ طلب علم مردوں اور عورتوں دونوں پر فرض ہے۔ اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ عورتیں حقیقت میں بچوں کی تربیت کی سب سے بڑھ کر کفیل ہیں اور ان کی آغوش میں ہماری آئندہ نسلیں پرورش پا رہی ہیں اگر ہم مردوں کو صحیح تعلیم نہ دیں گے تو اس کا نتیجہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مرد فرض انسانیت کو بہتر طریق پر ادا کرنے کے قابل نہ ہو سکیں گے لیکن اگر عورتوں کی صحیح تعلیم کا بندوبست نہ ہوگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارا ہر گھرانہ اور ہمارا ہر کنبہ بچوں کے لیے اعلیٰ تربیت گاہ بننے سے محروم ہو جائے

گا اور اس سے جو قومی تعلقات پیدا ہو سکتے ہیں ان کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

حمایت اسلام اور تعلیم نسواں

لیکن میں اس تعلیم کا زیادہ قائل نہیں ہوں جس کا نصاب دوسری قوموں کی مخصوص ضروریات کی بنا پر مرتب ہوا اور ہم بھی مجبوراً اس سے استفادہ کرنے لگ گئے۔ ضروری ہے کہ ہم اپنی معلوم ضروریات اور پیش نظر نصب العین کی بنا پر نیا نصاب تعلیم مرتب کریں جو ہماری لڑکیوں کو نمونہ کی مائیں اور نمونہ کی بیبیاں بنا سکے۔ انھیں نسائیت کے ان خصائص کے پیکر بنا دے جس کے نمونے ہمیں زیادہ تر قرن اول کی مسلم خواتین میں ملتے ہیں۔ انجمن حمایت اسلام شمالی ہند کے مسلمانوں کی سب سے بڑی تعلیمی انجمن نے گذشتہ نصف صدی میں اس نے فرزندان توحید کی جو تعلیمی خدمات کی ہیں وہ اس کے لیے اور ہر مسلمان کے لیے واقعی باعث فخر ہیں لیکن تعلیم نسواں کی طرف ابھی تک پوری توجہ نہیں ہو سکی۔ یہ اہم کام ابھی تک ابتدائی حالت میں ہے۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ اس وقت حضرت علامہ اقبال انجمن حمایت اسلام کے صدر ہیں انھیں مسئلہ تعلیم کے ساتھ خاص شغف ہے۔ نیز ان کا نقطۂ نگاہ خالص اسلامی ہے۔ میں سنتا ہوں کہ ان کی آرزو اور کوشش یہ ہے کہ انجمن حمایت اسلام کی سرپرستی میں عورتوں کے لیے ایک بہت بڑا کالج بن جائے جس کا نصاب سرکاری نہ ہو۔ اس لیے کہ وہ ہمارے دکھ کی دوا اور ہمارے مرض کا علاج نہیں بلکہ اس کا نصاب خالص اسلامی ہو۔ انجمن کے پاس اس وقت لڑکیوں کی تعلیم کے لیے صرف ایک مڈل سکول ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اس سکول کو جلد سے جلد ترقی دے کر اعلیٰ درجے کا کالج بنا دیں جس کا نصاب تعلیم مخصوص اسلامی تربیت اور مخصوص اسلامی خصائص کا ضامن و کفیل ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس اہم ملی و قومی کام میں انجمن کی زیادہ سے زیادہ اعانت کریں۔ اس لیے کہ یہ اعانت انجمن کی اعانت نہیں بلکہ خود ملت اسلامیہ کی اعانت ہے۔ یہ کام اگر انجام پا جائے تو میں یقین و وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ بدلے ہوئے حالات اور شدید مخالفانہ مؤثرات کے باوجود ہم اپنی شان دار دیرینہ روایات کو قائم و محفوظ رکھ سکتے ہیں جن خطرات سے ہم اب دوچار ہیں۔ ان کے انسداد کی صورت یہ نہیں کہ ہم لڑکیوں کو تعلیم سے یا اعلیٰ تعلیم سے روکیں۔ یہ صورت نہیں کہ دوسروں کی درسگاہوں میں تعلیم دلائیں جن کی درسگاہوں میں اور جن کے نصاب ہماری ضروریات و احتیاطات کی بنا پر مرتب نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے کوئی راستہ بھی ہمیں ان خطرات سے نہیں بچا سکتا جن کا ذکر میں ابتدا میں کر چکا ہوں۔ ہمارا اپنا ''کلیہ نسواں'' جس کا نصاب ہماری مخصوص ضروریات اور اسلامیت کے بہترین خصائص کی تولید و نشو کا حال ہو۔ ان خطرات کا قطعاً انسداد کر سکتا ہے اس لیے مسلمانوں سے اور ارباب بست و کشاد انجمن سے میری درد مندانہ استدعا ہے کہ اس اہم کام پر خاص توجہ مبذول کریں۔ یہ محض لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ نہیں ہے کہ اس کے ساتھ ہماری مخصوص تمدن اور مخصوص طرزِ معاشرت کی صحیح حفاظت وابستہ ہے۔ اس ذریعے سے ہماری نسوانی دنیا اعلیٰ اسلامی اوصاف اور اسلامیت کو محفوظ رکھ کر موجودہ زمانے کے تمام وسائل ارتقا دل و دماغ سے پورا فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ خدا کرے کہ میری یہ درد مندانہ استدعا صدا بصحرا ثابت نہ ہو۔

دارالاقامت

مجوزہ کالج کے نصاب اوراس کے طریقۂ تعلیم پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ان عقدوں کو سلجھانے کا انتظام اکابر اہل علم کی ایک کمیٹی کے ذریعے سے ہوسکتا ہے لیکن میں سرسری طور پر اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ کالج ریزیڈینشل یعنی اقامتی ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ صوبے بھر کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکے گا۔ یعنی کالج کے ساتھ ایک دارالاقامت یا بورڈنگ ہاؤس بھی بننا چاہیے جس میں بیرونی بچیاں رہ سکیں اور اس کی فضا، نظام تربیت اور انتظام ایسا ہو کہ والدین بلا تکلیف اپنی بچیوں کو اس دارالاقامت میں بھیج کر ہر تشویش اور خلجان سے آزاد ہو جائیں۔

میرے محترم دوستو! عزیزو! ہماری ہر تعلیم گاہ میں بہترین دینی اوصاف اور اسلامی قومی اخلاق کی نشو ونما اور حفاظت کے انتظام اشد ضروری ہیں بلکہ میرے نزدیک یہ چیزیں نری خواندگی کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ بیش قیمت ہیں لیکن لڑکیوں کی تعلیم کے ضمن میں تو اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ ان کی تربیت، ان کی اسلامیت اور ان کی عفت و پاکیزگی کی حفاظت کے سامان انتہا پر پہنچا دیئے جائیں۔ لڑکیوں کی مثال گلاب کی پتی سی ہے جسے گرم اور ناموافق ہوا کا ہلکا سا جھونکا بھی جھلس کر رکھ دیتا ہے۔ لڑکی شاہوار گوہر اور بیش بہا آبگینہ ہے جو ذرا سی ٹھیس کو بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ اس باب میں بہترین نگرانی اور احتیاط کا کوئی دقیقہ بھی فروگذاشت نہیں ہونا چاہیے۔ نصاب ایسا ہونا چاہیے کہ لڑکیاں دوسرے ضروری علوم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث اور فقہ سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔ تاریخ اسلام سیرت حضور خواجہ دو جہاں اور سیرت صحابہ وصحابیات سے بھی واقفیت حاصل کریں۔ خانہ داری کی تمام ضروریات میں طاق ہو جائیں۔ علاوہ بریں سوزن کاری، کشیدہ بنیان بافی اور جراب بافی وغیرہ فنون ضروریہ میں بھی مہارت تامہ حاصل کریں تاکہ ضروری امور خانہ داری کی سرانجام دہی کے بعد اپنی فرصت کے اوقات میں اپنے ہاتھوں کی محنت سے اچھے پیسے کما سکیں یعنی خانگی زندگی کو بہتر طریق پر چلانے اور اس کی ضروریات کو عمدہ پیمانے پر پورا کرنے میں شوہروں کی حقیقی معین ومعاون بن جائیں۔

ایک اہم چیز جس کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کالج اور اس دارالاقامت کا خرچ بہت کم ہونا چاہیے تاکہ زیادہ سے زیادہ مسلمان اس سے استفادہ کر سکیں۔ میرے نزدیک اس قسم کے مخصوص قومی اداروں کے قیام کی ضروریات صرف دو وجہ سے ہوئی ہے اول یہ کہ مخصوص قومی دینی اوصاف وفضائل کی حفاظت ہو سکے۔ دوم زیادہ سے زیادہ افراد قوم سہولت کے ساتھ ان سے فائدہ اٹھائیں۔ درسگاہیں لڑکوں کی ہوں یا لڑکیوں کی دونوں ہی طرف دو چیزوں کی انتہائی نگہداشت ضروری ہے اگر یہ چیزیں موجود نہ ہوں تو میرے نزدیک مخصوص قومی اداروں کے قیام کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ انجمن کو چاہیے کہ اپنے تمام موجودہ اداروں میں ان دو خصوصیتوں کی حفاظت کا پورا اہتمام کرے لیکن لڑکے تو دوسری درسگاہوں میں بھی تعلیم پا سکتے ہیں۔ لڑکیوں کے لیے ایسا انتظام سخت خطرناک ہوگا۔ لہٰذا لڑکیوں کے مجوزہ کالج میں خرچ کو کم سے کم رکھنا حد درجہ لازم ہے۔

مدرسۃ البنات

میں نے اس وقت تعلیم نسواں کے جتنے ادارے دیکھے ہیں ان میں ''مدرسۃ البنات'' جالندھر کے سوااور کوئی ادارہ نہیں دیکھا جس میں ضروریات ملّی واسلامی کو تحقیقاً اہتمام کے ساتھ پیش نظر رکھا گیا ہے۔انجمن کو چاہیے کہ وہ کالج کی تاسیس کے انتظام کے دوران میں اپنی طرف سے چند معلّمات مدرسۃ البنات میں بھیج دیں۔تا کہ وہ مدرسۃ البنات میں تربیت پا کر انجمن کے مجوزہ کالج کے طریق تعلیم کو صحیح رکھنے میں اچھی مدد دے سکیں۔

حضرات میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔اپنی گزارشات میں نے اختصار کے ساتھ پیش کر دی ہیں ہماری خانگی اور معاشرتی زندگیوں کی دیرینہ روایات اس وقت سخت خطرات میں مبتلا ہیں ان کے مقابلہ کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ایک اسلامی درسگاہ قائم کریں جو اسلامیت کی حقیقی سرمایہ دار اور جس کے دامن میں پناہ لے کر ہماری لڑکیاں ہماری اپنی روایات اور اپنے اوضاع اور نصب العین کے مطابق اعظم تعلیم سے مستفید ہو سکیں۔یہ شمالی ہند کے مسلمانوں کی سب سے بڑی اور اہم ضرورت ہے کہ جس کا فوری انتظام ہونا چاہیے۔انجمن کے ہاتھ میں پچاس برس سے مسلمانوں کی تعلیمی باگ ہے اور انجمن نے تعلیم ذکور میں اپنے فرائض کو قابل قدر طریق پر ادا کیا ہے۔تعلیم اناث کے فرض گراں کو بھی وہی اٹھا سکتی ہے لیکن اس کے لیے مسلمانوں کی طرف سے زیادہ سے زیادہ امداد ضروری ہے۔مجھے یقین ہے کہ پنجاب کے وہ فرزندان توحید جنھیں سرسیّد مرحوم نے زندہ دلان پنجاب کا زندہ جاوید لقب دیا تھا تعلیم نسواں کے دائرے میں اس اہم اور شان دار اقدام میں انجمن کا ہاتھ بٹانے میں تامل نہ کریں گے جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔امداد انجمن کی امداد نہ ہوگی بلکہ وہ مسلمانوں کی امداد ہوگی۔اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو فرائض اسلامی وملی کی بجا آوری کی پیش از پیش توفیق مرحمت فرمائے۔آمین۔

مولانا ظفر علی خاں صاحب کی نظم

دنیا پر رسول اللہ ﷺ کے احسانات

آدم کی نسل پر ہوئی حجت خدا کی ختم — دنیا میں آج دین کی تکمیل ہوگئی
اپنا جواب آپ تھی جو آخری دلیل — افلاک پر حوالۂ جبریل ہوگئی
بطحا میں رحمت دو جہاں کا ہوا ظہور — منشاء کردگار کی تعمیل ہو گئی
آ کر محمد عربی ﷺ نے لگائی مہر — اللہ کے قبالہ کی تنجیل ہو گئی
تورات کا فسانہ سنانے کو رہ گیا — منسوخ اس کے آتے ہی انجیل ہو گئی
پیغمبروں کے ملک میں دولت تھی جس قدر — اسلام کے خزانہ میں تحویل ہو گئی
ایماں کو جن سے شکوۂ اجمال تھا کبھی — قرآں میں ان نکات کی تفصیل ہو گئی

سوتے ہوؤں کو اس کی صدا نے جگا دیا　　آواز اس کی صور سرافیل ہو گئی
دنیا کی محفلوں کے دیئے سارے بجھ گئے　　روشن جب اس کی بزم کی قندیل ہو گئی
آفاق اعتدال کے سانچے میں ڈھل گیا　　ارکان کائنات کی تعدیل ہو گئی
ہیبت سے کفر لرزہ براندام ہو گیا　　باطل کی روح خوف سے تحلیل ہو گئی
اصحاب فیل ارض حرم سے ہوئے فرار　　ہر کنکری حجازہ سجیل ہوگئی
نقطہ زمیں کا چشمِ زدن میں بدل گیا　　اور ہیئت آسمان کی تبدیل ہو گئی
مرزائیوں کا نام ذرا دیر سے مٹا　　رحمتِ حقّ جلال سے یہ ذرا ڈھیل ہو گئی

شرطِ نشاط

(ازمولوی ظفرعلی خان صاحب)

میری جبیں کی سجدہ گاہ کفر کا آستانہ ہو　　تیرے نیاز مند کا حشر یہ اے خدا نہ ہو
تو نہ سنے تو اور کون میری پکار کو سنے　　جا کے پناہ لوں کہاں تو ہی اگر مرا نہ ہوا
شامل حال ہو اگر فضل ترا تو شوق سے　　برسرِ جنگ ہو زمیں برسرِ کیں زمانہ ہو
وضع کا پاس ہے یہی جبر کی بارگاہ میں　　فرق نہ آئے آن میں اور وہ موحدانہ ہو
غیر کے سامنے کروں دستِ سوال کیوں دراز　　میرے لیے کھلا ہوا غیب کا جب خزانہ ہو
جا کے میں اس جگہ رہوں سانس میں اس فضا میں لوں　　دینِ قویم کا علم جس میں جھکا ہوا نہ ہو

عید کا جشن ہو بپا شرطِ نشاط ہے یہی
ساز حجاز کا چھڑے اور یہ مرا ترانہ ہو

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا O

ایک مشہور معروف پادری اور عیسائی مبلّغ کا قبول اسلام

قارئین کرام یہ خوش خبری سن کر بے حد مسرور ہوں گے کہ ریورینڈ ایم اے پال نے جو ایک مشہور و معروف عیسائی مبلّغ ہیں۔ مسلم کلب نذر باغ لکھنو کے دفتر میں اسلام قبول کیا۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا میں ایک معمر اور پرانا عیسائی مبلّغ ہوں اور اپنی زندگی میں بہت سے مسلمانوں کو عیسائی بنا چکا ہوں۔ میں قرآن کریم کو نکتہ چینی کے خیال سے مطالعہ کیا کرتا تھا تا کہ اس کے

نقائص مسلمانوں پر واضح کروں لیکن قرآن حکیم کے گہرے مطالعہ سے میرے اندر اس کتاب مقدس کے لیے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ آخر کار اس کی حیرت انگیز اور صداقت آمیز روحانی تعلیمات نے میرے دل کو روشن کر دیا اور میرا روحانی تخیل بہت بلند ہو گیا۔ میں اس کشمکش و رنج میں مبتلا رہنے لگا کہ اپنے اسلام کا کس طرح اعلان کروں۔ آج رات خدا کے مقدس کلام نے میرے اندر جرأت پیدا کر دی۔ چنانچہ آپ حضرات کے سامنے انتہائی مسرت اور انبساط کے ساتھ اپنے قبول اسلام کا اعلان کرتا ہوں۔ آپ میرے عیسائیت سے تائب ہونے کے گواہ رہیں، میں اپنی گزشتہ زندگی پر انتہائی ندامت کا اظہار کرتا ہوں اور ایمان رکھتا ہوں کہ میری سابقہ زندگی کے لمحات ضائع گئے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں استقامت بخشے، سچ ہے۔

ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُوالۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ○

مومن کی شان (از مولانا ظفر علی خان صاحب)

سنکھیے اس حقیقت سے ہیں شاید بے خبر — وہ جو مومن ہے کبھی کفر سے پٹ سکتا نہیں
ڈاکٹر منجے کے چیلے لاکھ سر پٹکا کریں — تا قیامت ہند سے اسلام مٹ سکتا نہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

حمایت اسلام

لاہور ۹/۱۲ محرم الحرام ۱۳۶۰ھ

قرآن حکیم کا تازہ معجزہ

حقانیت اسلام کا ثبوت اور حق کی فتح عظیم

ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب مقدس ہدایت کا سرچشمہ ہے جو لوگ تحقیق کی غرض سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں وہ ضرور اپنے پاکیزہ اور نیک مقصد میں فائز اور کامیاب ہوتے ہیں۔ ابتدائے اسلام سے آج تک ایسے ہزاروں واقعات پیش آ چکے ہیں کہ اسلام کے سخت ترین دشمنوں نے کلام الٰہی کو سنا یا پڑھا اور ان پر اس کلام پاک کا ایسا گہرا اثر ہوا کہ وہ بلا جبر و اکراہ آغوش اسلام میں آ گئے۔ تاریخ اسلام میں حضرت عمر خطاب رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا واقعہ اس دعوے کی ایک روشن اور درخشندہ مثال ہے، اس کے بعد ہر دور میں ایسے واقعات پیش آتے رہے اور اسلام پاک روز بروز بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ آج روئے زمین پر قریباً ۶۰۔۷۰ کروڑ مسلمان موجود ہیں چونکہ اسلام پاک اللہ کا دین ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے نیک اور برگزیدہ بندوں کے لیے پسند کر لیا ہے۔ اس لیے یہ دین پاک مٹ نہیں سکتا۔ قرآن مجید کی تعلیم میں حق سبحانہ تعالیٰ نے وہ تاثیر رکھی ہے کہ اس کی آیات مقدسہ براہ راست ایک طالب حق کے دل پر اثر کرتی ہیں اور اسے حلقہ بگوش اسلام بنا لیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سچ

فرمایا ہے۔لَو اَنزَلنَا ھٰذَا القُرآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیتَہٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّن خَشیَۃِ اللّٰہِ ط یعنی اگر ہم اس قرآن کو پہاڑوں پر اتارتے تو دیکھتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپتے لرزتے اور ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ کہتے ہیں کہ انسان کا دل موم سے زیادہ نرم اور پتھر سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی تازہ اور زندہ مثال ہمارے سامنے موجود ہیں۔لکھنؤ میں ایک مشہور و معروف پادری ایم اے پال رہتے ہیں جو مسیحی مذہب کے پرانے مبلغ اور مناد ہیں۔انھوں نے اپنے قول کے مطابق اپنی زندگی میں بہت سے مسلمانوں کو مرتد کیا۔اس کا بیان ہے کہ میں قرآن حکیم کو اس لیے پڑھا کرتا تھا کہ اس پر اعتراضات اور نکتہ چینی کروں اور اس کے نقائص مسلمانوں پر واضح کروں لیکن اس کتاب مقدس کا مطالعہ پادری صاحب کے لیے ہدایت اور نجات کا ذریعہ بن گیا۔قرآن پاک کی تعلیم کیسی سچی اور صادق تعلیم ہے کہ اپنے مخالفوں کو بھی راستی اور صداقت کی طرف کھینچ لاتی ہے۔مسٹر موصوف کا بیان ہے کہ مجھے قرآن مجید کے مطالعہ میں خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔آخر کار اس کی حیرت انگیز اور مقدس تعلیم نے میرے دل اور روح کو روشن کر دیا۔میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور وحدانیت کا قائل ہو گیا جس کی تبلیغ کے لیے اتنے پیغمبر (علیہ السلام) بھیجے گئے۔حضرت آدم علیہ السلام،حضرت ابراہیم علیہ السلام،حضرت موسیٰ علیہ السلام،حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سب توحید کے علم بردار تھے۔اللہ تعالیٰ کو بیٹے بیٹیوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے جب توحید کے نور سے میرا سینہ منور ہو گیا تو میں اس خیال میں مبتلا رہنے لگا کہ اپنے ایمان بالاسلام کا اعلان کسی طرح کروں لیکن یکا یک اللہ تعالیٰ نے مجھے اخلاقی جرأت عطا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پادری صاحب جو نہ صرف اسلام کے بڑے مخالف اور قرآن کریم کے نکتہ چین تھے۔سیدھے مسلم کلب نذر باغ لکھنؤ کے دفتر میں گئے اور انتہائی مسرت کے ساتھ اپنے قبول اسلام کا اعلان کیا۔اللہ تعالیٰ انھیں استقامت بخشے۔آپ نے حاضرین مجلس سے استدعا کی کہ آپ لوگ میرے قبول اسلام اور ترک عیسائیت کے گواہ رہیں۔حاضرین کے سامنے آپ نے اپنی گزشتہ زندگی پر انتہائی شرمساری اور انفعال کا اظہار کیا۔نیز یہ بھی کہا میرا ایمان اور یقین ہے کہ میری سابقہ زندگی کے بیش قیمت لمحات ضائع گئے کیونکہ یہ صحیح ہے کہ زندگی کا جو حصہ اسلام پاک کے بغیر گزرے وہ برباد جاتا ہے اور جو وقت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور ذکر و فکر میں گزرے وہی آئندہ زندگی میں مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔الغرض قرآن کریم کی تعلیم وہ مقدس تعلیم ہے جو برسوں کے کفر سے انسان کو پاک کر دیتی ہے جس کی تصدیق کے لیے ایم اے پال صاحب کی مثال موجود ہے۔چنانچہ قرآن حکیم کی تعلیم کی برکت توبوا الی اللّٰہ توبۃ نصوحاً۔اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی رحیم اور کریم ہے۔وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے کیونکہ اس نے خود اپنے کلام مجید میں فرمایا ہے۔ان اللّٰہ رؤف بالعباد اس کی عنایات بے حجابات کی طفیل توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔اس کا ارشاد ہے کہ تم سچے دل سے توبہ کرو۔اللہ تعالیٰ اسے منظور فرمائے گا تم اللہ تعالیٰ کی طرف ایک قدم اٹھاؤ وہ تمہاری طرف دس قدم اٹھائے گا۔طالبان حق کے لیے یہ ایک زریں موقع ہے کہ وہ اس چند روزہ زندگی میں عقائد باطلہ سے تائب ہو کر دین حقہ اسلام کی آغوش میں آ جائیں۔اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لے آئیں جو انھیں تمام روحانی آلائشوں سے پاک کر کے اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں شامل کر دے گا۔

قرآن حکیم کی تعلیم نے ایسے عقائد باطلہ کی پرزور تردید کی ہے جن میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ جھوٹے معبودوں کو شامل کیا گیا

ہے اور خلق اللہ کی ہدایت کے لیے اعلان کیا گیا ہے ۔اِنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِله واحد

قرآن کریم نے جہاں بت پرستی، اصنام پرستی، آتش پرستی اور آفتاب پرستی کی ممانعت کی ہے وہاں ایسے عقائد باطلہ کی بھی مذمت کی ہے جن میں خدا تعالیٰ کے بیٹے بیٹیاں ماننے کی تعلیم دی گئی ہو یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہا اور نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بنا دیا ۔قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ دونوں جھوٹے ہیں کیونکہ حضرت عزیر علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے پیغمبر اور اس کے برگزیدہ بندے تھے وہ تو اس کی وحدانیت کی تعلیم دیتے رہے ۔انسانوں کی طرح کھاتے پیتے اور رفع حاجات کرتے تھے ۔ان میں تمام بشری صفات موجود تھیں ۔بھلا وہ خدا اور خدا کے بیٹے کس طرح ہو سکتے ہیں؟ یہ عقیدہ سراسر غلط ہے اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان سن لیں ۔قل ھو اللّٰہ احد اللّٰہ الصمد لم یلد ولم یولد.

یہی تعلیم صحیح ہے اور ہر ذی عقل، ذی فہم اور سلیم الطبع انسان اسی تعلیم پر بالآخر ایمان لائے گا اور عقائد باطلہ ایک روز مٹ جائیں گے۔

سیّدِ نَا حُسَیْن عَلیہ السّلام

(از مولانا ظفر علی خاں)

تڑپاتی ہے پھر یاد امام الشہداءؑ کی — بیتاب ہے ہر ذرہ مدینہ کی گلی کا
آنکھوں میں جو آنسو تھے وہ پہلے ہی ہوئے خشک — کیا نوحہ کرے کوئی حسین ابن علیؑ کا
خاک اڑ گئی کوفہ کی زمانہ کی فضا میں — خوں کر کے محمدؐ کے گلستاں کی کلی کا
محدوی باطل کی ہے مظلومیِ حق شرح — یہ فیصلہ ہے بارگہِ لم یزلی کا
ہیں زندہ ابھی تک حسنی اور حسینی — لاقی کا پتہ ہے نہ نشاں ہے تُبلی کا
سرمایہ ہے خونِ شہدا روزِ ازل سے — منشور " بل احیاءٌ" کے عنوان جلی کا
اللہ کے رستے میں کٹاتے ہیں جو گردن — ضامن ہے وہ خود اُن کی بُری اور بھلی کا
ہے معرکہ کرب و بلا ہند میں بھی گرم — سر دو کہ ملے مرتبہ تم کو بھی ولی کا

رونے میں بھی حکمت ہے مگر وہ نظری ہے
جاں دو کہ یہ وقت اُس کی ہے شانِ عملی کا

متن، سیاق اور تناظر

ڈاکٹر ناصر عباس نیّر

متن کا معنی کے بغیر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے نہیں کہ انسانی ذہن معنی سے تہی کسی مظہر کا تصور کرنے سے قاصر ہے (مثلاً زین مت میں انسانی ذہن کی معراج مطلق خالی پن کا تجربہ کرنا ہے اور اس کے پیروکار اس تجربے سے گزرتے ہیں) یا معنی سے تہی کوئی مظہر ممکن نہیں بلکہ اس لیے کہ متن کا اطلاق ہوتا ہی اس تحریر پر ہے جو کسی نہ کسی معنی کی حامل ہو۔ پرانی مشرقی تنقید میں اسے کلام تام اور کلام مفید کہا گیا ہے۔ متن کے معانی کا ماخذ کیا ہے، ان معانی کا تعین کرنے کا مجاز کون ہے، کن شرائط کے ساتھ؟ شرحیات و تعبیریات کا یہ بنیادی سوال ہے جو ان علوم کی پرانی اور نئی شکلوں میں برابر موجود رہا ہے۔ اس سوال کی برابر موجودگی کا مطلب یہ نہیں کہ اس سوال کو گہری سنجیدگی سے نہیں لیا گیا اور گاہے ماہے اس پر اچٹتی سے نگاہ ڈالی جاتی رہی ہے اور نہ یہ مطلب ہے کہ شرحیات و تعبیریات اور ادبی تنقید کو اب تک کوئی اعظم دماغ میسر نہیں آیا جو اس سوال کا تسلی بخش جواب دے سکتا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سوال جس قدر تعبیر و تنقید سے متعلق ہے اسی قدر انسان کے ادراک و تعقل میں تخلیقی عمل سے وابستہ ہے۔ ابتدائی سطح پر متن کی تعبیر، متن کے ادراک و تعقل کے مساوی ہے۔ لہٰذا متن کے معانی کا تعین ایک فلسفیانہ سوال بھی بن جاتا ہے اور اس سوال کے لائق توجہ جوابات دیے گئے ہیں۔

متن میں معنی کہاں سے آتے ہیں اور ان کی تفہیم اور تعیین کیوں کر ہو سکتی ہے؟ یہ سوال خود متن کے تصور سے جڑا ہوا ہے۔ یعنی متن کیا ہے، کیوں کر وجود میں آتا ہے؟ اس کے جواب میں متعدد ایسے اشارے مل جاتے ہیں جو پہلے سوال کے بعض جوابات فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً متن کا قدیم تصور کے مطابق یہ نثر یا نظم پر مشتمل وہ کتاب یا وہ الفاظ ہیں، جنھیں کسی مصنف کی اصل کتاب اور اصل الفاظ قرار دیا گیا ہو، نیز انھیں کتاب کے حاشیوں، تبصروں، اشاریوں وغیرہ سے الگ کیا گیا ہو۔ گویا متن مصنف سے مخصوص ہے اور اس متن پر حاشیے اور تبصرے کوئی دوسرا لکھتا ہے۔ چوں کہ متن کے قدیم تصور میں (اس میں مشرق و مغرب کی تخصیص نہیں) نہ تو متن کا تصور مصنف کے بغیر کیا جا سکتا ہے اور مصنف کے تصنیف کردہ متن میں کسی کو بھی تحریف، اضافے اور ترمیم کی اجازت ہے، گویا جو مصنف نے لکھ دیا وہی مستند ہے، اس لیے مصنف ہی متن کے معانی کا ماخذ ہے اور متن کے معانی کا تعین منشائے مصنف ہی سے ممکن ہے۔ اس تصور متن پر مذہبی متن کے تصور کا غلبہ کس قدر ہے۔ اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح مذہبی متن کی لغوی اور تمثیلی تعبیر میں منشائے الٰہی کو فوقیت حاصل ہوتی ہے اور مذہبی متن کی تعبیر و تفسیر میں اختلافات دراصل منشائے الٰہی کو متعین کرنے کی ان انسانی مساعی کا نتیجہ ہوتے ہیں جو خدا کی منشا کو ٹھیک ٹھیک جان لینے کا دعویٰ نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح بشری متون کی تعبیر میں ان متون کے مصنفین کے اصل منشا تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ عیسائی دنیا میں ادبی متون کی

تعبیر میں اول اول بائبل کی 'فقہی تنقید' کے اصولوں ہی کو مدنظر رکھا گیا اور مسلم دنیا میں ادبی متون کی تدوین میں تدوین حدیث کے اصولوں سے کام لیا گیا۔ گویا دونوں جگہ مصنف کو "آتھر گاڈ" سمجھا گیا۔

متن کے قدیم تصور میں سیاق کا مبہم احساس موجود ہے اور اسی کو متن کے معانی کا ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ یہ سیاق مصنف کا منشا ہے۔ منشائے مصنف تک رسائی کا کلیہ بھی سادہ ہے۔ اگر مصنف کے اصل الفاظ متعین ہو جائیں تو جو کچھ ان سے قبادر ہوتا ہے، وہی مصنف کا منشا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں منشائے مصنف کا تصور بے حد سادہ ہے اور یہ پوری طرح متن کے اصل الفاظ میں ظاہر ہے۔ اس تصور میں جو تناقض (پیراڈائس) موجود ہے، اس کی طرف دھیان نہیں۔ اگر منشا مصنف کا ہے تو اصولاً اسے مصنف کے شعور فاعلی میں موجود ہونا چاہیے۔ لہٰذا متن کی تعبیر اور متن کے معانی کے تعین میں اس شعور فاعل کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو متن سے پہلے اور متن سے باہر وجود رکھتا ہے۔ چوں کہ متن کے قدیم تصور میں اس پہلو کی طرف توجہ نہیں، اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جسے منشائے مصنف کہا جاتا ہے، وہ دراصل منشائے متن ہے۔

متن کے کلاسیکی تصور میں مذکورہ پہلو کی طرف ہمیں تھوڑی سی توجہ ملتی ہے۔ کلاسیکی شرقی تنقید میں متن کی جگہ کلام اور جملے کی اصطلاحیں برتی گئی ہیں۔ دونوں کو کم و بیش ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ جملے کو خبریہ اور انشائیہ میں تقسیم کیا گیا ہے۔ گویا خبریہ متن اور انشائیہ متن پر بحث کی گئی ہے۔ خبریہ متن میں صدق و کذب کا سوال اٹھایا گیا ہے۔ اس سوال پر بحث بڑی حد تک مصنف کے شعور فاعلی کی کارکردگی کو مس کرتی ہے۔ نجم الغنی رام پوری کے مطابق "صدق سے نفس الامر اور واقع کے مطابق ہونا ہے اور کذب یہ ہے کہ واقع اور نفس الامر کے ساتھ مطابقت نہ ہو۔"[1] یعنی خبریہ متن میں، متن کی خبر یا معنی کے تعین کے لیے، متن سے باہر اور متن سے پہلے مصنف کے شعور فاعلی کو بطور سیاق زیر بحث لایا جا سکتا ہے کہ صدق اور کذب اصلاً تصورات ہیں جو شعور ہی میں مرتب ہوتے ہیں۔ کلاسیکی شرقی تنقید میں یہ ایک بڑی تنقیدی بحث کا دروازہ تھا، جس پر فقط دستک دی گئی، اندر داخل ہونے کی کوشش کی جاتی تو تعبیر متن میں ایک عظیم پیش رفت ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ متن کا کلاسیکی تصور مذہبی اور ادبی متن میں حد فاصل کھینچنے کا نتیجہ ہے۔ یہ حدِ فاصل ہمیں متن کے سیاق کے تصور کو وسیع کرنے میں صاف نظر آتی ہے۔ قدیم تصور متن میں سیاق محض مصنف کا منشا تھا جو اس کے اصل الفاظ کے تعین کے بعد قبادر ہوتا چلا جاتا تھا۔ کلاسیکی تصور متن میں بھی منشائے مصنف کو متن کے معنی کا سرچشمہ قرار دیا جاتا ہے، مگر یہاں منشائے متن کا سیاق وہ شعور فاعلی ہے جس کے بارے میں حتمیت سے کوئی بات کہنا ممکن نہیں۔

صدق اور کذب کی بحث چھیڑنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ منشائے مصنف مطلق تصور نہیں ہے۔ اس میں ایک سے زیادہ گنجائشیں ہیں۔ حالی اصلیت کی بحث میں یہ نکتہ پیش کرتے ہیں:

> "جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے، وہ نفس الامر میں یا لوگوں کے عقیدے میں یا محض شاعر کے عندیے میں فی الواقع موجود ہے۔"[2]

گویا ادبی متن کے معانی کا ماخذ، مصنف کا وہ شعور فاعلی ہے جو نہ تو مطلق ہے اور نہ مرکزیت کا حامل ہے۔ حالی کی توضیح کے مطابق، اس میں نفس الامر اور لوگوں کے اعتقادات ہو سکتے ہیں۔ ان کا خالق مصنف نہیں، بلکہ محض ان کا حامل ہے۔ جہاں تک عندیہ کا تعلق ہے تو یہ درحقیقت، نفس الامر یا لوگوں کے اعتقادات سے متعلق مصنف کی رائے ہے۔ (عربی میں عندی کا مفہوم بھی 'میرے نزدیک' ہے)

لہٰذا مصنف کا عندیہ یا منشاء پہلے سے موجود تصورات حقیقت اور اعتقادات کے سیاق میں مرتب ہو رہا ہے۔ اسی طرح نفس الامر ایک مطلق تصور نہیں۔ ایک شاعر کے لیے جو بات نفس الامر ہے، دوسرے کے لیے وہ اضافی تصور ہے۔ مثلاً شاہ نیاز کا یہ شعر:

ادھر کی نہیں جانتے رسم و راہ
میاں! ہم تو باشندے ہیں پار کے

صوفیانہ اعتقاد میں نفس الامر کا درجہ رکھتا ہے۔ صوفیا پار یعنی اخروی زندگی پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور ادھر، یعنی دنیوی زندگی کی رسم و راہ سے علیحدہ رہتے ہیں۔ گویا صوفیا کے لیے ان دیکھی زندگی حقیقی اور نفس الامر ہے، مگر سائنسی تصور کائنات کے حامل شخص کے لیے ادھر کی زندگی ہی نفس الامر ہے اور اسی سے وہ رسم و راہ چاہتا ہے۔ چناں چہ وہ نفس الامر سے متعلق کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ یہی معاملہ اعتقادات کا ہے۔ تمام اعتقادات اضافی ہیں۔ کسی کے لیے ایک اعتقاد عین ایمان، دوسرے کے لیے عین گمراہی ہے۔ ایک کا صدق دوسرے کا کذب ہو سکتا ہے یا ایک بات ایک سیاق میں صدق، دوسرے سیاق میں وہی بات کذب ہو سکتی ہے۔ کہنے کا مقصود یہ ہے کہ مصنف کا وہ شعور فاعلی جو متن کی تخلیق کا ذمے دار ہے، مطلقیت اور مرکزیت نہیں رکھتا۔ اس میں نفس الامر کے ایک سے زائد تصورات اور مختلف اور بعض صورتوں میں باہم متصادم اعتقادات نہ صرف موجود ہو سکتے ہیں، بلکہ متن میں بھی مقلب ہو سکتے ہیں۔ یہ حقیقت متن کے معانی متعین کرنے کے لیے وسیع سیاق مہیا کرتی ہے۔ کلاسیکی مشرقی تنقید میں یہ ایک انقلابی تصور تھا۔ اگر اسے وسعت دی جاتی اور اس کی بنیاد پر باضابطہ نظریہ سازی کی جاتی تو متن کے اس جدید تصور تک رسائی حاصل کی جا سکتی تھی، جس کے مطابق متن کا سیاق ثقافت ہے اور مصنف کا شعور فاعلی زبان، روایت، اعتقادات، رسمیات کی آماج گاہ ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے متن کے کلاسیکی مشرقی تصور کا ایک اہم نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔ اس تصور کا ایک مضمر نکتہ یہ ہے کہ متن ایک 'بند نظام' نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر سمجھا گیا ہے۔ متن کی تخلیق کسی عدم اور غیاب سے نہیں ہوتی، بلکہ حقیقت کے تصورات، اعتقادات، ثقافتی رسمیات کے اس مجموعی نظام کے اندر ہوتی ہے جو کسی ثقافت میں، ایک تاریخی عہد میں مؤثر ہوتا ہے۔ مصنف اس مجموعی نظام کو خلق نہیں کرتا، اسے جذب کرتا ہے اور اس سے متعلق اپنا عندیہ، مافی الضمیر یا منشا مرتب کرتا ہے۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ جب مذکورہ 'مجموعی نظام' میں کسی ایک مقام پر مصنف اپنی نفسی قوت مرتکز کرتا اور خود کو اس کے ساتھ مشخص کرتا ہے تو وہ اپنا منشا مرتب کرنے میں کامیاب ہوتا ہے اور یہی منشا اس کے متن کے حدود متعین کرتا ہے۔ اس کے باوصف متن کے حدود مجموعی ثقافتی نظام سے ماورا نہیں ہوئے۔ ہم اس متن کے حدود اور ان حدود میں واقع معانی کے تعین کے لیے اس ثقافتی نظام ہی کو بالکل اسی طرح بنیادی حوالہ بناتے ہیں، جس طرح کسی لفظ کے معانی کے سلسلے میں متعلقہ زبان کو بہ طور سیاق سامنے رکھتے ہیں۔ متن کے اس تصور (کہ متن 'بند نظام' نہیں ہے) کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب کسی ثقافت کے اس مجموعی نظام میں بنیادی نوعیت کی تبدیلی رونما ہو جاتی ہے، جس میں متن تصنیف ہوا تھا، یا پھر متن کو کسی دوسری ثقافت پڑھا یا جانا مقصود ہو۔ مثلاً شاہ نیاز کے درج بالا شعر کا مفہوم تصوف سے عاری یا بے زار سماج میں سرے سے قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ اسے صوفیانہ تصور حقیقت کی حامل ثقافت ہی میں 'ڈی کوڈ' کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ شعر ایک بند نظام ہوتا تو اس کا کوئی سیاق نہ ہوتا۔ یا ہر سیاق میں یکساں طور پر قابل فہم ہوتا۔ یہ درست ہے کہ اس شعر کو ایک دوسرے تناظر میں پڑھا جا سکتا ہے اور اسے ایک غریب الوطن کی اجنبیت و علیحدگی (ایلی نیشن) کے مفہوم میں لیا جا سکتا ہے۔ مگر واضح رہے کہ اس صورت میں سیاق وہی رہتا ہے، تناظر تبدیل ہوتا ہے (دونوں کا فرق آگے آئے گا) متن کے سیاق میں مصنف کا عندیہ یا منشا کہیں کام دے سکتا ہے، مگر تناظر میں تو مصنف کا عندیہ یک سر منہا ہو جاتا ہے۔

متن کے کلاسیکی مشرقی تصور اور متن کے جدید مغربی تصور میں بنیادی نوعیت کا فرق نظر نہیں آتا۔ شاید اس لیے کہ ادبی متن کی ساخت ہر جگہ یکساں ہے۔ متن کا جدید مغربی تصور رولاں بارت کے مشہور مضمون ''مصنف کی موت'' میں پیش ہوا ہے۔ اسی مضمون کے درج ذیل حصے کو اب تک پیش کی گئی معروضات کی روشنی میں پڑھیے:

> ''ہمیں اب معلوم ہے کہ متن، واحد دینیاتی معنی (آتھرگاڈ کا پیغام) کے حامل لفظوں کی ایک سطر نہیں ہے۔ بلکہ ایک کثیر الجہاتی عرصہ (Space) ہے، جس میں متنوع تحریریں، جن میں سے کوئی انفرادی وحقیقی نہیں، آمیز اور متصادم ہوتی ہیں۔ متن ان حوالہ جات کا 'ٹشو' ہے جو ثقافت کے بے شمار مراکز سے اخذ کیے گئے ہوئے ہیں''۔[۴] (ترجمہ راقم)

جیسا کہ وضاحت کی جا چکی ہے، کلاسیکی مشرقی تصور متن، متن کے قدیم اور مذہبی تصور سے واضح انحراف تھا۔ مذہبی متن گاڈ اور قدیم تصور متن 'آتھرگاڈ' کی تخلیق سمجھا گیا ہے۔ لہٰذا دونوں کو صرف ان کے خالق کے منشا کی روشنی ہی میں پڑھا جانا چاہیے۔ یہاں منشا کے خالق ہی، متن کا بنیادی اور حتمی کوڈ اور سیاق اول و آخر ہے، مگر کلاسیکی تصور متن میں حقیقت کے ایک سے زائد تصورات، اعتقادات، رسمیات اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ انھی کے تانے بانے سے متن تخلیق ہوتا اور انھی کے بنیادی حوالے سے متن قابل فہم ہوتا ہے۔ اسی نکتے کی مدلل توضیح بارت نے کی ہے۔

بارت کی توضیح میں تین نکات اہم ہیں۔ ایک یہ کہ متن کثیر الجہاتی عرصہ ہے، ایک ایسا مکاں جس میں متعدد جہات ہیں۔ متن کی مکانیت اسے ایک جداگانہ اور قابل مشاہدہ شناخت ضرور دیتی ہے، مگر جہات کی کثرت، متن کی مکانیت کو 'پابند نظام' نہیں بننے دیتی۔ متن کی جہات دراصل متنوع تحریریں ہیں جنھیں نہ تو متن نے از خود اور نہ مصنف نے خلق کیا ہے۔ یہ مسلسل باہم ٹکرا رہی اور گلے مل رہی ہیں۔ نتیجے میں چنگاریاں پیدا ہو رہی ہیں، جلوے رونما ہو رہے ہیں۔ یعنی معنی کے عالم طلوع ہو رہے ہیں۔ یہ دوسرا نکتہ ہے۔ تیسرا نکتہ دراصل اس سوال کا جواب ہے کہ اگر معنی کے عالم کا خالق مصنف نہیں تو کون ہے۔ بارت کے نزدیک یہ ثقافت کے متعدد مراکز ہیں۔ انھی مراکز سے متنوع تحریریں برآمد ہوتی اور متن کا عرصہ تشکیل دیتی ہیں۔

ان معروضات کی روشنی میں غالب کے اس متن کا مطالعہ کیجیے:

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر، اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

شارحین غالب نے اس شعر کی تشریح و تعبیر میں طرح طرح کی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی کے نزدیک ''رونے اور ویرانی میں سوا نزک ربط ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسلسل آہ وزاری کی آواز سے اکتا کر لوگوں نے گھر چھوڑ دیا ہے اور ویرانی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ دوسرا اور زیادہ لطیف اشارہ یہ ہے کہ کثرت اشک باری نے سیلاب کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ سیلاب میں لوگ گھر سے نکل بھاگتے ہیں۔ سیلاب کی ویرانی سے ایک اور نکتہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب دوسروں نے گھر خالی کر دیا تو متکلم وہاں موجود کیا کر رہے ہیں۔''[۵] مشکور حسین یاد کے مطابق ''غالب نے زیر بحث شعر میں تنہائی کا ذکر واضح طور پر نہیں کیا لیکن اپنے گھر کی ویرانی کا ذکر اس زوردار انداز میں کیا ہے کہ اس میں ذات کی تنہائی بھی کھنچ کر آ گئی ہے۔ رونے کی صورت میں اس کا گھر سمندر بن گیا اور صبر کی صورت میں بیاباں..... مگر وہی بات اس کے گھر کی ویرانی سمندر کی ویرانی اور بیاباں کی ویرانی ہے۔''[۶] جب کہ پروفیسر رویلہ کی نظر میں ''ناصح نے شاعر سے کہا کہ اگر تم اس قدر نہ روتے تو تمہارا گھر ویران نہ ہوتا۔ اس پر شاعر

جواب دیتا ہے کہ نہیں ایسا نہیں۔ یہ گھر تو عاشق کا ہے۔اس کی قسمت میں ویرانی لکھی ہے۔اب ایسے دعوے کے ثبوت میں کہ نہ روتے تب بھی ویران ہوتا، شاعر یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ جہاں دریا نہ ہوتا، وہاں بیاباں ہوتا، یعنی اگر نہ روتے تو دشت نوردی اختیار کر لیتے اور پھر بیاباں ہوجاتا۔"[۱۲]

ایک ہی متن کی یہ تین مختلف تعبیریں ہیں۔تعبیروں کے اس اختلاف کی کئی وجوہ ہیں۔ایک وجہ یہ کہ شارح کا تناظر مختلف ہے۔ہر ایک نے اس متن کو اپنے زاویہ نظر سے دیکھا اور پڑھا ہے(تناظر کی بحث آگے آرہی ہے)دوسری وجہ اس اصول پر اتفاق ہے کہ ہر سخن چار چار طرفیں رکھتا ہے(بارت کے لفظوں میں کئی جہات رکھتا ہے)لہٰذا ہر شارح نے غالب کے متن کی نئی اور نادریافت طرف تک رسائی کی کوشش کی ہے۔تاہم اصل دیکھنے والی بات یہ ہے کہ متن غالب کی مختلف شرحوں کا ماخذ کیا ہے؟ شارح اپنی تعبیر یا شرح کیوں کر قائم کرتا اور اسے درست ثابت کرنے کے لیے دلائل کہاں سے لاتا ہے؟غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس متن کے معانی متعین کرنے کے تمام دلائل اس ثقافت سے لائے گئے ہیں، جس میں متن لکھا گیا تھا۔یا اب جس میں متن پڑھا جارہا ہے۔ اب جو شارح اس 'ثقافت' کا جتنا علم رکھتا ہے اور اس ثقافت کے ان مقامات اور مراکز کو نشان زد کرسکتا ہے، جن کا واضح یا مخفی رشتہ زیر بحث متن سے ہے، اس کی شرح اتنی ہی عمدہ اور قابل قبول ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ متن کی تعبیر کا سارا عمل، متن کی تشکیل سے متعلق تصور ہی سے انگیز ہوتا ہے۔مگر کیا مذکورہ بالا شرحوں میں متن کی تشکیل کے پورے تصور کو گرفت میں لے لیا گیا ہے۔اور اب اس متن کی کسی نئی تعبیر کی حاجت باقی نہیں؟اصل یہ ہے کہ غالب کے متن کی اکثر شرحوں کے مطالعے سے اس احساس کو تقویت ملتی ہے کہ یہ متن "پابند نظام" نہیں، ایک "کثیر الجہاتی عرصہ" ہے اور اس میں 'متنوع تحریریں' آمیز اور متصادم ہو رہی ہیں اور ان تحریروں کا ماخذ ثقافتی وشعریاتی مراکز ہیں، مگر اس کثیر الجہاتی عرصے کی پوری سیاحت نہیں کی گئی۔مثلاً زیر بحث متن میں ابھی کئی جہات توجہ طلب ہیں۔ایک یہ کہ اس متن میں کون متکلم ہے؟ضمیر 'ہمارا' کس کا تصور ابھارتا ہے، کیا یہ غالب ہیں؟ اگر غالب ہیں تو کیا بہ طور شخص ہیں یا شاعر؟ اگر بہ طور شخص ہیں تو کیا ایک فرد ہیں، کردار ہیں یا کسی ایک گروہ یا پوری نوع انسانی کے نمائندہ ہیں اور اگر شاعر ہیں تو کیا اپنی ذاتی شاعرانہ حیثیت میں گویا ہیں یا اردو شاعروں کے یا تمام شاعروں کے نمائندے کے طور پر؟ ہمارے پاس کیا قرینہ ہے یہ متعین کرنے کا کہ غالب بہ طور شخص تکلم کررہا ہے یا غالب بہ طور شاعر؟ ایک قرینہ یہ ہوسکتا ہے کہ تکلم کس سے ہے؟ کسی دوست سے، اردو غزل کے روایتی کردار ناصح سے، محبوب سے، اہل جہاں سے یا خود سے؟ ظاہر ہے یہ تمام باتیں متعین ہیں۔دوسرے لفظوں میں اس متن میں "انسانی آواز" تو موجود ہے، مگر کسی واحد تشخص کی حامل نہیں اور اس لیے نہیں کہ یہ کئی ثقافتی وشعریاتی مراکز سے وابستہ ہے۔بلاشبہ اس آواز کو تشخص دینے کی کوشش کی جاسکتی ہے، اسے قرینے سے غالب بہ طور شخص یا غالب بہ طور شاعر کی آواز قرار دیا جاسکتا ہے، مگر حتمی طور پر یہ کہنا ممکن نہیں کہ آخر یہ کس کی آواز ہے۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسے شخص کی آواز ہے، جسے یقین ہے کہ "گھر" نے ہر صورت ویران ہونا ہے۔وہ اپنے ہم وطنوں یا پڑوسیوں کو اطلاع دے رہا اور خبردار کررہا ہے۔یا ایک ایسے شاعر کی آواز ہے، جس کا اعتقاد ہے یا جسے یہ وژن حاصل ہے کہ انسانی مساعی کا حاصل بیابانی ہے۔وہ نوع انسانی سے مخاطب ہے مگر یہیں سے تعبیر متن کے مزید گھمبیر مسائل جنم لیتے ہیں۔پہلی اور دوسری صورت میں "گھر" سے کیا مراد ہے؟ جس طرح متن کی 'انسانی آواز' غیر متعین ہے، اسی طرح "گھر" کے معنیاتی اطراف کھلے ہیں۔کیا یہ گھر انسانی دل ہے یا آنکھ ہے، جس میں محبوب قیام کرتا اور بستا ہے یا وطن ہے، گھر کنایہ ہے یا مجاز مرسل؟ یا گھر سے مراد ارض ہے جہاں پوری نوع انسانی کا قیام ہے جو انسان کا عارضی ٹھکانہ ہے؟ کیا گھر علامت ہے؟ لطف کی بات یہ ہے

کہ یہ تمام باتیں یا معانی ممکن ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ پورے متن کے اطراف کھلے ہیں اور ہم جیسے جیسے اس متن کی قرأت کرتے جائیں گے مسلسل معنی ملتوی ہوتا جائے گا اور آخر میں ہمارا سامنا ایک انتشار سے ہوگا۔ اس متن کے معیاتی سلسلوں کو ایک ناقابل گرفت انتشار میں بدلنے سے جو بات روکتی ہے، وہ اس متن کا دوسرا مصرع ہے، جو دراصل ایک دلیل ہے۔ بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا۔ بیاباں، بے آباں سے مرکب ہے،، یعنی وہ صحرا یا دشت جو پانی نہ ہونے سے وجود میں آئے۔ گویا پانی کی افراط یا پانی کا قحط ایک ہی لازمی صورت پر منتج ہوتے ہیں جو ویرانی ہے۔ ہم متن کی تعبیر میں بحر اور بیاباں دونوں کو بہ طور استعارہ پیش نظر رکھ سکتے ہیں کہ فطری بلاؤں، بیماریوں، غربت، بدحالی کا سیلاب، نوآبادیاتی واستعماری تہذیب کا سیلاب وجود کی بے معنویت کا سیلاب، ہمارے وطن، ہمارے کلچر اور ہمارے وجود کو ملیامیٹ یا کھوکھلا کر دے گا۔

اس مقام پر سوال اٹھایا جانا چاہیے کہ متن کی ایک سے زائد تعبیروں کا جواز کیا ہے اور کیا ہم کسی ایک تعبیر کو درست اور دیگر کو غلط یا غیر ضروری قرار دینے کا فیصلہ کر سکتے، نیز کیا ہم یہ فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں؟

اولاً سوال کے پہلے حصے کو لیجیے۔ ادبی متن کی ایک سے زائد تعبیروں، کثرت معانی یا کلام کی پہلوداری کو عام طور پر پسند کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں، کسی متن کے جمالیاتی مرتبے کے تعین میں اسے ایک معیار کے طور پر بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ ادبی متن کی کثرت تعبیر اور کثرت معانی کے کئی اسباب بتائے جاتے ہیں جن میں ایک سبب متن میں علامت کی کارفرمائی ہے۔ گویا ایک خاص علامتی انداز میں اگر متن تشکیل دیا گیا ہو تو اس میں معنی کے امکانات زیادہ ہوں گے۔ چناں چہ زیادہ تر ابہام، بعید استعاروں اور غیر معروف علامتوں کے حامل متن ہی کو کثرت معانی کا حامل گردانا جاتا ہے اور اسی متن کی شرح وتعبیر پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔ اس امر کی نمایاں مثال کلام غالب کی ہے۔ حالانکہ ہر متن میں تعبیرات معانی کی کثرت ممکن ہے، صرف اس لیے نہیں کہ کوئی متن ابہام سے خالی نہیں ہوتا (ولیم ایمپسن کی ابہام کی سات قسمیں یاد کیجیے) بلکہ اس لیے بھی کہ کوئی متن الگ تھلگ (Isolated) نہیں ہوتا۔ وہ معنی کے اس جاری عمل کا حصہ ہوتا ہے جو متن کی تشکیل سے پہلے، متن کے باہر اور متن کی تشکیل کے بعد، زبان، ثقافت، تاریخ، آئیڈیالوجی وغیرہ میں رواں ہوتا ہے۔ اسی جانب ہلکا سا اشارہ یادگار غالب میں ملتا ہے۔ ''غالب اکثر کلام کی بنیاد ایسے جامع اور حاوی الفاظ پر رکھتے ہیں کہ قائل کا مقصود ایک معنی سے زیادہ نہ ہو مگر کلام اپنی عمومیت کے سبب بہت سے محمل رکھتا ہو''۔ [۷] گویا مشرقی علم بلاغت میں یہ اصول تسلیم کیا گیا ہے کہ مائل کا مقصود یا عندیہ کلام کی عمومیت میں بے نشاں ہو سکتا ہے۔ گویا مائل (یا شاعر) کے عندیے پر کلام کی عمومیت حاوی ہے۔ کیوں کہ حاوی ہے اس کا جواب ہمیں حالی کے یہاں نہیں ملتا، مگر اس بات پر زور بہ ہر حال ملتا ہے کہ متن، مصنف کے مقصود کو عبور کر جاتا ہے۔ ہمیں اس بات کا علم متن کی قرات ہی سے ملتا ہے۔ گویا نہ صرف مصنف کے عندیے سے ہٹ کر متن کی تعبیر کی جا سکتی ہے بلکہ ایک سے زائد تعبیریں بھی ممکن ہیں۔ اور جو بات زائد تعبیروں کو ممکن بناتی یا ان تعبیروں کا جواز ہوتی ہے، وہ کلام کی عمومیت ہے، جس پر مائل یا کسی دوسرے شخص کے واحد معنی کا پہرہ نہیں ہوتا۔ جو متن کی تشکیل سے پہلے زبان، روایت، شعریات، تاریخ میں موجود و کارفرما ہوتی ہے۔ عبدالسعید کے مطابق ''(متن) کی معناتی قوت ان عوامل کی مکلف مشروط ہوتی ہے جو اس سے باہر لیکن ہمیشہ اس سے مربوط ہوتے ہیں۔ یہ عوامل متن کا افق تعمیر کرتے ہیں۔ اس افق کے علاوہ متن تک رسائی کا کوئی دوسرا طریقہ ممکن نہیں۔'' [۸]

یہ بات طے ہے کہ متن کی تعبیر کے لیے متن کے افق سے رجوع لازم ہے، مگر متن کے افق کی اصطلاح مبہم ہے۔ اس میں متن سے باہر حوالہ جات کی طرف اشارہ موجود ہے لیکن یہ واضح نہیں کہ کس قسم کے حوالہ جات، کیا ہم متن سے باہر پوری زبان،

روایت شعریات اور پوری تاریخ کو متن کا افق قرار دے سکتے ہیں؟ اگر اس کا جواب ہاں میں دیں تو متن کی تعبیر کی کثرت کی کوئی حد ہی نہیں ہوگی۔ ہم متن کے ہر لفظ کے بیرونی حوالہ جات کی توضیح کرتے چلے جائیں اور آخر میں خود کو ایک عالم انتشار میں گھرا پائیں۔ ہمیں تعبیر کی کثرت اور تعبیر کے انتشار میں فرق کرنا چاہیے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب متن کے افق کی لامحدودیت کے تصور کو ترک کریں اور اس کے حدود مقرر کریں۔

متن کے حدود متعین کرنے کا مطلب دراصل متن کی تعبیر کے بعض طریقوں کی دریافت اور بعد ازاں ان کی جانچ ہے۔ دو طریقے بہ طور خاص قابل ذکر ہیں: متن کو سیاق میں پڑھا جائے یا تناظر میں۔ سیاق (Context) اور تناظر (Perspective) میں عام طور پر فرق نہیں کیا جاتا مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں وہی فرق ہے جو شے اور ناظر یا متن اور قاری میں ہے۔ سیاق کا تعلق متن سے اور تناظر کا قاری سے ہے۔ تاہم متن کی تعبیر میں دونوں کا کردار ہے۔ وزیر آغا جب کہتے ہیں کہ "تناظر کے بغیر کوئی معنی مرتب نہیں ہو سکتا..... (اور) تناظر کی تبدیلی سے معنی کی کائنات میں بھی (تبدیلی) در آتی ہے"[9] تو ان کا اشارہ سیاق اور تناظر دونوں کی طرف ہوتا ہے۔ تاہم واضح رہے کہ متن کی تعبیر میں دونوں کا کردار یکساں نہیں ہوتا۔ سیاق کی رو سے متن کی تعبیر میں ایک طرح کی معروضیت، جب کہ تناظر کی رو سے تعبیر متن میں ایک قسم کی موضوعیت ہوتی ہے۔

سیاق دراصل وہ علاقہ ہے جو متن سے فوری اور دور کی نسبت رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی تحریر اس علاقے کی وجہ ہی سے بہ طور متن قائم ہوتی ہے۔ اس علاقے سے متن کو کاٹ دیں تو متن کی حالت، صحرا میں بھٹکے مسافر کی سی ہو جائے گی۔ اس کی (معنی کی) سمت اور منزل اوجھل ہو جائے گی۔ سیاق ہی متن کو معنی کی سمت اور تعبیر کی امکانی منزل سے ہم کنار کرتا ہے۔ اور اگر سیاق کے علاقے کو نظر انداز کر دیں تو متن کی کسی بھی تناظر میں من مانی تعبیر کرنے کی راہ کھل جاتی ہے۔ ایک صورت میں متن، معنی سے تہی ہو جاتا اور دوسری صورت میں کسی بھی معنی سے وابستہ ہونے پر متن مجبور ہو جاتا ہے اور یہ متن کے استحصال کی مکروہ صورت ہوتی ہے۔ عام طور پر نوآبادیاتی اور آئیڈیالوجی سے بری طرح بوجھل معاشروں میں، متن کے سیاق کو نظر انداز کرنے اور من مرضی کے تناظر میں متن کی تعبیر کی روش توانا ہوتی ہے۔ لہٰذا سیاق اس بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ سرحد کی طرح ہے، جسے پامال کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ اور بات ہے کہ اسے اکثر پامال کیا جاتا ہے۔ تناظر بدمست ہاتھی کی طرح سیاق کے سبز میدانوں کو روندتا چلا جاتا ہے۔

سیاق کی متن سے فوری اور دور کی نسبت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر متن کا سیاق اول (Cotext) اور سیاق دوم (Context) ہوتا ہے۔ سیاق اول متن کے پہلو میں اور سیاق دوم متن سے ذرا فاصلے پر ہوتا ہے۔ قربت و دوری سے فرق نہیں پڑتا۔ دونوں یکساں طور پر موثر ہوتے ہیں۔ اقبال کی فارسی شاعری کا پس ساختیاتی مطالعہ کرنے والے جرمن نقاد سٹیفن پاپ نے سیاق اول و دوم میں فرق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سیاق اول کا اطلاق اس سیاق پر ہوتا ہے جو کسی متن کے بالکل ساتھ ظاہر ہوتا ہے جب کہ سیاق دوم حوالہ جات کے اس وسیع علاقے سے متعلق ہوتا ہے جس کی طرف متن کا رخ ہوتا ہے، مگر وہ متن کا حصہ نہیں ہوتا[10] گویا دونوں میں موٹا فرق یہ ہے کہ پہلا تحریری ہوتا، متن کے وجود کا حصہ ہوتا ہے، جب کہ دوسرا غیر تحریری ہوتا اور متن سے باہر ہوتا، یعنی معنی کا وہ جاری عمل ہوتا ہے جس سے ثقافت، تاریخ، شعریات، روایت وغیرہ عبارت ہوتی ہے اور جس کی طرف متن میں اشارے یا کوڈ موجود ہوتے ہیں۔

سیاق اول میں یہ اشارے شامل ہیں:

۱۔ وہ شخصی، تاریخی، اساطیری واقعہ جو اپنی غیر تحریری صورت میں متن میں موجود ہو اور جسے پیش نظر رکھے بغیر متن کا انتہائی

بنیادی مفہوم یعنی Sense متعین نہ ہو سکے۔

ب۔ لفظیات، استعاروں اور علامتوں کی وہ مخصوص صورت جو کسی متن کے خالق سے مخصوص ہو۔ جدید یعنی ماڈرن اسٹ متن میں اس سیاق کو ملحوظ رکھنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے، جب کہ کلاسیکی متن میں اس سیاق کو ایک دوسرے انداز میں پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ کلاسیکی متن لفظیات و علامات کے مجموعی نظام کو بروئے کار لاتا ہے۔ یہاں مصنف ''معنی آفرینی'' کا مظاہر کرتے ہوئے مجموعی علاقی نظام میں اپنی تخلیقی بساط کے مطابق گنجائش پیدا کرتا ہے۔

گویا سیاق اول محدود، فوری، منسلک اور مصنف سے متعلق ہوتا ہے، جب کہ سیاق دوم وسیع، مصنف سے منقطع، روایت، شعریات، ثقافت اور اے پس ٹم سے متعلق ہوتا ہے۔ گزشتہ صفحات میں جس مجموعی ثقافتی نظام اور معنی کے جاری عمل کا ذکر ہوا ہے، وہ دراصل متن کا سیاق دوم ہی ہے۔

بلاشبہ سیاق اول متن کو قابل فہم بناتا، اس کا بنیادی مفہوم متعین کرتا ہے لیکن اگر قرات متن خود کو سیاق اول تک محدود کر لے اور آگے بڑھنے سے معذوری ظاہر کرے یا آگے بڑھنے کو غیر ضروری خیال کرے تو ادبی متن روزمرہ کے عام واقعے کا بھونڈا لسانی اظہار بن کر رہ جائے، گویا اپنی روح، اپنی ادبیت سے محروم ہو جائے، محض ایک خیال کی مشکل ترسیل تک محدود ہو جائے۔ مثلاً اگر ہم گزشتہ صفحات میں زیر بحث لائے گئے غالب کے شعر کی قرأت سیاق اول کی روشنی میں کریں تو ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکیں گے کہ غالب کہتے ہیں کہ ہمارا گھر، ہمارے رونے سے ویران نہیں ہوا۔ ہم نہ روتے، تب بھی یہ ویران ہی ہوتا کہ (ہمارے رونے سے جہاں) دریا بنا ہے، یہ دریا نہ ہوتا تو یہاں بیاباں ہوتا۔ غالب کے دیگر اشعار میں بھی رونے کا مضمون باندھا گیا ہے۔ مثلاً:

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

اللہ اللہ خیر صلا۔ غالب کی ابتدائی شرحوں میں بس یہی کچھ ملتا ہے اور ظاہر ہے نتیجہ ہے سیاق اول تک محدود رہنے کا۔

سیاق اول تک متن کو محدود کرنے کا لازمی نتیجہ اسے ایک مشکل لسانی اظہار میں بدل دینا ہے۔ یہی دیکھیے، غالب کے شعر کی مندرجہ بالا قرات، شعر کی بنیادی Sense تو پیش کرتی ہے مگر ہم خود کو اگر یہیں تک محدود کر لیں تو شعر کی سینس ایک مشکل صورت میں ڈھل جائے گی۔ غالب نے رو رو کر دریا بہا دیا اور دریا نے غالب کا گھر مسمار اور ویران کر دیا۔ اسے نہ تو امر واقعہ قرار دیا جا سکتا ہے نہ لوگوں کا عقیدہ۔ اپنی پابند اور الگ تھلگ صورت میں شعر کی سنس بالآخر بے معنی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا سیاق دوم کی ضرورت پیش آتی ہے۔ سیاق دوم ہی وہ 'عرصہ' ہے جس میں ایک طرف متن کی سینس، ایک مکمل، قابل لحاظ معنی، (سینس اور معنی کا فرق پیش نظر رہے) میں بدلتی ہے اور دوسری طرف اس مکمل معنی کی ایک سے زائد تعبیریں ممکن ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سیاق دوم ہی ہے جو ہر قسم کے متن کو ڈی کوڈ کرنے کا جامع تجزیاتی نظام رکھتا ہے۔ سیاق اول کی سطح پر ہر قسم کے لسانی متون کا معاملہ کم و بیش یکساں ہوتا ہے؛ ان میں فرق سیاق دوم کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً رونے کا پہلا سیاق ایک ہی ہے، جس سے اس مصدر کی بنیادی 'سینس' قائم ہوتی ہے۔ مگر تصوف، طب، عشق اور شاعری کے سیاق دوم میں اس کے مفاہیم بدل جاتے ہیں۔ وٹ گنسٹائن جب ہر شعبہ علم اور فن کی زبان الگ الگ قرار دیتا ہے اور زبان کے اسی جداگانہ تصور کی روشنی میں ہر شعبہ علم و فن کے اقوال، تصورات اور نظریات کی قرأت پر زور دیتا ہے تو وہ حقیقتاً سیاق دوم کو بہر صورت پیش نظر رکھنے کی ضرورت اجاگر کرتا ہے۔ اگر آپ کسی تصور، قول، عقیدے، علامت یا اصطلاح کو کسی دوسرے سیاق (دوم) میں کھینچ کے لے جاتے تو یہ عمل بالکل ایسا ہی ہے کہ بہرے کو موسیقی

سنوارنے کی کوشش کی جائے۔

سیاق اول کے حدود جس قدر واضح اور بین ہوتے ہیں سیاق دوم کے حدود اسی قدر دھندلے ہوتے ہیں۔ چناں چہ آپ جوں ہی سیاق اول کو عبور کر کے، یعنی متن کی بنیادی سینس متعین کر کے سیاق دوم میں قدم رکھتے ہیں تو آپ کا سامنا ایک غیر متعین مگر امکانات سے لبریز صورت حال سے ہوتا ہے۔ معنی کے جاری عمل کا ایک ایسا بہاؤ ہوتا ہے، جس میں کسی ایک مقام پر رکنا محال ہوتا ہے۔ گزشتہ صفحات میں غالب کے متن سے متعلق جس کثیر الجہاتی معیاتی صورت حال کا ذکر ہوا ہے، وہ سیاق دوم ہی کی دین ہے۔ کسی ایک مقام پر رکنے کا مطلب، متن کا واحد معنی متعین کر لینا ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے، جب متن کی بنیادی سینس ہی کو متن کی کل معیاتی کائنات تصور کر لیا جائے یا پھر سیاق دوم کا نہایت سطحی مفہوم پیش نظر رکھا جائے ___ چوں کہ سیاق دوم غیر متعین صورت حال ہے اس لیے یہ تعبیر طلب ہے۔ دوسرے لفظوں میں سیاق دوم، متن کی تعبیرات کا ایک زرخیز علاقہ ہے یہاں متن کی لامحدود تعبیرات کا امکان پوری قوت سے موجود ہوتا ہے اور بعض معبر اس امکان کے طلسم میں گرفتار ہو کر متن کی تعبیر در تعبیر کے لامتناہی سلسلے کی گرفت میں آ سکتے ہیں؛ وہ متن کے حوالہ جات کے لامحدود ثقافتی مراکز کی نشان دہی کرتے چلے جانے کی مشق کر سکتے ہیں، مگر حقیقتاً یہ عمل تعبیری نہیں، مختلف شعبہ علم وفن کے سیاق کو گڈمڈ کرنے کا عمل ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کی واحد صورت متن کی بنیادی سینس کی بنیاد پر متن کی تعبیر کرنا ہے۔ گویا سیاق دوم میں مضمر صرف انھی معیاتی امکانات کو بروئے کار لانا ہے جس کی طرف متن کی بنیادی سینس (متن کے اجزا نہیں) اشارہ کرتی ہے۔

سیاق کی بنیاد پر متن کی تعبیر "ادراک تعقل سے پہلے ہے" کے اصول کے تابع ہے، جب کہ تناظر کی رو سے متن کی تعبیر میں یہی اصول الٹ جاتا ہے۔ تعقل ادراک سے پہلے ہے۔ پہلی صورت میں متن کو فوقیت حاصل ہے، جب کہ دوسری صورت میں قاری کو۔ تناظر یعنی Perspective ناظر اور قاری کا وہ زاویہ نظر ہے جو کسی متن کی تعبیر اور تجزیے سے نہ صرف پہلے موجود ہوتا ہے بلکہ اسی کی روشنی میں تعبیر کا پورا عمل انجام پاتا ہے۔ "سیاق اساس تعبیر" میں قاری کی اپنے نقطہ نظر سے علیحدگی یا اپنے اعتقادات کو معطل رکھنے کی لازمی شرط موجود ہوتی ہے اور "تناظر اساس تعبیر" میں قاری کے نقطہ نظر اور اعتقادات کا نہ صرف اثبات کیا جاتا ہے، بلکہ ان کی روشنی میں متن کے معانی کا کہیں تعین اور کہیں تنقیدی جائزہ لیا جاتا ہے۔ "سیاق اساس تعبیر" میں صرف امکانات دریافت کیے جاتے، جب کہ "تناظر اساس تعبیر" میں نئے امکانات تخلیق کیے جاتے ہیں۔ "سیاق اساس تعبیر" بڑی حد تک سائنسی ہے، متن کی اصل صورت حال کی دریافت ہے، جب کہ "تناظر اساس تعبیر" بڑی حد تک "تنقیدی سائنس" ہے، متن کی نئی ممکنہ صورت حال کی تشکیل ہے۔ پہلی قسم کی تعبیر، متن کو اس کی بنیادی ثقافتی و شعریاتی فضا میں قابل فہم بنانے کی کوشش ہے اور دوسری قسم کی تعبیر، متن کو نئی ثقافتی و شعریاتی فضا میں (جسے ادب کے نئے قاری نے جذب کر رکھا ہے) قابل قبول یا قابل استرداد بنانے کی کوشش ہے۔

سیاق اساس اور متن اساس، دونوں قسم کی تعبیرات میں متن کی بنیادی سینس کو قائم رکھا جاتا ہے۔ گویا یہ واحد نکتہ ہے جس پر دونوں کو اتفاق ہے، مگر یہی وہ نکتہ بھی ہے جہاں سے اختلافات کا آغاز ہوتا ہے۔

تناظر اساس تعبیر دو تین صورتیں اختیار کرتی ہے۔ ایک یہ کہ متن کی بنیادی سینس کو نئے علمی، سائنسی اور ثقافتی تناظر میں قابل فہم بنایا جائے۔ اس نوع کی تعبیر کی ضرورت وہاں پیش آتی ہے جہاں متن کلی یا جزوی طور پر نئے تناظر میں اجنبیت، فکری یا شعریاتی فاصلے کا احساس دلائے۔ یہاں تعبیر کا مقصد اس فاصلے کو گھٹانا اور اگر ممکن ہو تو ختم کرنا ہوتا ہے۔ اس تعبیر کی صورت کم و بیش

وہی ہے جس پر علم کلام کی بنیاد ہے۔ مذہبی اعتقادات کی معاصر فلسفیانہ اور سائنسی تناظر میں توجیہ کرنا، ان اعتقادات کی اصل کو قائم رکھتے ہوئے، ان سے متعلق تشکیک رفع کرنا۔ شمس الرحمٰن فاروقی، غالب کے مصرعے: بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا، کی اسی نوع کی تعبیر کرتے ہیں۔ "جدید علم الارض ایسے بہت سے صحراؤں سے واقف ہے جو پہلے سمندر تھے، لیکن بعد میں ریگستان بن گئے ...... لہٰذا 'بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا' محض تخیلی توجیہ نہیں بلکہ منطقی مشاہدہ بھی ہے۔ ظاہر ہے غالب اس سائنسی حقیقت سے واقف نہ تھے، ان کا علم وجدانی تھا۔[۱۱] گویا اس تعبیر کے ذریعے علم کے وجدانی اور سائنسی ذریعے کے درمیان موجود فاصلے کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور دوسری طرف وجدانی ذریعہ علم کا تفوق باور کرانے کی سعی کی گئی ہے کہ یہ ذریعہ آنے والے زمانوں کو دیکھ لینے پر قادر ہے۔

تناظر اساس تعبیر کی دوسری صورت ہے کہ متن کو ایک ایسی علامت سمجھا جائے جس کی کسی ایک پرت یا عام فہم سینس اپنے زمانۂ تخلیق میں روشن ہو، مگر نئے تناظر میں علامت متن کے نئے گوشے منور ہوئے ہوں۔ یہاں تناظر روشنی کی ایسی کرن بن جاتا ہے جو متن کی تاریکی میں ملفوف تہوں کو روشن کرتی چلی جاتی ہے۔ اس وضع کی تعبیر میں متن سے متعلق تشکیک کے بجائے متن کی علامتی گہرائی کی بابت یقین قوی ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی تعبیر کی اہم مثال وزیر آغا نے غالب کے ایک دوسرے متن (آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں / غالب، صریر خامہ نوائے سروش ہے) کی تعبیر میں پیش کی ہے۔

> "غالب کے (اس) شعر کے عام فہم مفہوم کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب تخلیق کار کے قلم کی آواز کو نوائے سروش گردانتا ہے اور تخلیق کار کو محض ایک ذریعہ سمجھتا ہے، جسے 'مضمون' اپنے اظہار کے لیے بروئے کار لاتا ہے، لیکن اس شعر کے اطراف کھولنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ غالب نے تخلیق کاری کے عمل کو محض خوشہ چینی کا عمل قرار نہیں دیا۔ اس نے اس کے چار مراحل کا ذکر کیا ہے، پہلا "غائب" کا مرحلہ جو تحریر اور تقریر، دونوں سے ماورا ہے۔ دوسرا تحریر کا مرحلہ جب عبارت کو نقطوں، لکیروں، قوسوں، Traces اور Tracks کی صورت، غیب کے ناموجود پہ بطور خاکہ نمودار ہوتی ہے۔ اس کے بعد "خیال" کا مرحلہ جب اس خاکے پر تصویریں ثبت ہیں۔ چوتھا مرحلہ ترسیل کا ہے، جب آواز تحریر کو دوسروں تک پہنچاتی ہے جیسے آر۔ این۔ اے، ڈی۔ این۔ اے کی ترسیل کرتا ہے ...... غالب کے اس شعر میں تحریر کو مقدم اور افضل قرار دینے کی جو جہت نمودار ہوئی ہے، اس سے شعر کے عام مفہوم میں نئے ابعاد پیدا ہو گئے ہیں۔"[۱۲]

تناظر اساس تعبیر کی ان دونوں صورتوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں معاصر علمی، فلسفیانہ، تنقیدی، سائنسی بصیرتوں کو بروئے کار لاتی ہیں۔ اس اعتبار سے تناظر اجتماعی ہوتا ہے۔ اجتماعی تناظر کو اپنے عہد کی روح عصر یا ایپس میم خیال کر کے قبول کیا جاتا ہے۔ اسے کم و بیش وہی درجہ دیا جاتا ہے، جسے کانٹ "آفاقی موضوعیت" کا نام دیتا ہے۔ آفاقی موضوعیت وہ قبل تجربی تعقلاتی زمرہ ہے، جو کسی شے یا مظہر کے ادراک سے پہلے انسانی ذہن میں موجود ہوتا ہے اور ادراک کو نہ صرف ممکن بناتا ہے، حسی تاثرات کے انتشار کو ایک نظم میں بدلتا ہے، بلکہ اشیا کے ادراک کو خاص صورت بھی دیتا ہے۔ اجتماعی تناظر کو ہم ثقافتی موضوعیت کا نام دے سکتے ہیں۔ یہ ماضی کے اور معاصر ادبی متون کو اپنی زبان یا اپنے پیراڈائم کے تحت دیکھتی اور ان کا وہی مفہوم مرتب کرتی ہے، جس کا بلیو پرنٹ، ثقافتی موضوعیت میں موجود ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے دل چسپ بات یہ ہے کہ اجتماعی تناظر یا ثقافتی

موضوعیت پر عموماً کوئی سوال قائم نہیں کیا جاتا ۔اسے ایک ثابت شدہ صداقت سمجھا جاتا اور دنیا اور متن سے معاملہ کرنے والی اپنی روح کو اس کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے۔ گویا ثقافتی موضوعیت، ایک اتھارٹی اور ادارے کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جسے تسلیم کرنے کے علاوہ کسی دوسری صورت کی طرف دھیان تک نہیں جاتا ۔چناں چہ اس کی بنیاد پر کی جانے والی تعبیرات کو خوش دلی سے تسلیم ہی نہیں کیا جاتا، انھیں موزوں ترین، بہترین اور مستند بھی خیال کیا جاتا ہے۔

مذکورہ تناظر اساس تعبیرات کا خالص ادبی اور جمالیاتی معرف تو ظاہر ہے، ادبی متون کی وجدانی، تخیلی اور علامتی گرہوں کی کشود سے ادبی متن کی عظمت اور معاصر فکری تناظر میں معقولیت کا احساس راسخ ہوتا ہے جو بعد ازاں نئے ادبی متون کی تخلیق پر بھی اثر انداز ہوتا ہے ۔ان تعبیرات کا سماجی معرف بھی ہوتا ہے۔ معاصر فکری تناظر کو سماجی سطح پر استحکام حاصل ہوتا ہے۔ سماجی و ثقافتی سوالات کو سمجھنے اور حل کرنے میں مذکورہ ثقافتی موضوعیت سے کام لینے کی عمومی روش وجود میں آتی ہے۔

تناظر اساس تعبیر کی تیسری صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب معاصر ثقافتی موضوعیت سے انحراف کیا جاتا اور دنیا، سماج، ادب، تاریخ اور ثقافت سے متعلق نئے سوالات قائم کیے جاتے ہیں۔ ہر چند ان سوالات کا متن کی تعبیر میں وہی طریق کار ہوتا ہے، جو ثقافتی موضوعیت یا اجتماعی تناظر کا ہوتا ہے: یہ سوالات قبل تجربی تعقلاتی زمرے کی مانند ہوتے اور متن کی تعبیر کا خاص خاکہ رکھتے ہیں، مگر ان کا کردار اور نتیجہ مختلف ہوتا ہے۔ ثقافتی موضوعیت اتھارٹی کا تصور راسخ کرتی ہے، مگر یہ تعبیر اتھارٹی سے آزادی دلانے کی سعی کرتی ہے۔ تناظر اساس تعبیر کی پہلی دونوں صورتوں میں متن کی بنیادی سینس کے احترام کا رویہ ہوتا اور اس کی تعبیر میں دراصل اس سینس کی توسیع کا اہتمام ہوتا ہے، جب کہ تیسری صورت میں متن کی سینس معرض سوال میں آتی ہے۔ چنانچہ اس کی معنیاتی و تعبیراتی توسیع کے بجائے، اس کی سماجی، نفسیاتی، ثقافتی، سیاسی معنویت کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔ اس وضع کی تعبیر کی کلاسیکی مثالوں میں مابعد نوآبادیاتی اور تانیثی تناظر میں کیے گئے مطالعات پیش کیے جاسکتے ہیں۔ ان مطالعات کی بنیادی حکمت عملی متن کے سیاق کا تنقیدی تجزیہ کرنا ہے۔ سیاق اساس تعبیر میں فقط سیاق میں مضمر معنیاتی امکانات دریافت کیے جاتے، مگر تناظر اساس تعبیر کی تیسری صورت میں ان معنیاتی امکانات کی تاریخی اور انسانی معنویت کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور ان آئیڈیالوجیکل حصاروں کو نشان زد اور مسمار کیا جاتا ہے۔ جو متن کے سیاق میں نامحسوس انداز میں مضمر ہوتے ہیں۔

آخر میں اس سوال پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے کہ سیاق اساس اور متن اساس تعبیرات کے اژدحام کو ایک پریشان کن صورت حال سمجھ کر اس سے بچنے کی تدبیر کرنی چاہیے یا تعبیرات کی کثرت کو ادبی متن کی ادبیت اور روح خیال کر کے، قبول کر لینا چاہیے؟ یعنی ہمیں متن کی کسی ایک تعبیر پر اتفاق کر لینا چاہیے یا مختلف و متعدد تعبیروں کو یکساں طور پر اہم سمجھنے پر اتفاق کر لینا چاہیے؟ اس ضمن میں ای۔ڈی۔ ہرش کی رائے ہے کہ ہمیں متن کی فقط ایک تعبیر پر اتفاق کرنا چاہیے۔ وہ اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ متن میں معنی تناظر ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک تناظر مصنف (یعنی اس کا منشا) ہے۔ گویا وہی تعبیر مستند اور جائز ہے، جس کی تائید مصنف کے منشا سے ہوتی ہے [۲۱]۔ ہرش کی رائے کس قدر سادہ اور معصومانہ ہے، شاید اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ متن اور سیاق کی بحث میں تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے، مصنف کا منشا تو متن سازی کے عمل ہی میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ متن، معنی کے اس جاری عمل کا حصہ ہوتا ہے، جس پر کسی ایک شخص کا اجارہ ہوتا ہی نہیں اور اگر ہم اس اجارے کو قبول کر بھی لیں تو متن کی تعبیر کا عمل شروع کرتے ہی، متن کی شعریاتی اور ثقافتی حوالہ جات کا نظام ہمارے روبرو ہوتا ہے۔ علم تعبیر کے ایک دوسرے عالم شلئےفش کی

رائے ہے کہ ''متن تعبیر کا (جاری) عمل ہے نہ کہ متن کی تعبیروں پر اتفاق کا مقام ہے۔ متن میں (تعبیروں پر) اتفاق کی کوئی موجود ہی نہیں''۔ [۱۴] اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب ایک تعبیر پر دوسری تعبیر کو ترجیح دی جاتی ہے تو اس لیے نہیں کہ دوسری تعبیر متن کے حقائق سے زیادہ ہم آہنگ ہے، بلکہ اس لیے کہ اختیار کیے جانے والے سیاق یا تناظر کا مفروضہ متن کے حقائق کو خود سے ہم آہنگ پاتا ہے۔ یعنی ایک تعبیر پر دوسری تعبیر کو فوقیت دینے کی اصل وجہ سیاق یا تناظر ہے۔ لہٰذا جب ایک ادبی عہد میں یا ایک نقاد/معبر کے یہاں جس سیاق یا تناظر کو اہمیت حاصل ہوگی، اس کی روشنی میں کی گئی تعبیر یا تعبیروں کو بھی فوقیت حاصل ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں تعبیرات کے ازدحام اور کثرت سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں اور اس بات کی ساری ذمے داری خود ادبی متن پر عائد ہوتی ہے جس نے خود کو سیاق اول و دوم کے غیر پابند نظام کا حصہ بنا رکھا اور تناظر کے آگے اپنا بند قبا اور اطراف کھلے رکھے ہیں۔

حواشی

۱۔ نجم الغنی رام پوری، بحر الفصاحت، حصہ چہارم (مرتبہ سید قدرت نقوی) لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۴ء، ص ۱۵

۲۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری (مرتبہ وحید قریشی) علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۱

۳۔ رولاں بارت، ''مصنف کی موت'' مشمولہ Modern Grifiasm and Theory (مرتبہ ڈیوڈ لاج) دہلی: پیئرسن ایجوکیشن، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۹

۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی، تفہیم غالب، لاہور: اظہار سنز، س ن، ص ۹۴

۵۔ مشکور حسین یاد، غالب بوطیقا، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۱۹۹۸ء، ص ۵۲

۶۔ پرتو روہیلہ، مشکلات غالب، لاہور: نقوش پریس، س ن، ص ۷۷

۷۔ الطاف حسین حالی، یادگار غالب، لاہور: کشمیر کتاب گھر، س ن، ص ۱۰۱

۸۔ سید عبدالسعید، ''شرحیات بحیثیت مکالمہ: ایک تعبیر'' مشمولہ علم شرح، تعبیر اور تدریس متن (مرتبہ نعیم احمد) علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی، ۱۹۹۵ء، ص ۷۱۔۷۲

۹۔ وزیر آغا، معنی اور تناظر، سرگودھا: مکتبہ اردو زبان، ۱۹۹۸ء، ص ۱۹

۱۰۔ سٹیفن پاپ نے یہ فرق ایک دوسرے جرمن نقاد Rudiger Zymer کے حوالے سے کیا ہے۔ اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"As the Word "Context" is ambiguous in ordinary speech, 'context will refer to that writhen context that appears immidiately at the side of a text, and context to the wider range of references that the text refers to but are not part of the text itself."

(Muhammad Iqbal's Romantiazing of power، ۲ مئی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱)

۱۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، تفہیم غالب (محولہ بالا)، ص ۶۵۔۶۶

۱۲۔ وزیر آغا، غالب کے ایک شعر کا پس ساختیاتی تجزیہ، مشمولہ مابعد جدیدیت: اطلاقی جہات (مرتبہ ناصر عباس نیر) لاہور: مغربی پاکستان اردو اکادمی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۰

۱۳۔ تفصیلی بحث کے لیے برش کا مقالہ ''ناقص تناظرات'' (Faulty Perspectives) دیکھیے جو ڈیوڈ لاج کی مرتبہ کتاب ''ماڈرن کریٹیسزم اینڈ تھیوری'' میں ص ۲۳۱ تا ۲۴۰ شامل ہے۔

۱۴۔ سٹینلے فش، Is there a text in this class، امریکا: ہارورڈ یونیورسٹی، ۱۹۸۰ء، ص ۳۴۷

لاہور میں مشاعرے

ڈاکٹر سلیم اختر

جہاں تک لاہور میں مشاعروں کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہ اساسی حقیقت ملحوظ رہے کہ حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کے نتیجہ میں اب یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اردو زبان کی تشکیل پنجاب میں ہوئی۔ جیسے جیسے زبان ترقی کرتی گئی، ادبی شعور بھی فروغ پاتا گیا اور شاعری کی صورت میں زبان کی تخلیقی استعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ لہٰذا شاعری کے فروغ کے ساتھ ساتھ مشاعروں کا انعقاد لازم تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی، لکھنؤ اور دیگر علاقوں کے افراد نے بسلسلہ روزگار لاہور کو اپنا مسکن بنایا تو وہ اردو شاعری اور مشاعرہ بھی اپنے ساتھ لائے ہوں گے اور یوں پہلی مرتبہ پنجابی اردو زبان کی حلاوت، غزل کے ذائقہ اور مشاعرہ کے چسکے سے آگاہ ہوئے ہوں گے۔ کنھیا لال ہندی نے اپنی تالیف "تاریخ لاہور" میں لاہور کے شعراء کے ضمن میں یہ لکھا:

> "لاہور کے شعراء میں سے بہ عہد سکھی مولوی غلام حسن تخلص خورم و مولوی فرید الدین و مولوی احمد بخش بلال و فیض بخش تخلص فیض تھا۔ مولوی خورم فارسی شعر، غزل و ریختہ و مثنوی عمدہ لکھتا تھا۔ مولوی فرید سکھوں کے وقت ایک بڑا شاعر مانا جاتا تھا، اشعار فارسی و اردو اچھے پُر مضمون لکھتا تھا۔ تاریخ گوئی میں بھی اس کو کامل استعداد تھی۔ موجودہ شعرا میں سے ایک تو معمر رام داس تخلص قانل خلفِ بیلی رام خزانچی مہاراجہ رنجیت سنگھ ہے...... دوم مفتی غلام سرور، یہ شخص اردو فارسی نظم قابلِ تحسین لکھتا ہے...... خاص لاہور کے رہنے والے شاعروں میں سے اور کوئی شاعر نہیں ہے البتہ اور ملکوں کے آئے ہوئے شعرا مثل مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ لاہور میں سکونت پذیر ہیں اور موضع نواں کوٹ میں ایک شاعر فضل شاہ نام رہتا ہے۔ بہت کتابیں عشقیہ پنجابی زبان میں اس نے لکھی ہیں۔" (ص: ۹۹)

آج اس نوع کی معلومات دستیاب نہیں جن سے اس امر کا تعین کیا جا سکے کہ لاہور میں سب سے پہلا مشاعرہ کب منعقد ہوا لیکن انجمن پنجاب کے مشاعروں کے بارے میں اب معلومات عام ہیں۔ حکومت پنجاب نے ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو انجمن پنجاب قائم کی جس کا مقصد صوبے میں علم و ادب کا فروغ تھا۔ اس انجمن کی تاریخ ادب اردو میں اس بنا پر اہمیت ہے کہ اردو زبان میں پہلی مرتبہ نظم کے مشاعرہ کی طرح ڈالی گئی۔ غزل کے مشاعرہ میں مصرع طرح دینے کے برعکس انجمن پنجاب کے مشاعروں میں دیے گئے عنوان پر نظم لکھی جاتی تھی۔ برسات، امید، زمستان، حب وطن، امن، انصاف، مروت، قناعت، تہذیب اور شرافتِ انسانی یہ تھے وہ موضوعات جن پر نظمیں لکھی گئیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ نظموں کے ان مشاعروں کی ملک گیر مخالفت ہوئی۔ طرزِ کہن پر اڑنے والوں کے بموجب یہ

مشاعرے غزل کے خاتمہ کے لیے تھے، غزل کے خاتمہ کا مطلب مشرقی تہذیب کا اختتام تھا لہٰذا مخالفت کی وجہ سے دس ماہ بعد یہ مشاعرے ختم کر دیے گئے۔ جون ۱۸۷۴ء سے مارچ ۱۸۷۵ء تک مشاعرے منعقد ہوئے، جن میں الطاف حسین حالؔی نے بھی حصہ لیا۔ محمد حسین آزادؔ ان مشاعروں کی روحِ رواں تھے۔ مولانا حالؔی تقریباً ۴ برس لاہور میں مقیم رہے۔ معاصر شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان کی صحت خراب ہی رہی اور وہ محمد حسین آزادؔ کی مانند لاہور کو دوسرا وطن نہ بنا سکے۔

انجمن پنجاب کے مشاعروں میں حالؔی نے جو نظمیں پڑھیں ان کی تفصیل درج ہے:

"برکھا رُت" (۱۴۰ اشعار) ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء

"نشاطِ امید" (۹۲ اشعار) ۱۳ اگست ۱۸۷۴ء

"حب وطن" (۲۱۵ اشعار) یکم ستمبر ۱۸۷۴ء

"مناظرہ رحم وانصاف" (۱۱۱ اشعار) ۱۶ نومبر ۱۸۷۴ء

آج ان مشاعروں سے وابستہ نزاعات سے یہ نکتہ روشن ہوتا ہے کہ اہل لاہور آئینِ نو سے ڈرنے والوں میں سے نہیں، اسی لیے اگلی صدی میں لاہور ادبی تحریکوں، تخلیقی تجربات اور فکرِ نو کا مرکز ثابت ہونے کی بنا پر برصغیر میں قائدانہ کردار ادا کرتا رہا۔ دہلی اور لکھنؤ کے مقابلے میں لاہور نے کہیں زیادہ گرم جوشی سے سرسید احمد خاں کی پذیرائی کی، ۱۹۰۱ء میں "مخزن" کا اجراء ہوا، ترقی پسند ادب کی تحریک میں بھی لاہور کے اہل قلم نے فعال کردار ادا کیا اور حلقہ ارباب ذوق کی داغ بیل تو لاہور میں ہی ڈالی گئی تھی۔ الغرض! لاہور ہے کبھی بھی طرزِ کہن پہ نہ اڑے، اگر طرزِ کہن پہ اڑنے والے ہوتے تو اس شہر میں اقبالؔ، فیضؔ، راشدؔ اور میراجیؔ کا گزارہ نہ ہو سکتا تھا۔

خواجہ عبدالرحمٰن طارق نے مضمون "مشفق خواجہ اور حکیم احمد شجاع کے مابین مراسلت" کے حاشیہ میں لکھا ہے: "حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں ۱۸۹۰ء میں میرے والد نے ایک اردو بزم مشاعرہ کی بنا ڈالی، شور محشر اسی بزم مشاعرہ کا آرگن تھا، یہ مشاعرہ ہر ہفتے میرے ہم زاد بھائی حکیم امین الدین بیرسٹر ایٹ لا کے مکان پر منعقد ہوتا تھا جو کلام وہاں پڑھا جاتا تھا بنامہ "شور محشر" میں شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے ایڈیٹر شعر و شاعری میں میرے سب سے پہلے استاد خان احمد حسین خان تھے، جن کی شہرت ایک ناولسٹ، ادیب اور شاعر کی حیثیت سے محتاجِ تعارف نہیں" (خوں بہا۔ حکیم احمد شجاع، آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء ص: ۱۳) ..... بحوالہ مجلّہ "مخزن" شمارہ ۱۷، ۲۰۰۹ء، لاہور)

انجمن پنجاب کے مشاعرے تو ختم ہو گئے لیکن لاہور میں مشاعروں کی روایت نے تقویت حاصل کر لی اتنی کہ بقول شیخ عبدالقادر (دیباچہ "بانگ درا")

"پنجاب میں اردو کا رواج اس قدر ہو گیا تھا کہ ہر شہر میں زبان دانی اور شعر و شاعری کا چرچا کم و بیش موجود تھا"

انیسویں صدی کے اختتام سے قبل ہی لاہور مشاعروں کا شہر بن چکا تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے مختلف حوالوں کی روشنی میں "زندہ رود: حیاتِ اقبال کا تشکیلی دور" میں لاہور کے شاعروں کی جو تفصیلات جمع کی ہیں۔ ان ہی کے الفاظ میں پیش ہیں:

"مولوی احمد دین ایڈووکیٹ بیان کرتے ہیں کہ اقبالؔ کی آمد لاہور سے پیشتر بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں ایک انجمن مشاعرہ قائم تھی جس کی نشستیں حکیم امین الدین کے مکان میں منعقد ہوتی تھیں۔ اس انجمن مشاعرہ کی بنیاد حکیم شجاع الدین

نے ۱۸۹۰ء میں رکھی تھی۔ پہلے اس کے مشاعرے حکیم امین الدین کے مکان پر ہوتے تھے مگر ۱۸۹۶ء میں حکیم شجاع الدین کے انتقال کے بعد یہ مشاعرے نواب غلام محبوب سبحانی خلف شیخ امام الدین والیٔ کشمیر کی سرپرستی میں ان کی حویلی میں ہونے لگے۔ حکیم شجاع الدین اپنی زندگی میں میر مجلس ہوتے تھے۔ میر زاارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظر حسین ناظم لکھنوی مشاعرے کی روح رواں تھے۔ مشاعروں میں سامعین کی تعداد بڑھتی چلی گئی، بعد میں یہی مشاعرے نواب غلام محبوب سبحانی کی صدارت میں اسی مقام پر منعقد ہونے لگے جہاں آج کل انارکلی بازار کے شروع میں ہوٹل واقع ہے..... حکیم امین الدین کے مکان کے سامنے جہاں انجمنِ مشاعرہ قائم تھی ایک چھوٹا سا مکان تھا حکیم شہباز احمد کا تھا جو امین الدین کے چچا زاد بھائی تھے..... ان کا مکان ایک کلب بن گیا تھا جہاں شہر کے باذوق اصحاب جمع ہوتے تھے۔ انجمنِ مشاعرہ میں اقبال کی شرکت کے باعث حکیم شہباز الدین اور ان کی جماعت نے فی الفور اقبال کو اپنے دائرہ اثر میں لے لیا''۔ (ص ۸۱۔۷۸)

انیسویں صدی میں لاہور میں ہونے والے مشاعروں کے بارے میں جو معلومات ملتی ہیں ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس زمانے کے مشاعرے نجی حیثیت رکھتے تھے یعنی کوئی خوش حال اور خوش ذوق اپنے گھر پر مشاعرے منعقد کرتا اور شعر و شاعری کے رسیا سامعین اور شعراء کو شرکت کی دعوت دیتا۔ گویا اجتماعی مشاعروں کا چلن نہ تھا، کسی گراؤنڈ یا کسی بڑے ہال میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین والا مشاعرہ نہ ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے شاعری کے ان سرپرستوں کی اس مساعی کی داد دینی چاہیئے جو وہ ذاتی حیثیت میں شاعری کے فروغ کے لیے کر رہے تھے۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان ہی مشاعروں سے اخذ شدہ معلومات کی روشنی میں طالب علم اقبالؔ کی ابتدائی شاعری کے بارے میں شواہد ملتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر جاوید اقبال:

''اقبال لاہور کے کسی مشاعرہ میں شریک نہ ہوئے تھے لیکن نومبر ۱۸۹۵ء کی ایک شام ان کے چند ہم جماعت انھیں کھینچ کر حکیم امین الدین کے مکان پر اُس مجلس مشاعرہ میں لے گئے، مشاعرے میں ارشد گورگانی حسب عادت موجود تھے..... لاہور میں غالباً پہلی مرتبہ اقبال نے مشاعرے میں اپنی غزل پڑھی جب آپ اس شعر پر پہنچے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو ارشد بے اختیار ہو کر داد دینے لگے اور انھیں محبت اور قدر دانی کی نگاہ سے دیکھا۔ اسی غزل کا مقطع جو اس وقت اقبال نے پڑھا، دلی اور لکھنؤ کی زبان کے جھگڑوں پر ان کے خیالات کی عکاسی کرتا ہے:

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اگلے سال یعنی ۱۸۹۶ء میں بھاٹی دروازہ بازار حکیماں کے مشاعرہ میں بھی اقبال نے شرکت کی۔

''سر عبدالقادر تحریر کرتے ہیں کہ انھوں نے ۱۹۰۱ء میں غالباً دو تین سال پہلے اقبال کو پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرے میں دیکھا جہاں ان کو ان کے چند ہم جماعت لائے تھے اور ان سے کہہ سن کر ایک غزل بھی پڑھوائی تھی۔ اس وقت تک لاہور میں لوگ اقبالؔ سے واقف نہ تھے، چھوٹی سی غزل تھی، سادہ سے الفاظ، زمین بھی مشکل نہ تھی مگر کلام میں شوخی اور بے ساختہ پن موجود تھا،

بہت پسند کی گئی۔'' وہ مزید لکھتے ہیں ''لاہور میں ایک بزمِ مشاعرہ بازار حکیماں میں حکیم امین الدین صاحب مرحوم کے مکان پر ہوا کرتی تھی۔ایک شب اس بزم میں ایک نوجوان طالب علم اپنے چند ہم عمروں کے ساتھ شریک ہوا،اس نے سادہ سی غزل پڑھی جس کا قطع یہ تھا:

شعر کہنا نہیں اقبالؔ کو آتا لیکن
آپ کہتے ہیں سخنور تو سخنور ہی سہی

.....اسی غزل میں ایک شعر اور تھا جس کی سامعین نے بہت داد دی اور تقاضا کیا کہ اقبال صاحب اگلے مشاعرے میں بھی ضرور شامل ہوں،وہ شعر یہ تھا:

خوب سوجھی ہے تہِ دام پھڑک جاؤں گا
میں چمن میں نہ رہوں گا تو مرے پر ہی سہی

بقول سر عبدالقادر اقبال قمیض واسکٹ اور شلوار پہنے تھے''۔

ڈاکٹر جاوید اقبال مزید لکھتے ہیں:

''اقبال نواب غلام محبوب سبحانی کے مشاعروں میں شریک ہو کر طرحی غزلیں پڑھتے تھے،اسی انجمن کے کسی ایک مشاعرے میں جس کے لیے یہ طرح دی گئی تھی:

مرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغِ ہجراں کا

اقبالؔ نے وہ غزل پڑھی جس کے مقطع میں داغ کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا گیا ہے:

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخن داں کا

اسی انجمن کے کسی اجلاس میں اقبال نے اپنی نظم ''ہمالہ'' بھی پڑھ کر سنائی تھی۔غالباً ۱۸۹۸ء یا ۱۸۹۹ء میں اسی بزم کی نشستوں میں اقبال کی نئی انداز کی شاعری کی ابتدا ہوئی۔ ۱۸۹۵ء سے لے کر ۱۸۹۹ء تک اقبال کو لاہور کی مختلف انجمنوں نے اپنی طرف کھینچا اور یہاں کے مخصوص باذوق طبقہ میں ان کی شناسائی ہو گئی۔''(ایضاً ص ۸۱۔۷۸)

بعد میں ''انجمن کشمیری مسلمانانِ لاہور'' اور پھر انجمن حمایت اسلام سے بھی اقبال کا تعلق قائم ہو گیا اور وہ ان کے جلسوں میں تحت اللفظ/ترنم سے نظمیں سنانے لگے۔انجمن حمایت اسلام کے جلسوں کے لیے علامہ نے بعض یادگار نظمیں لکھیں۔ ''نالۂ یتیم''(۲۴فروری ۱۹۰۰ء) ''دردِ دل یا ایک یتیم کا خطاب ہلال عید سے''(۲۴فروری ۱۹۰۱ء) ''خیر مقدم اور دین و دنیا''(۲۲ فروری ۱۹۰۲ء) ''زبانِ حال یا اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے''(۲۳فروری ۱۹۰۳ء) ''فریادِ امت''(۲۷فروری تا یکم مارچ ۱۹۰۳ء) ''تصویرِ درد''(۱۲اپریل ۱۹۰۴ء)

۱۹۰۴ء کے اجلاس میں مولانا الطاف حسین حالیؔ صدر تھے مگر پیرانہ سالی کی وجہ سے اپنی نظم نہ پڑھ سکے چنانچہ اقبال سے حالیؔ کی نظم سنانے کو کہا گیا۔مولانا حالیؔ کی نظم سنانے سے پیشتر اقبال نے فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے:

مشہور زمانہ میں ہے نام حالؔی
معمور مئے حق میں ہے جامِ حالؔی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے میرے لب پہ کلامِ حالؔی

(''مفکر پاکستان''،حنیف شاہدص ۹۳: ۹۲)

اقبال انجمن حمایت اسلام سے انتظامی امور کے لحاظ سے بھی وابستہ رہے۔یورپ سے واپسی کے بعد بھی انجمن کے سالانہ جلسوں کے لیے نظمیں لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔''شکوہ''(اپریل ۱۹۱۱ء)''شمع وشاعر(۱۶اپریل ۱۹۱۲ء)''ارتقاومردِآزاد'' (۱۴اپریل ۱۹۲۰ء)''خضرِ راہ''(۱۶اپریل ۱۹۲۲ء)''طلوعِ اسلام''(مارچ ۱۹۲۳ء)(ایضاً۹۵_۹۴)

انجمن حمایت اسلام مخیّر حضرات کے چندے پر چلتی تھی۔چندہ کے سلسلہ میں علامہ کی نظمیں بہت کارآمد ثابت ہوتیں نظم پمفلٹ کی صورت میں طبع کی جاتی اور اہل ذوق مہنگے داموں انھیں خرید لیتے یوں علامہ کی صرف ایک نظم سے سیکڑوں روپے جمع ہوجاتے۔

آج ان مشاعروں کی روداد پڑھیں تو رشک ہوتا ہے کہ اس دور کے سامعین کتنے خوش قسمت تھے جنھوں نے مولانا شبلی، مولانا حالی اور مولوی نذیر احمد کو دیکھا اور اقبال کے ترنم سے محظوظ ہوئے۔

اب تک صرف اردو کے حوالے سے بات ہوئی لیکن لاہور میں پنجابی زبان کے مشاعرے بھی ہوتے تھے اگر چہ ان میں اردو مشاعروں جیسا اہتمام نہ ہوتا تھا۔حضوری باغ یا قلعہ کے باہر اور راوی روڈ کی گرین ہیلتھس پر پنجابی شاعری کا ذوق رکھنے والے غیر رسمی طور پر جمع ہو کر کلام سناتے۔یہ مشاعرے نسبتاً محدود پیمانے پر ہوتے تھے۔البتہ ان مشاعروں کی ایک بات قابل داد ہے کہ اپنے اشعار سنانے سے پیشتر شاعر احتراماً اپنے استاد کا کلام سناتا اگر محفل میں استاد موجود ہوتا تو گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر شعر سنانے کی اجازت طلب کرتا۔استاد دامن،استاد فضل دین بخت،استاد عاشق کا اس ضمن میں نام لیا جاسکتا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل کے پنجابی شاعر استاد گام سے بڑی دلچسپ بات منسوب ہے،کسی نے پوچھا:

استاد! آج کل سب سے بڑا شاعر کون ہے۔

استاد نے جواب دیا:

''جندے نال ہاکیاں والے زیادہ ہون۔''

قیامِ پاکستان کے بعد لاہور میں بڑے بڑے مشاعرے ہوتے تھے۔منٹو پارک اور موچی دروازہ کے علاوہ پنجاب یونیورسٹی کے ہال میں بھی ایسے مشاعرے ہوتے تھے جہاں سامعین پلک جھپکے بغیر رات گزار دیتے اور دادِ سخن دیتے۔ان مشاعروں میں ہندوستان کے بھی معروف شعرا شرکت کے لیے دور دور سے آتے چنانچہ جگر مراد آبادی سے لے کر حسرت موہانی تک شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر شاعر ہوگا جو مشاعرہ پڑھنے لاہور نہ آیا ہو۔بدلتے زمانہ کے بدلتے انداز نے مشاعروں کے کلچر پر بھی اثرات ڈالے اور شعرا نے زرِ سخن کی وصولی شروع کردی مشاعرہ کا کلچر مسخ ہوا تو مشاعرہ کمرشل بن گیا یوں مشاعرہ میں شاعر کو اس کے مقام پر پڑھنا یا نہ پڑھانا اور ''لفافہ'' مشاعرہ کی سیاست کا اہم ترین مسئلہ قرار پا گیا۔

مشاعرہ خالص مردانہ چیز تھی لیکن ایک وقت آیا کہ لاہور (اور ملک کے دیگر شہروں میں بھی) شاعرات نے بھی مشاعروں میں شعر خوانی شروع کی اور مردانہ مشاعروں میں اپنے لیے جگہ بنالی۔ اب لاہور میں رات رات بھر کے بڑے اور عوامی مشاعرے منعقد نہیں ہوتے آج کے مشاعرہ کو پاکٹ مشاعرہ قرار دیا جا سکتا ہے کسی کلب یا کسی افسر کی کوٹھی پر مشاعرے منعقد ہو جاتے ہیں البتہ مضافات اور بالخصوص کراچی میں بڑے پیمانہ پر مشاعرے منعقد ہوتے ہیں اور سامعین رات بھر داد تحسین دیتے رہتے ہیں۔

مشاعرہ ایک مخصوص عہد کے تخلیقی رویوں پر مبنی تھا اور اس لیے اس کی تہذیبی اہمیت بھی تھی۔ یہ محض شعر خواں شعرا کے مجمع کے برعکس ان تخلیقی شخصیات کی کہکشاں ہوتا تھا جو تخلیقات کے ذریعے سے اپنے عہد کے فکری، جذباتی، ہیجانی اور لسانی رویوں کے مظہر قرار دیے جا سکتے ہیں۔ غزل جس مخصوص کلچر کی پیداوار تھی مشاعرہ اس کلچر کے مثبت اور منفی پہلوؤں کا عکاس تھا۔ اخلاق، تواضع، رواداری اور حوصلہ افزائی قدیم کلچر میں اساسی اہمیت کے حامل کرداری اوصاف تھے اور ان سب کا مظاہرہ مشاعرہ میں بھی ہوتا تھا جبکہ حسد، طنز، استہزا اور چشمک کی صورت میں ان ہی تخلیقی شخصیات کے منفی پہلوؤں کا بھی اظہار ہوتا تھا، مگر شائستگی کے ساتھ...... واہ جی واہ، واہ وا اور مکرر ارشاد فرمایئے، کی تکرار تو یہ سب ان شعراء کی تنقیدی حِس کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ بعض اوقات بے داد کی صورت بھی اختیار کر لیتی تھی اور ان سب پر مستزاد انا، خود پسندی اور تعلّی جس کے باعث متعدد ہے میر افرمایا ہوا، کا منفی رویہ اظہار پاتا۔ مشاعرہ میں میر کسی کو داد ہی نہ دیتے۔ مشاعرہ غزل کے کلچر کی پیداوار تھا لہٰذا ان غزل گو شعرا کی شخصیات کے پُر تضاد پہلوؤں کا مظہر بھی نظر آتا ہے۔ اُس عہد میں آج کے برعکس کیونکہ نشر و اشاعت کے متنوع ذرائع کا فقدان تھا۔ اس لیے غزل کی تشہیر و ترسیل اور فروغ کا اہم ترین ذریعہ مشاعرہ ہی تھا۔ دراصل اسی میں اس کی افادیت کا جواز بھی مضمر تھا اور اسی سے یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج مشاعرہ کی واقعی ضرورت ہے؟ اس ضمن میں سب کچھ کہہ سن کر بھی غیر مشروط طور پر مشاعرہ کا جواز مہیا نہیں کیا جا سکتا۔

جس تہذیب اور کلچر میں مشاعرہ زندہ اور فعال تخلیقی ادارہ تھا اسی تہذیب اور کلچر کے انقطاع کے بعد اب مشاعرہ محض مجمع شعرا ہی نظر آتا ہے۔ آج کا مشاعرہ کسی تہذیبی عمل کا مظہر ہونے کے برعکس محض کمرشل اور اسی لیے شاعروں کی جلب زر کی حِس کا مظہر ہو کر رہ گیا ہے۔ اب کسی شاعر کی غزل کے فنی پہلوؤں کے برعکس معاوضہ پر جھگڑا ہوتا ہے اور اس پر بھی غدر بپا ہو جاتا ہے کہ کسے کس مقام پر یعنی کس سے پہلے اور کس کے بعد پڑھوایا گیا۔ چنانچہ شاعروں کی تمام سیاست کا مرکز اور محور یہی ''معاوضہ'' اور ''مقام'' نظر آتا ہے، جو گروپ حاوی ہوتا ہے اسی سے وابستہ شعرا نہ صرف یہ کہ بلحاظ ترتیب مشاعرہ میں سینئر مقام پاتے ہیں بلکہ مخالفین کو بے دخل کرنے میں بھی بعض اوقات کامیاب رہتے ہیں۔ ادھر سٹیج سیکرٹری دوستی کا حق ادا کرنے اور دشمنوں کا بدلہ چکانے کے سنہری مواقع حاصل کرتا اور کئی طرح کے حساب کتاب برابر کرتا ہے۔

جہاں تک مشاعروں میں بالعموم بلائے جانے والے شعرا کا تعلق ہے تو وہ سینئر ہوں یا جونیئر، اچھے ہوں یا برے اور معروف ہوں یا غیر معروف، ان کے پاس چالو قسم کی چند غزلوں / نظموں کا خاصہ محدود سٹاک ہوتا ہے۔ ایسی غزلیں / نظمیں جو مختلف مشاعروں میں ''ہٹ'' ہو چکی ہوتی ہیں۔ اسی لیے شاعر ان آزمودہ نسخوں سے ہٹ کر کچھ سنانے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوتا۔ یوں حفیظ جالندھری بوڑھا ہو کر بھی، ابھی تو میں جوان ہوں...... کا راگ الاپتا رہا۔ اگر آپ مسلسل مشاعرے سننے کے عادی ہیں تو جلد ہی بیشتر شعرا کی پالتو (PET) غزلیں آپ کو بھی ازبر ہو جائیں گی۔ ان غزلوں کے گنے چنے الفاظ اور ان کے ذریعہ سے کمائے گئے معاوضہ کا حساب کرنے پر ششدر کر دینے والی یہ حقیقت منکشف ہو گی کہ شاعر فی الفاظ سیکڑوں بلکہ ہزاروں روپے وصول کر چکا ہوتا

ہے۔نشر و اشاعت کی متنوع سہولتوں کی موجودگی میں آج کے مشاعرہ کا واحد جواز صرف تازہ کلام سنانے میں مضمر ہے اگر شاعر کی پچاسیوں مرتبہ سنی ہوئی غزل ہی نے محفل سماعت کا باعث بنا ہے تو کیا اس سے بہتر یہ نہیں کہ اس کا متعدد مرتبہ دھرائی گئی غزل کو خود ہی یاد کر کے شاعر صاحب کو زحمتِ کلام نہ دی جائے۔اگر شاعر پروری ہی مقصود ہے تو اس کے اور بھی کئی باعزت طریقے ہو سکتے ہیں۔ سامعین کے رت جگے کی کیا ضرورت؟

بیشتر بڑے شہروں میں منعقد ہونے والے وہ عظیم الشان مشاعرے اب ماضی کی داستان معلوم ہوتے ہیں جہاں باذوق سامعین واقعی شب بیداری کا مظاہرہ کرتے اور اس کا ثمر بھی حاصل کرتے تھے۔آج کا سامع مشاعرہ کے بجائے ٹیلی ویژن کو ترجیح دیتا ہے۔البتہ چھوٹے شہروں اور قصبات میں مشاعرہ اب بھی جم جاتا ہے اور انھیں تو مشہور شعرا/شاعرات کی رونمائی ہی کی بدولت، بدلتے کلچر پیٹرن اور متغیر جمالیاتی اقدار کے باعث مشاعرہ کے شاعر کو تخلیق کار اور اس کے کلام کو عصر نما سمجھنے کے برعکس اب محض تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔چنانچہ ڈپٹی کمشنر/بڑے بیوروکریٹ/علاقہ کا رئیس یا جاگیردار مشاعرے منعقد کروا کر علاقہ میں ادب دوستی کی مقبولیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے عوام کو سستے اور فوری انصاف جیسی سستی اور فوری تفریح بھی مہیا کرتے ہیں۔اسی لیے گویا شاعر اور اداکار شاعر زیادہ داد وصول کرتا ہے۔

بڑے شہروں میں اب سرکاری اداروں کے زیر اہتمام یا باذوق بیگمات کے ڈرائنگ روم میں "پاکٹ" مشاعرے منعقد ہوتے ہیں، جہاں طعام کا بھی خصوصاً انتظام ہوتا ہے۔

پاکستان میں مشاعرہ کو بدمزہ کرنے میں ریڈیو اور بالخصوص ٹیلی ویژن نے بھرپور کردار ادا کیا ہے۔ان کے مشاعروں میں شعرا کو مدعو کرنے یا نہ کرنے کی سیاست سے قطع نظر یہ امر اساسی اہمیت کا حامل ہے کہ ان کے مشاعرے بلحاظ مزاج بالعموم تخلیقی ہوتے ہیں۔غیر تخلیقی اس معنی میں کہ یہ مشاعرے "موسمی تہواری" ہوتے ہیں۔ان کی قومی اور مذہبی اہمیت سر آنکھوں پر لیکن آورد کی اس شاعری کی تخلیقی اہمیت اور تنقیدی قدر و قیمت کیا؟

جہاں تک غزل یا نظم کے خالص مشاعروں کا تعلق ہے تو ان اداروں کی بے لچک سنسر شپ غزل اور خوبصورت نظم کو برداشت نہیں کر سکتی۔چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ اچھے اچھے شاعروں کی غزلوں سے پروڈیوسر نے وہ تمام اچھے اچھے اشعار کاٹ ڈالے جو اس کی دانست میں غیر اخلاقی، فحش، اسلام یا نظریۂ پاکستان کے خلاف اور ان سے بھی بڑھ کر حاکم وقت کی برہمی کا باعث بن سکتے ہیں، بعض اوقات زر کثیر صرف کر کے کل پاکستان قسم کا ایک اچھا مشاعرہ ریکارڈ کر لیا جائے تو وہ نصف شب کے بعد اس وقت ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے جب اگلی تاریخ شروع ہو چکی ہو اور جسے صرف متعلقہ شاعر کے علاوہ بے خوابی کا مریض ہی دیکھتا ہوگا۔

میں نے دور درشن کے مختلف سٹیشنوں کے مشاعرے بھی سنے ہیں جو سنسر شپ سے آزاد نظر آئے اور یہ بڑی بات ہے۔

پاکستان میں جس طرح روز بروز خرد سوزی کے رویے تقویت حاصل کر رہے ہیں۔ملائیت کی جڑیں مزید گہری ہو رہی ہیں اور احتساب کے لات و منات اب بھی بھیس بدل بدل کر آ رہے ہیں تو ایسے میں ان سبھی رجحانات اور مسائل کے بارے میں کانفرنسیں اور سیمینار منعقد کرانے کی ضرورت ہے جو قومی زندگی کو گھن بن کر چاٹ رہے ہیں اور ان عوامل کو بے نقاب کرنا چاہیئے جو تخلیق کے منظر نامہ میں کج فکری کے ذریعے سے ذہنی پسماندگی پیدا کر کے فکرِ نو کے چراغوں کو فروزاں نہیں ہونے دیتے۔ایسے میں محض دہرائی ہوئی غزلیں سنا سنا کر "مکرر ارشاد فرمایئے" سننا بے سود ہے۔

شاعر پروری کے اور بھی ذرائع تلاش کیے جا سکتے ہیں۔مشاعرہ ہی کیوں؟

قصہ نواب کالے خاں

از مرزا احمد یار

مظہر محمود شیرانی

پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرۂ شیرانی میں پرانی اردو منظومات وغیرہ کا ایک مختصر قلمی مجموعہ یا بیاض ہے جس پر شیرانی صاحب کا درج کردہ نمبر ۱۲۶۴ اور یونیورسٹی لائبریری کا اندراج نمبر ۵۱۷۵ ہے[1]۔ اس میں "قصہ سوداگر بچہ" (نوشتہ ۱۲۱۰ھ)، قصہ چندر بدن و مہیار از مقیمی وغیرہ کے ساتھ بے نوا سنامی کا "مخمس در مذمت طرہ باز خاں" بھی ہے جس پر شیرانی صاحب نے ایک تعارفی مضمون لکھ کر اس کا متن اورینٹل کالج میگزین کے شمارہ اگست ۱۹۴۵ء میں چھپوا دیا تھا[2]۔ متعارفہ بالا قلمی بیاض میں سنامی کے مخمس سے پہلے ورق ۳۸ تا ۴۱ پر ایک اور مخمس ہے جس کا عنوان یوں درج ہے:

"قصہ نواب کالے خان کہ در سانبھر فوجدار شدہ آمدہ بود من تصنیف مرزا احمد یار"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیرانی صاحب اس مخمس پر بھی ایک مضمون لکھنا چاہتے تھے کیونکہ ان کے اپنے خط میں اس کی ایک نقل، جس پر کچھ قطع و برید بھی کی گئی ہے، مرحوم کے کاغذات میں موجود ہے۔ یوں مجھے اس نظم کے ساتھ دلچسپی ہوئی اور جب پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں فوٹو سٹیٹ مشین کی سہولت فراہم کی گئی تو میں نے اس کا عکس حاصل کر لیا اور بغور اس کا مطالعہ کیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی زبان بارھویں صدی ہجری (اٹھارویں صدی عیسوی) کے منصف اول سے تعلق رکھتی ہے جس پر راجستھانی زبان کا اثر موجود ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ نظم سانبھر کے مقام پر کہی گئی تھی جو راجپوتانہ کے قلب میں واقع ہے۔ ایک طویل عرصہ اس جستجو میں گزر گیا کہ کہیں سے اس مخمس کے ناظم مرزا احمد یار کا کوئی سراغ مل سکے یا کالے خاں فوجدار سانبھر کے بارے میں کوئی اطلاع بہم پہنچ سکے تا کہ نظم کے عہد کا درست تعین ممکن ہو لیکن بے سود۔ نہ تو مرزا احمد یار کوئی اہم شاعر تھا کہ تذکروں میں اس کا تعارف ملتا اور نہ فوجدار اتنا بڑا عہدہ تھا کہ تاریخوں میں کالے خاں کا ذکر ہوتا۔ نظم میں ایک جگہ (راجہ) جے سنگھ کا نام آیا ہے لیکن جے پور کے حکمرانوں میں تین راجہ اس نام کے گزرے ہیں۔ یعنی مرزا راجہ جے سنگھ (از ۱۶۲۱ تا ۱۶۶۷ء) (۲) مہاراجہ سوائی جے سنگھ (۱۶۹۹ تا ۱۷۴۳ء) اور (۳) مہاراجہ جے سنگھ ثالث (از ۱۸۱۹ تا ۱۸۳۵ء)۔ میرے خیال کے مطابق اس مخمس کا تعلق جے سنگھ ثانی کے دور حکومت سے ہونا چاہیے تھا تاہم اس کی تصدیق کی کوئی صورت نہ تھی۔

ریاست جے پور کے قدیم قلعہ آمیر (جدید تلفظ آنبیر) میں تاریخی دستاویزات کا ایک اہم ذخیرہ محفوظ تھا جو شہر جے پور کی

تعمیر کے بعد وہاں منتقل کر دیا گیا۔اس ذخیرے میں بڑا حصہ مغلیہ دور کی تحریروں کا تھا۔بعد میں انگریزی عہد حکومت کے نوشتوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ان تمام دستاویزات کی بنیاد پر ۱۹۲۲ء میں مہاراجہ مان سنگھ ثالث نے مشہور مورخ سر جادوناتھ سرکار کو ریاست جے پور کی تاریخ لکھنے پر متعین کیا تھا۔مختلف وجوہات کی بنا پر اس ذخیرے کا کچھ حصہ تلف اور منتشر بھی ہو چکا تھا۔بہر حال باقی ماندہ بڑا حصہ مہاراجہ کے محل کے کپڑ دوارہ (توشہ خانہ) میں محفوظ رہا۔ان میں سے منتخب اہم دستاویزات کی ایک مختصر فہرست محکمہ آثار قدیمہ راجستھان کی طرف سے ۱۹۶۲ء میں شائع بھی کی گئی تھی۔گزشتہ صدی کے اواخر میں سابق والیان ریاست کے وارث مہاراجہ سری بھوانی سنگھ نے اس سارے ناٹے اور اس میں شامل تحریروں کے مختصر مطالب پر مبنی مکمل فہرست تیار کرنے کی غرض سے دو تاریخ دانوں گوپال نارائن بہورا اور چندرا منی سنگھ کو مقرر کیا۔چونکہ ان دستاویزات کا ایک وقیع حصہ فارسی اور کچھ اردو زبان میں بھی تھا اس لیے ٹونک کے ایک فاضل حکیم سید محمد احمد صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں جن سے مجھے بھی نیاز حاصل تھا۔۱۹۸۸ء میں ان دستاویزات کی فہرست پر مبنی پہلی جلد Catalogue of Historical Documents in KAPAD DWARA JAIPUR کے نام سے جے گڑھ پبلک چیریٹیبل ٹرسٹ جے پور کی جانب سے اشاعت پذیر ہوئی۔اس میں فرامین، پروانے، خریطے، عہدنامے، یادداشتیں، عرضیاں، رقعات خاص، قبالے، بیع نامے، قبض الوصول، نوشتیں، مچلکے، فار (غ) خطیاں، رسیدیں غرض ہر قسم کی ۱۷۲۱ تحریروں کا تعارف شامل ہے۔دوسری جلد جو نقشوں اور خاکوں کے تعارف پر مشتمل ہے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔

پہلی جلد کے آخر میں دیے ہوئے اشخاص کے اشاریے میں کالے خاں نام کے دو آدمیوں کا ذکر ہے۔ایک محمد کالے خاں اور دوسرا محمد کالے خاں نائب امانت تاہم اشاریہ ساز کو یقیناً تسامح ہوا ہے یعنی ایک ہی شخص کو اس نے دو اشخاص سمجھ لیا۔ فہرست ہذا کے مشمولات میں تین دستاویزات ایسی ہیں جن میں کالے خاں موصوف کا نام آتا ہے۔یہاں ان کا مختصر تذکرہ کرنا مناسب ہوگا:

(۱) نمبر ۱۶۹: یہ فارسی زبان کا خط شکستہ میں تحریر کردہ ایک پروانہ ہے جو مغل دربار سے میر محمد فصیح نائب پرگنہ ہنڈون کے نام روانہ کیا گیا ہے۔اس پر کوئی تاریخ درج نہیں۔اس میں ہدایت کی گئی ہے کہ پرگنہ ہنڈون کا روزینہ اور فوجداری کے اخراجات مہاراجہ جے سنگھ اور مہاراجہ بجے سنگھ کے حصہ یوں کو معمول کے مطابق ادا کیے جائیں۔

اس پر دیوناگری رسم الخط میں یہ نوٹ بھی ہے ''ڈیڈوانہ کی فوجداری کی''۔لیکن ہمارے لیے اصل اہمیت کی حامل اس پروانے پر کالے خاں کی درج ذیل مہر ہے:

''کالے خاں فدوی محمد شاہ پادشاہ غازی''

مہر پر سال جلوس ۱۱۴ اور سال ہجری ۱۱۴۴ درج ہے جو عیسوی سنہ ۳۲۔۱۷۳۱ کے مطابق ہے۔یقیناً پروانہ ہذا مہر پر مندرج تاریخ سے کچھ عرصہ بعد لکھا گیا ہوگا کیونکہ ایک بار مہر بنوانے کے بعد طویل عرصے تک اور بعض اوقات کسی شخص کے تاحین حیات وہی مہر استعمال ہوتی رہتی تھی۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پروانہ کالے خاں فوجدار سانبھر وڈیڈوانہ کے توسط سے روانہ کیا گیا ہے ورنہ اس پروانے کے مضمون کا فوجدار موصوف سے بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔تحریر میں جس مہاراجہ جے سنگھ کا ذکر آیا ہے وہ جے پور کا

راجہ سوائی جے سنگھ (۱۶۹۹ء۔ ۱۷۴۳ء) ہے اور مہاراجا ابھے سنگھ، راجہ جے سنگھ کا ہم عصر مہاراجہ جودھپور۔

(۲) نمبر ۱۷۲۴: نوشت بزبان فارسی از طرف محمد کالے خاں نائب امانت و فوجدار پرگنہ سانبھر و ڈیڈوانہ بنام مغل دربار، تاریخ ۱۱ محرم ۲۰ سال جلوس (۱۱۵۰ھ مطابق ۱۷۳۷ء) نوشت ہذا میں شکایت کی گئی ہے کہ علاقے کے زمیندار جو ریاست جے پور کی رعایا ہیں، بنجاروں اور تاجروں کے نمک خریدنے میں مانع ہیں۔ اس لیے مبلغ چھتیس ہزار روپے کی رقم منظور کرنے کی درخواست کی جاتی ہے تاکہ ان لوگوں کو حقوق نمک سازی کا معاوضہ ادا کیا جا سکے نیز ان کو ہدایت کی جائے کہ وہ نمک کی فروخت میں مزاحم نہ ہوں۔

اس دستاویز پر بھی کالے خاں کی وہی مثمن کر بالا مہر ثبت ہے جو ۱۲ سال جلوس محمد شاہ (مطابق ۱۱۴۲ھ) کی حامل ہے۔

(۳) نمبر ۱۷۰۱: شکستہ فارسی اور دیوناگری (ہندی) میں ایک تمسک ہے۔ از طرف محمد کالے خاں امین و فوجدار پرگنہ سانبھر و ڈیڈوانہ بنام رام سیوک و موہن رام ساہوکاران بابت قرض۔ تحریر ۱۱ جمادی الاخریٰ ۲۱ سال جلوس (۱۱۵۱ھ مطابق ۱۶ ستمبر ۱۷۳۸ء)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا نوشت (نمبر ۱۷۲۴) میں فوجدار موصوف نے جو چھتیس ہزار روپے کا مطالبہ زر کیا تھا وہ پورا نہ ہو سکا تھا۔ اور اسی سلسلے میں مارواڑی سیٹھوں سے قرض لینے کی ضرورت پڑی ہوگی۔ یوں بھی ان دنوں مغل دربار کو اپنی پڑی ہوئی تھی کہ نادر شاہ کے حملے کی خبر گرم تھی۔ یہ حملہ کچھ ہی عرصے بعد فروری ۱۷۳۹ء میں ہوا۔

اس تمسک میں فارسی عبارت کے نیچے دیوناگری خط میں "لکھت کالے خاں" مرقوم ہے اور کالے خاں کی وہی مہر ثبت ہے۔ یہ مہر ممکن ہے اس وقت تیار ہوئی ہو جب موصوف کو پہلی بار سانبھر کا فوجدار مقرر کیا گیا تھا یعنی ۱۱۴۲ھ میں۔ محولہ بالا دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ کالے خاں کم از کم ۱۱۵۱ھ تک تو اس عہدے پر ضرور متمکن رہا ہے اور عین ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی رہا ہو۔ وہ محمد شاہ کا معتمد علیہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ بیک وقت دو عہدوں یعنی فوجدار اور نائب امانت (امین پرگنہ) پر فائز تھا۔ علاوہ ازیں سانبھر کے علاوہ پرگنہ ڈیڈوانہ بھی اس کی تحویل میں تھا جو سانبھر سے خاصی دور ریاست جودھپور کے وسط میں واقع ہے۔

بہر حال کالے خاں کی شخصیت کے تعین اور اس کے بارے میں زیر نظر مخمس کا عہد محمد شاہ (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) سے تعلق کا علم ہونے پر میرے اس قیاس پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی کہ زیر نظر نظم کی زبان بارھویں صدی ہجری (اٹھارھویں صدی عیسوی) کے منتصف اول کی معلوم ہوتی ہے۔

سانبھر جھیل برعظیم میں نمک پیدا کرنے والی سب سے بڑی جھیل ہے جو سابق ریاست جے پور کی مغربی اور سابق ریاست جودھپور کی مشرقی سرحد پر واقع ہے۔ یہ شرقاً غرباً بائیس میل لمبی اور شمالاً جنوباً کوئی چھ میل چوڑی ہے۔ جھیل کے مشرقی کنارے پر سانبھر نام کا حاکم نشین شہر ہے۔ نمک کی آمدنی کے پیش نظر مغل حکمرانوں نے اسے اجارے پر لے کر اپنا فوجدار مقرر کر رکھا تھا تاہم اس کا بیشتر ماتحت عملہ ریاست جے پور کی طرف سے متعین کیا جاتا تھا۔ مغل بادشاہوں کے ساتھ جے پور کے حکمرانوں

کے تعلقات اکبر کے زمانے سے خوش گوار چلے آ رہے تھے۔ جب تک مغل بادشاہ طاقت ور رہے یہ دوعملی کامیاب رہی۔ مرکزی حکومت کمزور ہوئی تو نظم ونسق میں ابتری آئی۔ مہاراجہ سوائی جے سنگھ (۱۶۹۹ء تا ۱۷۴۳ء) محمد شاہ کی تخت نشینی سے بیس سال پہلے جے پور کی گدی پر بیٹھا تھا۔ اس نے شاہ اورنگ زیب عالمگیر کی آنکھیں دیکھی تھیں بلکہ بادشاہ کے ساتھ دکن کی لڑائیوں میں حصہ لے چکا تھا[۹]۔ وہ جے پور کا مہاراجہ ہونے کے علاوہ محمد شاہ کی طرف سے مالوہ کا فوجدار بھی تھا لیکن مرہٹوں نے، جو ایک سیلاب کی مانند شمالی ہند کو تہس نہس کر رہے تھے، جے سنگھ کو نہ صرف مالوے سے بے دخل کر دیا بلکہ اس کی اپنی ریاست کے کچھ حصے پر قبضہ جما کر چوتھ وصول کرنے کا حق حاصل کر لیا۔

ادھر مرکزی حکومت اپنے مسائل میں گرفتار تھی۔ جب محمد شاہ کی ترکی تمام ہو چکی تھی تو اس کے فوجدار کو کون خاطر میں لاتا۔ چنانچہ ماتحت عملے نے کالے خاں کو بے دست و پا کر دیا اور خوب کھل کھیلے۔ رشوت اور سرکاری اموال کی خورد برد عام ہو گئی۔ عوام بدحال ہو کر رہ گئے۔ اس دور کے ایک گم نام شاعر مرزا احمد یار نے تیس بندوں پر مشتمل ایک اردو مخمس میں اس صورت حال کی تصویر کشی کی ہے۔

اگر دستاویزات پر ثبت مہروں کے مطابق کالے خاں ۱۱۴۴ھ میں فوجدار سانبھر بنا ہو تو یہ نظم چند سال بعد یعنی ۱۱۵۰ھ کے لگ بھگ لکھی گئی ہو گی گویا اس وقت جب شاعر کو فوجدار موصوف سے کسی انتظامی بہتری کی توقع نہ رہی ہو گی۔ نظم کا عنوان اگرچہ "قصہ کالے خان" ہے لیکن اس کے بارے میں شاعر نے نہ کوئی معلومات فراہم کی ہیں نہ کسی تلخی کا اظہار کیا ہے۔ اس کو صرف اتنی شکایت ہے کہ ماتحت عملے نے فوجدار کو رعایا کی پریشانی سے بے خبر رکھا ہوا ہے اور من مانی کرتے رہتے ہیں۔ سائلوں کو فوجدار تک پہنچنے نہیں دیا جاتا۔ اس میں نہ انتظامی صلاحیت ہے نہ جرأت کہ ماتحت عملے کو قابو میں رکھ سکے۔ اس سے جے سنگھ بہتر ہے جس نے ایک بدنام اور مردم آزار اہل کار اودے چند کو اس کے باپ اور اس کے بیٹے سمیت قید کر رکھا ہے:

جے سنگھ کی قید بیچ وہ روتے ہیں زار زار

شاعر کو اصل شکایت سانبھر کی فوجداری اور امینی کے کارندوں سے ہے جن میں یہ عہدیدار شامل ہیں:

مودی (مہتمم توشہ خانہ)، چیت دار (ذاتی معاون)، چوب دار (نقیب، دربان)، واقعہ نگار (وقائع نگار، روزنامچہ نویس)، مدار المہام (محاسب)، پیش (پیش کار)، خان سامان (محافظ مال خانہ، بھنڈاری)، کوتوال (تھانیدار)، مشرف (فصلوں کا تخمینہ لگا کر مالیہ تجویز کرنے والا)، نائب (مختار)، نقیب (منیم، منشی)، بخشی (تنخواہیں ادا کرنے والا) اور داروغہ جریب (اراضی کی پیمائش کرنے والا)۔

وہ ان میں سے کئی اہل کاروں کے نام بھی لیتا ہے مثلاً:

سکھانند، عبداللطیف، شیخ اشرف، منسا، معز سین، شیخ فاضل، ناتھو (نانو) رام، میاں مزمل، دھاری رام، سید پیر محمد، میر عیوض، اودے چند، مرزا حسن علی اور دیوان دولت رائے۔

مخمس کا ناظم ان لوگوں کی نالائقی، بددیانتی اور جور و تعدی پر کڑھتا ہے اور جب اسے حالات کے سدھرنے کی کوئی

صورت نظر نہیں آتی تو جلی کٹی سناتا اور مغلظات پر اتر آتا ہے۔ نظم سے گالیوں کی ایک مختاط فہرست یہاں درج کی جاتی ہے:

خر، گیدی، ملعون، پلید، ولدالحرام، لعین، بھکوا، تبلی نیک، معطی، عاقی، سیہ رو، سیاہ کار، کٹن، بے حیا، نطفۂ حرام، شیطان کا مرید، وقت کا یزید، بھڑوا، مالزادہ۔

دراصل یہ اپنے جذبات کا تنقیہ کرنے کی ایک کوشش ہے اور اس بے ساختہ اظہار سے ناظم کو یقیناً ذہنی آسودگی حاصل ہوئی ہوگی جس کو وہ "دلخوشی" کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔ چنانچہ مخمس کے اختتام پر ترقیمہ کے آخری الفاظ ہیں: "برای دلخوشی کردن نوشتہ ام"۔

حافظ محمود شیرانی نے بے نوا سنامی کے مخمس پر اپنے مضمون میں کہا تھا:

"مخمس فی ذاتہ اچھی شاعری کا نمونہ نہیں تاہم بعد کے شعرا کے واسطے وہ ایک مثال بن گیا ہے۔ ناجی نے پانی پت میں نادر کی آمد، دہلی کے لشکر کے انتشار، امرا کی منافقت اور سپاہیوں کی آرام طلبی کے متعلق جو اپنا مخمس لکھا ہے، بے نوا کی تقلید معلوم ہوتا ہے...... بے نوا کا مخمس ان ایام میں بہت مشہور ہوگا اور ہندوستان کے طول و عرض میں اس کی کافی اشاعت ہوئی ہوگی۔" (مقالات حافظ محمود شیرانی، جلد دوم، ص ۱۴۲)

شیرانی صاحب کی رائے کی تائید مرزا احمد یار کے زیر نظر مخمس سے ہوتی ہے۔ بے نوا کا مخمس سنہ ۱۱ جلوس محمد شاہی (۱۱۴۱ھ) میں کہا گیا تھا۔ نادر شاہ کا حملہ ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۹ء) میں ہوا تھا اور یہی ناجی کی نظم کا زمانہ ہے۔ تقریباً اسی وقت سانبھر کے مقام پر مرزا احمد یار اپنا مخمس لکھ رہا ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر اس کی نظم ناجی کے شہر آشوب سے پہلے لکھی گئی ہو۔ یہ بھی خیال رہے کہ ناجی کے شہر آشوب کے صرف دو بند ہم تک پہنچے ہیں اور بے نوا کے مخمس میں گیارہ بند ہیں جب کہ مرزا احمد یار کی نظم تیس بندوں پر محیط ہے۔ مضمون کے اعتبار سے زیر نظر مخمس شہر آشوب کی تعریف پر پورا اترتا ہے۔ یہ اسی وزن میں کہا گیا ہے جو بے نوا کے مخمس کا ہے یعنی بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف (یا مقصور) یعنی مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن (یا فاعلات)۔ نظم کسی اعلیٰ پائے کی شاعری کا نمونہ نہیں ہے، نہ ہم اس ابتدائی دور میں اس کی توقع کرنے میں حق بجانب ہیں۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ سانبھر جیسے نمک سار میں بیٹھ کر ایک شخص اردو نظم میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کر رہا ہے اور اس میں بڑی حد تک کامیاب ہے۔

جہاں تک زبان کا تعلق ہے اس پر قدامت کی چھاپ خاصی گہری ہے۔ سے کو سوں، بتی اور ستیں، کو کوں، کے تئیں کو کتیں، خود کو ایس، جی کو جیو، کہتے کو کہیے اور تک کو لک یا تلک لکھا گیا ہے۔ اشارہ کے لیے ٹھیٹھ دیسی لفظ "سین" لایا گیا ہے۔ نظم میں راجستھانی اثرات بھی کارفرما ہیں۔ جیسے اکے (یکساں)، پلشت (پلید، بدکردار)، چیرہ (رنگین راجستھانی صافہ)، کاگا (کوا) وغیرہ۔ علاوہ ازیں چڑھ جاوے (چڑھ جائے)، اوڈنے لگے (اڑنے لگے)، کاڈھ کر (نکال کر)، چھوڈیں (چھوڑیں)، گاڈی (گاڑی)، گھوڈے (گھوڑے)، بڈا (بڑا) بھی ملتے ہیں۔ او (وہ)، وے (وہ کی جمع)، یو (یہ)، بچاٹ (بھٹ)، پاوے (پائے)، جاوے (جائے) بھی موجود ہیں۔ تاہم یہ اثرات محض سانبھر سے تعلق کی بنا پر نہیں ہیں بلکہ اس زمانے تک اردو من حیث اللسان راجستھانی زبانوں سے بہت متاثر تھی چنانچہ اکثر متذکرہ بالا الفاظ نہ صرف بے نوا سنامی کے ہاں بلکہ اس کے بعد آنے

والے دہلی کے اردو شعرا کے کلام میں مل جاتے ہیں۔ پاوے، جاوے، کھاوے وغیرہ تو معیاری اردو میں بیسویں صدی کے اوائل تک رائج رہے ہیں۔ "ڑے" اور "ڈال" کا فرق بھی ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ ماضی قریب تک ثقہ لوگ "علی گڈھ" لکھتے اور "علی گڑھ" بولتے تھے۔

مرزا احمد یار کوئی با قاعدہ شاعر معلوم نہیں ہوتا۔ اسے شعر کے وزن کا احساس بھی واجبی ہے۔ نظم کے متعدد مصرعے وزن سے عاری ہیں یا ان میں نا گوار سکتے پائے جاتے ہیں مثلاً:

آتا ہے بھاں کا کام لے جو کوئی حضور سوں

یا ہم جانیں یہ قصبہ سانبھر اور یہ مستمند

یا داوات میں سیاہی کاغذ میں نہیں مکاں

بعض جگہ عربی الفاظ کے تلفظ اور استعمال میں غلطیاں کی ہیں۔ مکر اور فکر کے کاف کو متحرک کر کے گھر اور دھر (دھڑ) کا قافیہ بنایا ہے۔ اسی طرح مصرع: فی النار والسقر ومع الحجد والبدر میں فارسی لفظ "پدر" کو بصورت "بدر" بزعم خویش عربی بنا کر اس پر "ال" کا اضافہ کر دیا ہے۔ بعض الفاظ کا املا صریحاً غلط ہے مثلاً عاق کو آق، نذر کو نظر اور ہضم کو حزم لکھا ہے۔ البتہ اگر ناظم اور کاتب ایک ہی شخص نہ ہوں تو یہ اغلاط کاتب کے کھاتے میں ڈالی جا سکتی ہیں۔

بایں ہمہ مرزا احمد یار کی کوشش قابل داد ہے۔ وہ پیشہ ور شاعر نہ سہی لیکن خاصا با ذوق معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت وہ رواں اور بے عیب مصرعے ہیں جو نظم میں ایک قابل لحاظ تعداد میں ملتے ہیں۔

اب اس نظم کے متن کی نمایاں املائی خصوصیات پر بھی ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا:

☆ دیسی ہائیہ حروف کو حسب رواج زمانہ دو الگ الگ حرفوں کی صورت میں لکھا گیا ہے مثلاً سکہانند (سکھانند)، کہینچ (کھینچ)، چہدام (چھدام)، سانبہر (سانبھر) اور تہا (تھا)۔ جہاں ہائیہ حرف لفظ کے آخر میں آئے ہیں وہاں دو "ہ" اکٹھی لائی گئی ہیں یعنی کچھ کو کچہہ، لاکھ کو لاکہہ اور ہاتھ کو ہاتہہ لکھا ہے۔

☆ موجودہ رواج کے برعکس یائے معروف کو "ے" اور یائے مجہول کو "ی" کی صورت میں درج کیا ہے۔

☆ حرف نون میں ہر جگہ نقطہ لگایا ہے۔ پوری نظم میں کہیں بھول کر بھی نون غنہ کا نشان نہیں ملتا۔

☆ نون زائدہ کا رواج عام ہے یعنی کے، آگے، نے، جیسے، اپنا، ہونے اور کوئی کو بالترتیب کین، آگین، نین، جیسین، اپنان، ہونین اور کوئین لکھا گیا ہے۔

☆ واو زائدہ کا بھی یہی حال ہے۔ اس، ان، بھس اور انھوں بترتیب واراوس، اون، بہوس اور اونہون کی صورت میں ملتے ہیں۔

☆ گاف کو کاف لکھا گیا ہے جیسے کرک (گرگ)، لکی (لگے)، سک (سگ)، رک (رگ) اور جہک (جھگ، جھاگ)

☆ اسی صورت "ٹ" بصورت "ت" ملتی ہے۔ تو، مات، پیت اور کہات کی صورت ٹو، ماٹ، پیٹ اور کھاٹ ہوتا ہے۔

☆ علیٰ ہذاالقیاس ڈال کو بھی دال سے لکھا ہے جیسے چدہ (چڑھ، چڑھ) اودتی (اوڑنے، اڑنے)، کادہ (کاڈھ) وغیرہ۔
نظم کی املائی خصوصیات کے لیے اس کے مخطوطے کا عکس ملاحظہ کیجیے جو مضمون کے آخر میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔
ان گزارشات کے ساتھ ذیل میں مرزا احمد یار کے مخمس کا متن درج کیا جاتا ہے:

قصہ نواب کالے خاں

(متن)

۱۔ سانبھر میں کالے خاں جیو ہوئے جب سوں فوجدار
تب سوں ہوا ہے غلبۂ کفار بے شمار
آگے تو ایک مودی تھا یہاں کا چیت وار
بعد اس کے آن پہنچا سکھانند نابکار
ویراں کیا ہے دونوں لعینوں نے سب دیار

۲۔ ان کافروں کے ہاتھ سوں ہے ملک بے چراغ
دست ستم سوں ان کے رعیت کے دل ہیں داغ
بستی کتنیں اجاڑے ہیں کاٹے ہیں سارے باغ
بلبل کے آشیانہ میں اکثر بسے ہیں زاغ
جو گل کا تھا مکان وہاں جم گئے ہیں خار

۳۔ مانند خرس، خوک کے پھیلے ہیں ہر طرف
قصبے کویوں لگے ہیں کہ جوں ماہ کو کلف
فوجیں بلا کے عظم دکھاتے ہیں باندھ صف
غربا کوں لوٹ مار کے کرتے ہیں سب تلف
لاچار ہو تمام رعیت ہوئی فرار

۴۔ سب پرگنہ کوں اپنے تصرف میں کر لیا
تودے نمک کے بیچ کے گھر اپنا بھر لیا
گویا کہ سب اجارے میں سانبھر کا سر لیا
قصبہ کوں یو(ں) لیا ہے کہ جوں اپنا گھر لیا
حاکم کتنیں غرور سیں رکھتے ہیں یک کنار

۵۔ آتا ہے جہاں کا کام لے جو کوئی حضور سوں
با نوبت و نشان و بہ فوج وفور سوں
سب ہو کے پیشوا اسے لاتے ہیں دور سوں
کچھ مکر کچھ فریب و دغا کچھ غرور سوں
کہتے ہیں ہم بھی نوکر ہیں نواب نامدار

۶۔ تم قلعہ بیچ ذوق سوں بیٹھے کرو انند
ہم جائیں اور یہ قصبۂ سانبھر، یہ مستمند[۲]
حاکم کے کارخانے کیے مل کے سارے بند
پھر شہر میں دوہائی (ہے) مودی و سکھانند
تب کون پوچھتا ہے کدھر گیدی فوجدار

۷۔ حاکم بھی دیکھ غلبہ کفار اس قدر
خلوت اور مصلحت میں لگے شام کیا سحر
لاچار ہو سپرد کیا اپنا سارا گھر
مجرائیوں کوں جواب دیا سب کوں سربسر
عبداللطیف مانع ہوئے بن کے چوبدار

۸۔ جو جاوے اس کوں منع کریں ہو کے مثل سگ
اہل غرض کوں دیکھ جھٹ چڑھ جاوے ان کی رگ
ایسا بجھے کہ اڑنے لگے ان کے منہ سوں جھگ
کہ اون سوں ملاحظہ رکھتا ہے سارا جگ
شیطان سوں زیادہ (ہے) یو قوم بد شعار

۹۔ جو چار پیسے کاڈھ کر ان کے نذر[۳] کریں
جلدی سوں ان کو کھینچ کے خلوت بھر کریں
حقدار لاکھ طرح سوں منت اگر کریں
ہرگز نہ چھوڑیں گرچہ وو چاک جگر کریں
روزینہ دار روتے ہیں سب ان کوں آہ مار

۱۰۔ اٹھ کر علی الصبوح جو کوئی لیوے ان کا نام
ہرگز نہ پاوے کھانے کوں از صبح تا بشام
فاقہ ستی خراب پھرے موںہہ کو دے لجام
گر ایک پیسہ چاہے تو پاوے نہ اک چھدام
جب تک نہ مارے ناوں پر پاپوش کئی ہزار

۱۱۔ اول تھے شیخ اشرف منسا و مترسین
نواب کوں بغیر انھوں کے نہیں تھا چین
دونوں تھے موںہہ پیارے ہوئے جیسے عین غین
تھے حیلہ باز مل گئے مودی سوں کر کے سین
بعد ان کے شیخ جیو بھی گئے خوب ہاتھ مار

۱۲۔ خلوت میں چھوٹتے ہیں جو دن رات صبح شام
اول یو شیخ فاضل و بعد ان کے نانھو رام
تیجے میاں مزمل چوتھے ہیں دھاری رام
کچھ تھوڑے سید پیر محمد ہے جن کا نام
سب سے زیادہ میر عیوض واقعہ نگار

۱۳۔ ان میں علی الخصوص او جو نانھو رام ہے
داد و ستد کے بیچ مدار المہام ہے
سب نوکروں کا اس خرگیدی سوں کام ہے
ملعون ہے پلید ہے ولدالحرام ہے
لیکن اسی لعین کا اب کل ہے اختیار

۱۴۔ سب پرگنہ کی آمدنی اس کے گھر میں ہے
جو کچھ کہ نگے نقد و جنس ہے سب اس کے دھڑ میں ہے
موںہہ پہ لگا کے خاک فریب و مکر میں ہے
جیو راج ...... مرے کی ہمیشہ فکر میں ہے
دن رات مجلس بھرانے سے ہے اس کو کاروبار

۱۵۔ سرکار کے تمام جو نوکر ہیں ایک ایک
غصہ سے دانت پیستے ہیں اس کوں دیکھ دیکھ
اس مسخرے کٹن کا یہی آ پڑا بسیکھ
بھکوا ہے، بیٹی ..... ہے، .....تھیلی ٹیک
معطی و عادتی ہے، سیہ رو، سیاہ[۵] کار

۱۶۔ مقصد یو ہے کہ ایسا کٹن، بے حیا، پلید
سرکار میں ہوا ہے گویا عقل کا کلید
او نطفہ حرام ہے شیطان کا مرید
لعنت بجا ہے اس کوں کہ ہے وقت کا یزید
بھڑوا ہے، مالزادہ[۶] ہے، گرچہ ہے مالدار

۱۷۔ کیچے دنوں تلک جو اودے چند پیش تھا
ظاہر میں مثل شہد (تھا) باطن میں نیش تھا
اک عالم اس کے ہاتھ ستی سینہ ریش تھا
صورت میں مثل گرگ کا سیرت میں میش تھا
کذب (و) دغا و مکر میں تھا خوب ہوشیار

۱۸۔ ان نے بھی چند روز (تک) دکھلا کے کروفر
ہو کر مدھڑک خوب سا کرکے حصول زر
آخر کوں او بھی ہو گیا فی النار والسقر
فی النار والسقر و مع الجد والبدر
جے سنگھ کی قید بیچ وہ روتے ہیں زار زار

۱۹۔ او(ر) وے جو خان ساماں ہیں با روشن اختری
گاڈی (پہ) بیٹھ پھرتے ہیں مانند جوہری
خوشحالی اور سکھی ستیں[۷] ہے ان کوں دہری
بالفعل ویسا کوئی نہیں ..... کامشتری
کتلہ میں جا کے ستتے ہیں کھٹ راگ اور ملار

۲۰۔ مرزا حسن علی جو ہیں سانبھر کے کوتوال
مجلس میں ماڑزادیوں کی مثل شاہ کمال
کلاں انھوں کی چیچتی اور وے ہیں اس کے لال
صحبت میں جن کی بھڑوے (ہیں) اور کٹنے اور چھنال
جن کے رفیق بلھو و ملھو و حسن یار

۲۱۔ ٹٹو پہ چڑھ کے جب وے نکلتے ہیں گشت کوں
سب کسبیاں ہیں دیکھتی ان کی نشست کوں
چیرے کا ڈھیلا پیچ اور مینڈھی کی شست کوں
اپنے اوپر رجھاتے ہیں ہر یک پلشت کوں
ان پہ بھی ماڑزادیوں سے کم نہیں بہار

۲۲۔ ہذا القیاس رحمت کوئی جو ہے غلام
یہاں آ کے چاہنے لگے ہر یک سوں وہ سلام
پھرتا تھا ایک غرق لنگوٹی سوں وہ مدام
کاگا کی ذات پہ نہیں ہرگز وفا کا نام
لاخیر فی عبیدی ہے (اک) قول پایدار

۲۳۔ پھر ان میں ایک خلیفہ (بھی) ہیں جالیوں کے شیر
بھوکے ہو خرخراتے تھے پہ اب ہوئے ہیں شیر
گھوڑے نمک کے ہضم کیے کر کے، ہیر پھیر
گویا کہ ہاتھ لگ گئی اندھے کنھیں بٹیر
مخلص ہیں، راجپوتوں کے گرچہ ہیں طرفدار

۲۴۔ دیوان دولت راے کہ پیٹ ان کا مثل ماٹ
دن رات سوتے رہتے ہیں (وہ) ہر پلنگ وکھاٹ
بیٹا بڑا انھوں کا گویا جس کرن ہے بھاٹ
دارو اگر نہ پاوے تو جاوے اس کی ……پھاٹ
سکی اور جھانولی میں ہے استاد روزگار

۲۵۔ ایسے ہی مسخروں کی ہوئی ہے موافقت
جو ہیں قدیم ان سوں ہے دل میں مخالفت
جن کوں سوار ہونے (کی) خر کے نہ تھی سکت
بے پرسش ان کوں گھوڑے (ہیں) اور خاص ہیں گے رتھ
شیخی سے سارے شہر میں پھرتے ہیں ہوسوار

۲۶۔ دو وقت ہاتھ مار کے بر فرنی و پلاو
موچھوں کو تاو دیتے ہیں جوں دھوپ میں بلاو
کھانے کا وقت دیکھ کر انگل دکھائیں، کھاو
جب لگ نہ پاویں مثل لگڑ کے کریں ہیں گھاو
طعمہ کوں کھا کے[۸] رکھتے ہیں کندھے[۹] و دم سپار

۲۷۔ جب اس طرح کی جمع ہوئی مجلس غریب
کوئی مشرف ان میں ہے گا کوئی نائب اور منیب
کوئی بخشی ان میں نائب کوئی داروغۂ جریب
تب کون پوچھتا ہے ز اشراف اور نجیب
جھوٹے لپاٹیوں کو یہاں خوب روزگار

۲۸۔ اس واقعہ کا حال[۱۰] کہاں لگ کہوں عیاں
دوات میں سیاہی کاغذ میں نہیں سکاں
طاقت نہیں قلم میں جو اس کا لکھے بیاں
شاہد ہیں اس کے حال سوں کیا خورد کیا کلاں
لیکن اب اس کی شرح کوں کرتا ہوں اختصار

۲۹۔ دل میں رکھے جو اس کے مصنف ستی نفاق
تحقیق اس کوں باپ نے اس[۱۱] کے کیا ہے عاق[۱۲]
وہ مسخرہ[۱۳] تعین مقرر ہے زن طلاق
گر کچھ کرے وہ، زیر کیا ہے وہ قرمساق[۱۴]
ہرگز نہیں ہے بانگ میں مرغی کی اعتبار

۳۰۔ دل میں اپس کے رکھتے ہیں جو راستی کی دھن[۱۵]
کہتے ہیں آفریں وہ سب اس واقعہ کوں سن[۱۶]
موذی مخالفوں کوں ہے جو (ں) زہر یو سخن
گر ان میں عقل ہوئے تو سب اکسے مانیں گن
احمد نے سب کہا ہے یو مضمون یادگار

تم تم تم تمام شد کار من نظام شد۔ برای دلخوشی کردن نوشتہ ام

متنی اشارات

۱۔ اصل میں "دل ہیں رعیت کے داغ"۔
۲۔ اصل میں "یہ قصبہ سانجھر اور یہ مستمند"
۳۔ اصل میں "نظر"
۴۔ اصل میں "کے"
۵۔ اصل میں "سیہ"
۶۔ اصل میں "مالزادا"
۷۔ اصل میں "سین"
۸۔ اصل میں "کہ"
۹۔ اصل میں "کندے"
۱۰۔ اصل میں "حوال"
۱۱۔ اصل میں "اس کوں"
۱۲۔ اصل میں "آق"
۱۳۔ اصل میں "مسخرا"
۱۴۔ اصل میں "قمر مشاق"
۱۵۔ اصل میں "جو دل میں اپس کے رکھتے ہیں راستی کی دھن"
۱۶۔ اصل میں "وہ آفرین کہتے ہیں سب اس واقعہ کو سن"

حواشی

۱۔ سید جمیل احمد رضوی نے اپنے کتابچے "ذخیرہ شیرانی میں اردو مخطوطات" (شائع کردہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء) میں نمبر ۲۲۸ کے تحت اس کا تعارف کرایا ہے۔

۲۔ بعد ازاں یہ "مقالات حافظ محمود شیرانی" (جلد دوم، لاہور: جنوری ۱۹۶۶ء) میں شامل کیا گیا۔

۳۔ پروانہ بھی شاہی حکم نامہ ہوتا تھا تاہم یہ فرمان کی طرح بادشاہ کی ذات سے مخصوص نہ تھا بلکہ کوئی راجہ، رئیس، نواب اور حکومت کا کوئی اعلیٰ افسر یا بڑا عہدیدار جاری کرسکتا تھا۔ عموماً مرکزی حکومت کی چٹھیاں پروانوں کی صورت میں جاری ہوتی تھیں جو مختلف احکام کی حامل ہوا کرتی تھیں۔

۴۔ چھوٹے عہدیداروں کی طرف سے بڑے حکام کے نام لکھی جانے والی تحریریں اور اطلاعی مکاتیب نوشت کہلاتے تھے۔

۵۔ تمسک سے مراد دو اشخاص کے درمیان کیا جانے والا معاہدہ یا اقرار نامہ ہے جس کی رو سے ایک شخص دوسرے کو طے شدہ رقم مخصوص شرائط کے تحت قانوناً ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے۔

۶۔ فوجدار سرکار یعنی ضلع کی سطح کا عہدیدار ہوتا تھا البتہ بعض اہم پرگنوں میں بھی یہ عہدہ موجود تھا۔ فوجدار کا اصل فریضہ امن وامان قائم رکھنا تھا۔ اس اعتبار سے وہ بیک وقت فوج اور پولیس کے سربراہ کا کردار ادا کرتا تھا۔ علاوہ ازیں مالیہ کی جمع آوری میں عامل اور امین کی معاونت بھی اس کے فرائض میں شامل تھی۔ فوجدار مرکزی حکومت کی طرف سے متعین کیے جاتے تھے گویا بادشاہ کے براہ راست نمائندے ہوتے تھے۔

۷۔ صوبوں میں مالیہ اور محصولات کی جمع آوری اور اس کا حساب کتاب رکھنا عامل کا فریضہ تھا۔ سرکار (ضلع) میں عامل کا ماتحت امین ہوتا تھا اور اس کا عہدہ امانت کہلاتا تھا۔ پرگنوں میں نائب امانت اس کی نمائندگی کرتا تھا۔

۸۔ ڈیڈوانہ اور سانبھر میں قدر مشترک یہ تھی کہ ڈیڈوانہ میں بھی سانبھر کی مانند ایک نمک کی جھیل ہے گو یہ سانبھر جھیل کے مقابلے میں چھوٹی ہے۔ ڈیڈوانہ سرکار ناگور کا ایک پرگنہ تھا۔

۹۔ رقعات عالمگیری کے ایک مجموعے کے مخطوطے میں جو ادارہ تحقیقات عربی وفارسی راجستھان (ٹونک) میں محفوظ ہے راجہ سوائی جے سنگھ کے نام بادشاہ کا ایک دلچسپ رقعہ ملتا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جے پور شہر کی تعمیر کے بعد جب ریاست کے حکمران آمیر سے یہاں منتقل ہو گئے تو قلعہ آمیر کو مغلوں نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ ایک عرصے بعد جب راجہ جے سنگھ شاہ عالمگیر سے چھٹی لے کر دکن سے اپنے وطن آیا ہوا تھا تو اس نے آمیر کے قلعے میں قیام کر لیا۔ پرچہ نولیس نے بادشاہ کو اس امر سے مطلع کیا تو وہاں سے جے سنگھ کے نام یہ مختصر لیکن پرکار رقعہ آیا:

"جے سنگھ را باید کہ در قلعہ نماند اگر ماند مرا رسید و دانند"

کافکا کی آخری محبت

(وہ خود کو مسز کافکا لکھتی تھی.....)

سید سفیر حیدر

عالمی ادب میں انتہائی منفرد لب و لہجے اور طرزِ فکر کا حامل ادیب فرانز کافکا کی زندگی کے شب و روز 'کافکائیت' کا سرچشمہ ہیں۔ بچپن میں باپ کی مطلق العنانیت کا روگ اور بعد ازاں اپنی شخصیت میں توازن کی لاحاصل کوششیں اور پھر اکیالیس برس کی عمر میں موت۔ اس مختصر مگر پیچیدہ کہانی میں کئی بار دلچسپ 'کایا کلپ' نظر آتی ہے لیکن آخری دنوں میں کافکا روحانی طور پر زندگی کی طرف لوٹ آنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور کافکا پر کوئی 'فیصلہ' یا "فتویٰ' دینے سے پہلے اس کے آخری دنوں کے احوال کو سامنے رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ دن کافکا کے فلسفۂ حیات میں تبدیلی کے داعی ہیں ۱۹۲۳ء میں کافکا اپنی بہن اور اُس کے بچوں کے ساتھ بالٹک کے ساحلی علاقے 'Murtiz' میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں وہ برلن جیوش پیپلز ہوم میں گیا جس سے اُس کی دلچسپی اور ہمدردی کافی پرانی تھی یہاں اُس نے باورچی خانے میں ایک نوجوان یہودن کو کام کرتے دیکھا اُس کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ نکلے "ایسے نازک ہاتھ اور ایسا سخت کام" یہ لڑکی ڈورا ڈائمنٹ (Dora Diamant) تھی۔ کافکا کی آخری محبت۔

ڈورا ڈائمنٹ پولینڈ کے ایک راسخ العقیدہ یہودی خاندان کی لڑکی تھی لیکن اُس نے اپنے باپ کی تنگ نظری اور بے جا پابندیوں کے خلاف بغاوت کی اور گھر چھوڑ دیا۔ عبرانی زبان سیکھی پہلے 'بریسولا' میں کام کرتی رہی اور پھر برلن چلی آئی اور اب جیوش پیپلز ہوم میں ملازم تھی۔ کافکا بھی ان دنوں خشوع و خضوع کے ساتھ عبرانی سیکھ رہا تھا۔ کافکا کو کئی حوالوں سے ڈورا میں کشش محسوس ہوئی۔ مثلاً عبرانی میں مہارت' جیوش پیپلز ہوم میں خدمات' اس کے فطری عادات و اطوار' صحت مندی' خوبصورتی اور گھریلو پابندیوں سے حصولِ آزادی کا اقدام (جو کافکا کا قدیمی خواب تھا) اور کسی قسم کے الجھاؤ سے پاک زندگی۔ دوسرے لفظوں میں وہ روحانی آزادی کے ساتھ ایسی زندگی گزار رہی تھی جسے کافکا 'Authentic Life' سمجھتا تھا۔ رات کو وہ معزز مہمان کی حیثیت سے ڈنر میں شامل تھا کیتھی ڈائمنٹ نے "کافکا کی آخری محبت" میں ایک واقعہ درج کیا ہے کہ ڈنر کے دوران ایک بچہ جس کی عمر پانچ یا چھ سال ہو گی' کوئی چیز لانے کے لیے تیزی سے اٹھا تو اس کا پاؤں دہرا ہو گیا اور وہ منہ کے بل گر پڑا۔ ہراساں چہرے کے ساتھ جلدی جلدی اپنا پاؤں سہلاتا ہوا اٹھا۔ ڈورا کے بقول "قہقہے شروع ہونے اور بچے کے لوگوں میں ذلت محسوس کرنے سے پہلے ہی کافکا نے تعریف کے لہجے میں کہا "تم کتنی پھرتی سے گرے اور کیسی مہارت سے اٹھ کھڑے ہوئے" کافکا کی یہ بات ڈورا کو عمر بھر یاد رہی کئی سال بعد اس نے لکھا "جب میں یہ الفاظ سوچتی ہوں تو ان میں پنہاں معانی بتاتے ہیں کہ ہر چیز بچائی جا سکتی ہے' سوائے کافکا کے' کافکا کو نہیں بچایا جا سکتا تھا"۔[1]

کافکا گرمیوں کی تعطیلات کے بعد گھر لوٹا تو وہ بہت پر جوش اور پر امید تھا اس نے تمام بندشوں کو توڑ کر برلن میں زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا اور اس نے اپنے دوست میکس بروڈ کو لکھا کہ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اتنی خوشی محسوس کر رہا تھا ان دنوں وہ ڈورا کے ساتھ Steglitz کے قصبے میں مقیم تھا وہیں اس نے اپنی خوشگوار کہانی "چھوٹی عورت" لکھی۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک ایسی عورت تھی جو تمام عمر اپنی ہی انا کے ساتھ جو اس کے لیے قطعی اجنبی تھی برسرِ پیکار رہی دراصل یہ عورت کافکا کی مالک مکان تھی جو مسلسل اس جوڑے کے لیے مشکلات پیدا کر رہی تھی۔ چھ ہفتے بعد یہ جوڑا ایک خاتون معالج رتھبرگ (Rethberg) کے ساتھ اس کے گھر میں ٹھہر گیا جو کافکا کی تخلیقی عظمت کی مداح تھی۔ یہ وہ دور تھا جس میں کافکا نے ایسی خود مختاری حاصل کی جس کا خواب وہ برسہا برس سے دیکھ رہا تھا۔ یعنی اپنے باپ کی آمریت سے آزاد زندگی کی سلطنت۔ ان دنوں کافکا زندگی کو اپناتا ہوا نظر آتا ہے۔ میکس بروڈ نے اسے ایک اشاعتی ادارے 'Die Schmieze' سے متعارف کرایا اور کافکا اپنی کتاب شائع کرانے پر رضامند ہو گیا۔ Villi کو انتہائی خوشگوار خط لکھا۔ جب موسم خوشگوار ہوتا کافکا اور ڈورا اکٹھے سیر پہ نکلتے ایک دن جب وہ قریبی پارک میں گئے تو ایک بچی کو روتے ہوئے دیکھا۔ ڈورا کے مطابق "فرانز نے اس سے رونے کا سبب پوچھا جس سے ہمیں معلوم ہوا کہ اس کی گڑیا گم ہو گئی ہے اچانک کافکا نے ایک کہانی گھڑی اور گڑیا کے گم ہونے کا جواز بتایا "تمہاری گڑیا ایک سفر پر نکلی ہے' میں جانتا ہوں کیونکہ گڑیا نے مجھے خط لکھا ہے" معصوم بچی تذبذب کا شکار نظر آئی "کیا وہ خط آپ کے پاس ہے؟" "نہیں میں غلطی سے اسے گھر چھوڑ آیا ہوں لیکن میں کل وہ خط اپنے ساتھ لاؤں گا" بچی اب تجسس میں پڑ کر اپنی پریشانی بھول چکی تھی۔ کافکا فوراً گھر لوٹا۔ اسی سنجیدگی کے ساتھ رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر خط لکھنا شروع کیا جیسی توجہ سے اپنا تخلیقی کام کرتا تھا اگلے دن وہ خط لے کر پارک میں گیا تو بچی اس کا انتظار کر رہی تھی بچی کو پڑھنا نہیں آتا تھا اس لیے اس نے بلند آواز میں پڑھ کر گڑیا کا خط سنایا گڑیا نے خط میں لکھا تھا کہ وہ مسلسل ایک ہی خاندان کے ساتھ رہ کر اکتا چکی تھی اور فضا کی تبدیلی چاہتی تھی اس لیے گھر سے دور جانا پڑا اور یہ کہ بچی سے گڑیا کو بہت پیار تھا لیکن اس سے جدا ہونے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ گڑیا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر روز اسے خط لکھا کرے گی یوں کافکا ہر روز گڑیا کی طرف سے ایک نیا خط لکھتا اور کوئی نیا واقعہ بیان کرتا چند روز تک بچی کو کھوئی ہوئی گڑیا کے نقصان کا اتنا احساس نہ رہا اور گڑیا کے خط میں دلچسپی بڑھتی گئی گڑیا بڑی ہوئی' سکول گئی' نئے نئے لوگوں سے ملی اور بچی کو اپنی محبت کا یقین دلاتی رہی تقریباً تین ہفتوں تک یہ سلسلہ جاری رہا کافکا اس سلسلے کو بڑی احتیاط سے پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا کیونکہ اس کا مقصد اس انتشار کو نظم میں بدلنا تھا جو گڑیا کے کھو جانے سے پیدا ہوا تھا۔ وہ گھنٹوں میز پر بیٹھا' ہاتھوں میں سر تھامے سوچتا رہتا' بہت زیادہ کشمکش و پیچ کے بعد کافکا نے گڑیا کی شادی کا فیصلہ کیا۔ ایک نوجوان کا ذکر کیا' منگنی کی رسم ہوئی دیہات میں شادی کی تیاریوں کی تفصیل اور پھر نوجوان جوڑے کے گھر کا جزئیات کے ساتھ ذکر کیا گڑیا نے کہا تھا "تم خود سمجھ سکتی ہو اب ہمارا ایک دوسرے سے رابطہ مشکل ہو گا"۔ ڈورا کے الفاظ میں "کافکا نے اپنے فن کے ذریعے ایک بچے کی کشمکش ختم کر دی دنیا کو کسی نظم میں لانے کے لیے بھی اس کے پاس یہی بہترین انداز تھا"۔[۲]

۱۹۲۳ء کے موسم سرما میں بیماری کی شدت میں اضافہ ہو گیا یہ اس کا آخری موسم سرما بھی تھا۔ اس کی بیماری آخری مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔ ان دنوں ڈورا ڈائمنٹ نے میکس بروڈ کو بتایا کہ "ہر مرتبہ جب کافکا اس پر سکون قصبہ (Steglitz) سے برلن جاتا ہے تو وہاں سے ایسے لوٹتا ہے جیسے میدانِ جنگ سے آ رہا ہو...... اس نے ایسے کرب اور اذیت کے ساتھ زندگی گزاری ہے کہ وہ اپنی اس زندگی میں ہزاروں بار مرا ہو گا" کافکا کا واحد معاشی وسیلہ اس کی پنشن تھی اور انتہائی مجبوری کی حالت میں اپنے خاندان کی کسی

مالی امداد کو قبول کرتا تھا۔ اسے اپنی کمزور معاشی خودمختاری انتہائی عزیز تھی۔ ۱۹۲۳ء کی کرسمس کی چھٹیاں اس کے لیے شدید بخار کا سندیسہ لے کر آئیں اور گرتی ہوئی دیوار بدن کو مزید کھوکھلا کر گئیں سترہ مارچ کو اسے پراگ میں والدین کے گھر لایا گیا اور باقاعدہ علاج شروع ہوا۔ بعد ازاں سینی ٹوریم میں داخل کروایا گیا پھر ویانا کلینک لے جایا گیا لیکن اس کلینک میں 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' والا معاملہ ہوا۔ کچھ یہاں اس کا علاج بھی بہتر انداز میں نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے لیے کوئی کمرہ خالی نہیں تھا اس لیے اسے جنرل وارڈ میں رکھا گیا۔ اس صورتحال کے پیش نظر اسے کیزیگ میں ایک سینی ٹوریم میں داخل کروایا گیا۔ یہاں ایک خوبصورت اور رنگا رنگ پھولوں سے سجے ہوئے کمرے میں کافکا نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے وہ اپنے مرض کی سنگینی سے آگاہ تھا لیکن آخری وقت تک اپنی حسِ مزاح اور حسنِ فطرت سے لگاؤ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ مثلاً اگر کوئی اس کی زبوں حالی پر اظہار ہمدردی کرتا تو وہ اپنی مالی نا آسودگیوں کو مزاحیہ انداز میں بیان کرنے لگتا مثلاً ایک بار اسی طرح کی گفتگو میں اس نے میکس برود سے مل کر ایک چھوٹا سا ہوٹل چلانے کا منصوبہ بنایا جس میں اس کی شریکِ حیات ڈورا کھانا پکائے گی اور وہ خود وہاں ویٹر گیری کرے گا۔

آخری چند ہفتوں میں اسے وقفے وقفے سے خون آلود کھانسی کے دورے پڑتے تھے جس سے اس کے پھیپھڑوں میں شدید درد اٹھتا تھا اور وہ بستر پر لوٹنے لگتا تھا ڈاکٹر آسکر بیک اور پروفیسر نیومین کو بطور خاص اس کے علاج کے لیے بلایا گیا لیکن انھوں نے واضح طور پر ڈورا ڈائمنٹ کو بتایا کہ کافکا اب چند دن کا مہمان ہے اس کے پھیپھڑے قابلِ علاج نہیں رہے تھے آخری ایام میں اسے کم بولنے کی ہدایت کی گئی تھی وہ اپنے دوستوں سے کاغذ پر انتہائی مختصر جملے لکھ کر گفتگو کرتا تھا بعد میں یہ رقعات "Conversation Slips" کے نام سے چھپ کر سامنے آئے مثلاً ایک دفعہ اس نے لکھا ''کہانی کا عنوان اب بدل رہا ہے یہ اب یوں ہوگا'' گلوکارہ جوزیفائن اور چوہوں کی قوم''..... گو ایسے ضمنی نام جاذبِ نظر نہیں ہوتے لیکن اس معاملے میں اس کا خاص مفہوم ہے''ایک چٹ پر ڈورا کو لکھا ''مجھے حوصلہ دینے کے لیے میری پیشانی پر ہاتھ رکھو' اسی طرح رابرٹ کلوپسٹک اور ڈورا کے لیے تشکر آمیز اداس جملے لکھے ''تم کب تک میرے سرہانے کھڑے رہ سکتے ہو میں کب تک تم کو اس طرح اپنی خاطر کھڑے دیکھ سکتا ہوں۔ بلاشبہ یہ بات مجھے بہت دُکھ دیتی ہے کیونکہ تم سب میرے لیے بہت اچھے ہو''۔

اپریل کے آخر میں اس نے ڈورا کے والد کو خط لکھا کہ وہ ڈورا سے شادی کرنا چاہتا تھا اور اس نے وضاحت کی تھی کہ اگرچہ وہ ایک راسخ العقیدہ یہودی نہیں تھا لیکن وہ اپنی مذہبی غفلت پر نادم تھا اور اپنے آپ میں تبدیلی لانا چاہتا تھا آخر میں اس نے درخواست کی تھی کہ اسے اس جیسے پارسا انسان کے خاندان کا فرد بننے کا اعزاز بخشا جائے۔ ڈورا کے والد نے مشورے کے لیے اس کا خط لیا اور مذہبی باپ سے رجوع کیا۔ اس نے یہ خط پڑھا اور مختصر ترین جواب دیا ''نہیں''

جب ۱۲ مئی ۱۹۲۴ء کو میکس برود کافکا کے پاس پہنچا تو ڈورا کے والد کا انکار پر مشتمل خط تھوڑی دیر پہلے پہنچا تھا کافکا کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی کہ شادی کے لیے ڈورا کے والد کی اجازت ضروری نہ تھی۔ اس کے لیے معاملہ اتنا سادہ نہیں تھا۔ اس کے لیے یہ ایک اور شکست تھی ایک ''باپ'' سے سندِ قبولیت حاصل کرنے میں ایک اور ناکامی۔ میکس برود نے اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کی تھوڑی دیر بعد ڈورا اسے ایک طرف لے گئی اور بتایا کہ اس نے رات کو فرانز کی کھڑکی میں ایک اُلو دیکھا' موت کا پرندہ۔ لیکن فرانز جینا چاہتا تھا اور میکس کے لیے یہ بات باعثِ حیرت تھی کہ وہ ڈاکٹر کی ہدایات پر بغیر کسی احتجاج کے سختی سے عمل کر رہا تھا یہ خلافِ معمول بات تھی۔ اس خوشگوار تبدیلی کا سرچشمہ ڈورا کی ذات تھی۔ بقول میکس برود ''وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے حیرت انگیز

طور پر موافق تھے ڈورا کا مذہبی پس منظر اور سوجھ بوجھ کافکا کے لیے کشش کا باعث تھے اسی طرح نوجوان ڈورا جو ابھی مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ نہیں جانتی تھی اس کے لیے کافکا ایک ایسا استاد تھا جس کی ہمیشہ اس نے خواہش کی تھی۔ وہ اس کے لیے بے پناہ محبت اور احترام کے جذبات رکھتی تھی وہ تجسس آمیز خوابوں میں رہتی اور اس کھیل کو پسند کرتی تھی دونوں ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے' مثال کے طور پر مجھے یاد ہے کہ کس طرح دونوں ایک ساتھ اپنے ہاتھ بیسن میں ڈبو کر کہتے 'پورا خاندان غسل کر رہا ہے' ڈورا نے مجھے بتایا کہ فرانز کس طرح خوشی کے ساتھ چلا اٹھا جب بیماری کے آخری مرحلے میں ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ گلے کی حالت قدرے بہتر ہے۔ اس نے بار بار ڈورا کو گلے لگایا اور کہا کہ اس نے زندگی اور صحت کی اتنی خواہش پہلے کبھی نہیں کی جتنی اب ہے"۔ [۳]

یہاں کافکا اپنے داخلی وجود کی سطح پر زندگی کی طرف لوٹ آیا تھا۔ وہ اس دائمی یاس کے عفریت سے بھی چھٹکارا پا چکا تھا جو عمر بھر اس کا خون چوستا رہا لیکن یہ باطنی رجائیت اس کے کچھ کام نہ آئی کیونکہ اس وقت تک وہ جسمانی طور پر اپنے خاتمے کو التواء میں ڈالنے کی سکت کھو چکا تھا۔ گویا:

واپسی کی کوئی امید نہیں
گھر سے نکلے ہیں آنسوؤں کی طرح

رابرٹ جب ویانا سے اس کے لیے چیریاں اور اسٹرابری لے کر آیا۔ اس نے نہ صرف دونوں چیزیں خوشی خوشی کھائیں بلکہ دیر تک ہاتھوں میں پکڑ کر ان کی خوشبو سونگھتا رہا۔ پھر والدین کو خط لکھا اور اپنی بہتر دیکھ بھال کا یقین دلایا۔ ۳ جون کی صبح چار بجے وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ ڈورا نے رابرٹ کو جگایا جو فوراً ڈاکٹر کو بلا لایا ڈاکٹر نے 'Camphor' کا ٹیکہ لگایا۔ جب دوسرے ٹیکے سے بھی کوئی فرق نہ پڑا تو رابرٹ نے خط کے بہانے ڈورا کو یہ کہہ کر ڈاکٹا نے بھجوا دیا کہ کافکا بہر حال میں صبح کی ڈاک سے خط روانہ کرنا چاہتا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ کافکا نے رابرٹ سے وعدہ لے رکھا تھا کہ اس کے آخری لمحات میں ڈورا کو اس سے دور رکھے گا۔ درد کی شدت سے نڈھال کافکا نے اپنی تمام بچی کھچی طاقت سے برف کی تھیلی کو نوچ کر پھینک دیا اور مارفیا کا تقاضا کرنے لگا "مجھے اور اذیت نہ دو" وہ چلایا۔ چار سال سے تم مجھ سے وعدہ کرتے آئے ہو' جاؤ میں تم سے بات نہیں کرتا میں اس طرح مر رہا ہوں" رابرٹ نے دو ٹیکے لگائے مگر صورتحال کافکا کے اپنے کہے ہوئے الفاظ So the help goes away without helping" کی عملی تصویر بن چکی تھی۔ کافکا نے غصے سے کہا "مجھے دھوکا نہ دو' تم مجھے Antidote دے رہے ہو مجھے مار دو ورنہ تم قاتل کہلاؤ گے!" (Kill me either you will be a murderer!) رابرٹ نے ایک اور ٹیکہ لگایا جس سے وہ ذرا سنبھلا "یہ اچھا ہے' لیکن اور' اور' اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑ رہا' اور جب رابرٹ سرنج حاصل کرنے کے لیے بستر سے ہٹا تو وہ بولا "مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ"، "میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جا رہا" رابرٹ نے جواب دیا "لیکن میں جا رہا ہوں" کافکا نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ چند لمحوں بعد جب رابرٹ نے اس کا سر اپنے ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ وہ نیم بیہوشی میں سمجھا کہ اس کی بہن ایلی ہے۔ "ایلی دور ہو جاؤ' اس قدر قریب نہ بیٹھو' اس قدر قریب نہیں" اس نے سرگوشی کی۔ اسے ہمیشہ یہ خوف لاحق رہتا تھا کہ اس کی بیماری کے جراثیم کسی اور کو منتقل نہ ہو جائیں رابرٹ پیچھے ہٹ گیا "ہاں اس طرح' یہ اچھی بات ہے"۔ [۴]

آنے والے سالوں میں 'Willy Haas' نے اپنے مضمون "ایف کے کی موت' آخری ایام" میں سسٹرانا (Anna) کے حوالے سے کافکا کے آخری لمحات کے متعلق معلومات میں اضافہ کیا۔ سینی ٹوریم میں دم توڑنے والے مریضوں کی آنکھیں بند

کرنے کی ذمہ داری سسٹر اَنا کی تھی۔اس کے بیان کے مطابق جب وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ کافکا دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔تو پھولے سانسوں کے ساتھ ڈورا کمرے میں داخل ہوئی اس کے دونوں ہاتھ میں پھول تھے۔اس نے پھول اس کے چہرے کے سامنے رکھے "فرانز! خوبصورت پھولوں کو دیکھو ذرا سونگھ کر تو دیکھو"، ڈورا نے سرگوشی کی۔بقول سسٹر اَنا "مردہ آدمی نے خود کو اوپر اٹھایا' پھولوں کو سونگھا' اس کی بائیں آنکھ بھی دوبارہ کھلی' یہ ناقابلِ یقین تھا"۔[۵]

ڈورا نے نے اس کی دھڑکن کو نہایت مدھم اور پھر رکتے ہوئے محسوس کیا اور کافکا نے آخری سانس لی۔نرس نے کافکا کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ہمیشہ کے لیے بند کر دیں۔ڈورا میت سے لپٹ گئی "بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ فرانز مر جائے" اس نے کافکا کی اجڑی حالت دیکھی "وہ کبھی بھی ایسا نظر نہیں آنا چاہتا تھا" دراز سے کافکا کا پسندیدہ ہیئر برش نکالا اور اس کے بال سنوارے بقول رابرٹ ڈورا تمام رات سسکیاں بھرتی رہی "وہ میرے خدایا' میرا پیار' میرا پیار....." ڈورا نے کئی سال بعد لکھا۔"فرانز کی موت' میرے لیے اپنی موت کا تجربہ تھی"[۶] اور وہ کافکا کی موت کے بعد خود کو 'مسز کافکا' لکھتی تھی۔

فرانز کافکا کی لاش کو ایک چوبی تابوت میں پراگ لایا گیا۔گیارہ جون کو چار بجے سہ پہر کو یہودیوں کے قبرستان میں دفنا دیا گیا۔بعد ازاں کافکا کے مسودات کو کھنگالتے ہوئے میکس بروڈ کو کافکا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو رقعے ملے ایک 1921ء کے بعد کی تحریر تھی جبکہ دوسرا رقعہ قدرے پرانا تھا اور تحریر بہت شکستہ تھی عبارت کچھ یوں تھی۔

"یہ میری آخری خواہش ہے کہ میرے تمام مسودات کو بغیر پڑھے جتنی جلدی ممکن ہو سکے جلا دیا جائے"۔

اپنی موت سے کچھ عرصہ پیشتر کافکا نے میکس بروڈ کو ایک خط میں بھی یہی بات کہی تھی۔

"عزیز میکس! میری تم سے آخری استدعا ہے کہ میری الماریوں میں' درازوں میں' میرے کمروں میں' دفتر میں یا جہاں بھی میری کوئی تحریر' روزنامچوں مسودات' خطوط یا کسی بھی اور صورت میں تمہیں ملے اُسے بغیر پڑھے جلا دو جو لوگ میرے خطوط واپس کرنے سے انکار کریں ان سے انھیں جلد جلا دینے کا وعدہ لو.....تمہارا فرانز"۔[۷]

میکس بروڈ نے بغیر کسی خاص ہچکچاہٹ کے کافکا کی وصیت کو پسِ پشت ڈال دیا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میکس بروڈ کافکا کی زندگی میں اس کی یہ خواہش پوری کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کر چکا تھا۔یوں اسے کافکا کی جو تحریریں اس نے شائع کرا دی۔

حوالہ جات

۱۔ Kathe Diamnt, Kafka's last love, Newyork Basic Books, 2003, P, 9.

۲۔ ایضاً، ص 51-52

۳۔ Max Brod, The Biography of Franz Kafka, London Secker & Warburg, 1947, P. 162.

۴۔ Kathe Diamnt, Kafka's last love Newyork, Basic Books, 2003, P. 118, 119.

۵۔ ایضاً، ص 120

۶۔ ایضاً، ص 121

۷۔ Max Brod, The Biography to Franz Kafka, London: Secker & warburg, 1947, P. 65

خطوطِ مشفق خواجہ بنام مرزا خلیل احمد بیگ

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ

مشفق خواجہ نے متنوع علمی موضوعات پر کام کیا ہے جن میں تحقیق ایک ایسا موضوع ہے جس سے انھیں خاص دلچسپی تھی؛ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بنیادی طور پر ایک محقق تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ اپنے تحقیقی کاموں ہی کی وجہ سے، کہ وہ متاثر نہ ہونے پائیں، انھوں نے انجمن ترقیِ اردو (پاکستان) سے، جہاں وہ مددگار معتمد (اسسٹنٹ سکریٹری) کے عہدے پر فائز تھے، گلوخلاصی لے لی تھی۔ تحقیق کے ساتھ انھیں تدوینِ متن سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی، اور یہ دونوں کام انھوں نے بہ طریقِ احسن انجام دیے جس سے بر صغیر میں دور دور تک ان کی شہرت پھیل گئی۔ وہ ایک خوش فکر شاعر بھی تھے اور ایک معتبر ناقد کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا معتد بہ حصہ کالم نگاری میں صرف کیا اور مختلف اخبارات و رسائل میں ادبی و سیاسی نوعیت کے کالم لکھے جن کی تعداد خود انھی کے قول کے مطابق "دو ہزار سے زائد" ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے ریڈیو پاکستان کے لیے مختلف موضوعات پر اسکرپٹس بھی لکھیں جن کی تعداد تقریباً ایک ہزار بتائی جاتی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کالم نگاری کو وہ پسند نہ کرتے تھے، اور نہ ہی اسے وہ اپنی "پہچان" بنانا چاہتے تھے۔

مشفق خواجہ نے تقریباً ایک درجن تصنیفات و تالیفات اپنی یادگار چھوڑی ہیں، جن کے نام یہ ہیں: ۱-تذکرۂ 'خوش معرکۂ زیبا' از سعادت حسن ناصر (تدوین دو جلدوں میں، ۱۹۷۰ اور ۱۹۷۲ء)، ۲-'پرانے شاعر نیا کلام' (تحقیق: یہ کتاب قسط وار سہ ماہی 'غالب'، کراچی میں اشاعت پذیر ہوئی، ۷۶-۱۹۷۵ء)، ۳- 'ابیات' (مجموعۂ کلام ۱۹۷۸ء)، ۴-'اقبال' از احمد دین (تدوین ۱۹۷۹ء)، ۵- 'جائزۂ مخطوطاتِ اردو' (جلدِ اول ۱۹۷۹ء)، ۶- 'غالب اور صفیر بلگرامی' (۱۹۸۱ء)، ۷-'تحقیق نامہ' (تحقیقی مقالات کا مجموعہ ۱۹۹۱ء)، ۸- 'خامہ بگوش کے قلم سے' (کالموں کا انتخاب: مرتبہ مظفر علی سید، ۱۹۹۵ء)، ۹- 'کلیاتِ یگانہ' (تدوین ۲۰۰۳ء)، ۱۰-'سخن ہائے ناگفتنی' (کالموں کا انتخاب: مرتبہ مظفر علی سید، ۲۰۰۴ء)، ۱۱-'سخن در سخن' (کالموں کا انتخاب: مرتبہ مظفر علی سید، ۲۰۰۴ء)، ۱۲۔'سخن ہائے گسترانہ' (کالموں کا انتخاب: مرتبہ ڈاکٹر انور سدید، ۲۰۰۷)، ۱۳۔'سن تو سہی' (کالموں کا انتخاب: مرتبہ ڈاکٹر انور سدید/خواجہ عبدالرحمٰن طارق)

علاوہ ازیں خواجہ صاحب نے مرزا یگانہ کے مضامین اور خطوط بھی مرتب کیے اور 'جائزۂ مخطوطاتِ اردو' کی جلدِ دوم بھی تیار کی، نیز 'فرمانِ سلیمانی' (روزنامچہ مرزا سلیمان قدر، نوشتہ لطافت لکھنوی) کی تدوین کا کام بھی پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

مشفق خواجہ، جن کا اصلی نام خواجہ عبدالحی تھا، ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء کو لاہور میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں پائی۔ وہ

۱۹۴۸ء میں اپنے والدین کے ساتھ کراچی منتقل ہو گئے اور بی۔اے (آنرز) اور ایم۔اے (اردو) کی اسناد کراچی یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ابھی وہ پوری طرح فارغ التحصیل بھی نہ ہو پائے تھے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق (م ۱۹۶۱ء) کی نظرِ انتخاب اُن پر پڑ گئی اور انھوں نے انجمن ترقیِ اردو (پاکستان) کے مددگار معتمد کی حیثیت سے ان کا تقرر کر دیا۔خواجہ صاحب کی انجمن سے وابستگی ۱۹۷۳ء تک قائم رہی۔اس کے بعد سے وہ اپنے ذاتی علمی و تحقیقی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، یہاں تک کہ آخری گھڑی بھی آ گئی۔کراچی کے آغا خاں ہسپتال میں چند گھنٹے موت سے نبرد آزما رہنے کے بعد مشفق خواجہ نے ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو سفرِ آخرت اختیار کیا۔

مشفق خواجہ ایک نہایت زندہ دل شخصیت کے مالک تھے۔شگفتگی، خوش طبعی، اور بذلہ سنجی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔گل افشانیِ گفتار کے بھی وہ دھنی تھے۔ان کے طنز و مزاح کی بھرپور جھلک ان کے فکاہیہ کالموں میں دیکھی جا سکتی ہے۔انھوں نے کراچی کے روزنامہ 'جسارت' اور بعد میں وہیں سے شائع ہونے والے ہفت روزہ 'تکبیر' میں ''سخن در سخن'' کے عنوان اور 'خامہ بگوش' کے نام سے جو مشہور زمانہ ادبی کالم لکھے ان میں ظرافت کے ساتھ ساتھ طنز کا عنصر بھی نمایاں تھا جسے بعض ادیبوں نے تمسخر سمجھا اور اپنی سخت برہمی کا اظہار کیا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کالم ہرگز اس خیال سے نہیں لکھے گئے تھے کہ کسی کو ہدفِ تضحیک و تمسخر بنایا جائے یا کسی کی دل آزاری کی جائے۔ان کی اس قسم کی تحریروں (کالموں) کو شگفتہ نگاری کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ساقی فاروقی نے 'خامہ بگوش' کو مشفق خواجہ کے ''رنگیلے ہمزاد'' سے تعبیر کیا ہے۔ان کی تحریروں سے قطع نظر، ان کی گفتگو میں بھی مزاح کی چاشنی صاف نظر آتی تھی۔

مشفق خواجہ بہت ہی مخلص انسان تھے۔وہ ہر شخص سے بہت محبت و خلوص سے ملتے تھے۔علمی کاموں میں دوسروں کی مدد کرنا انھوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا۔وہ اپنے دوستوں، ادیبوں، تحقیق کاروں اور ضرورت مندوں کو زرِ کثیر خرچ کر کے ان کی ضرورت اور پسند کی کتابیں مسلسل فراہم کرتے رہتے تھے، اور یہ سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا۔انھوں نے نام و نمود کی کبھی کوئی فکر نہ کی اور جاہ و منصب سے بھی ہمیشہ بیزار رہے۔وہ جلسے جلوس سے بھی بہت گھبراتے تھے۔خوشامد، جوڑ توڑ اور گروہ بندی سے بھی وہ ہمیشہ دور رہے۔انھوں نے ایک سادہ اور گوشہ نشینی کی زندگی گزاری۔خطوط نویسی سے انھیں بے حد شغف تھا۔وہ خطوں کے جواب بڑی پابندی سے دیتے تھے اور خود بھی خط لکھتے تھے۔جب بھی کوئی شخص انھیں کوئی کتاب یا رسالہ بھیجتا تو اس کی رسید سے وہ اسے فوراً مطلع کرتے تھے۔انھوں نے اپنے دوستوں، ادیبوں، دانشوروں اور مشاہیر و معاصرین، نیز دیگر اہلِ علم کو تا دمِ آخر ہزاروں خطوط لکھے ہوں گے۔وہ یونیورسٹیوں کے اساتذہ، طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کو بھی خط لکھ کر ان کی علمی معاونت کرتے تھے۔

مشفق خواجہ کی وفات کے بعد ان کے چاہنے والے ان کے خطوط کو مسلسل شائع کروا رہے ہیں۔مختلف رسائل میں شائع شدہ سیکڑوں خطوط سے قطع نظر، ان کے خطوط کے اب تک تین مجموعے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں جن کے نام یہ ہیں:

۱- 'مشفق نامے' (خطوط بنام محمد عالم مختار حق [لاہور: اردو اکادمی، ۲۰۰۶ء])۔

۲- 'خطوطِ مشفق' (خطوط بنام طیب منیر [اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۰۷ء])۔

۳- 'مکاتیبِ مشفق خواجہ' (خطوط بنام رفیع الدین ہاشمی [لاہور: ادارۂ مطبوعاتِ سلیمانی، ۲۰۰۸ء])۔

اپنی تمام تر علمی و ادبی مصروفیات کے باوصف مشفق خواجہ کو فوٹو گرافی کا بہت شوق تھا۔ مشاہیرِ علم و ادب اور احباب کی تصویریں وہ اپنے کیمرے سے خود اُتارتے تھے۔ ان کے قول کے مطابق صرف فیض احمد فیضؔ کی ان کے پاس تقریباً پانچ سو تصویریں تھیں جو انھوں نے اپنے کیمرے سے خود لی تھیں۔

مشفق خواجہ سے میرا غائبانہ تعارف اس وقت ہوا جب ہند و پاک کے رسائل میں ان کی بعض تحریریں میری نظر سے گزریں۔ یہ ۱۹۸۰ء کے آس پاس کی بات ہے؛ لیکن ان سے میری مراسلت کا سلسلہ اس کے تین سال بعد شروع ہوا جب میں نے اپنی کتاب 'زبان، اسلوب اور اسلوبیات' (۱۹۸۳ء) کا ایک نسخہ انھیں ہدیۃً ارسال کیا۔ اس کے بعد سے ہم ایک دوسرے کو برابر خط لکھتے رہے اور یہ سلسلہ ان کے انتقال سے چند ماہ قبل تک جاری رہا۔ مشفق خواجہ ۱۹۸۵ء میں جب اپنی بیگم آمنہ مشفق کے ہمراہ ہندوستان آئے تو علی گڑھ بھی تشریف لائے؛ اور یہیں ان سے میری پہلی بار ملاقات ہوئی۔ میں نے انھیں نہ صرف بے حد خوش مزاج و خوش طبع پایا بلکہ وہ نہایت خوب رو و خوش لباس بھی نظر آئے۔ وہ لطیف انداز میں گفتگو کرتے تھے اور اپنی حسِ مزاح اور چبھتے ہوئے جملوں اور فقروں سے سامعین کو ہنسنے اور مسکرانے پر مجبور کر دیتے تھے۔

جون ۱۹۸۹ء میں جب میں اپنے اعزہ سے ملنے کراچی گیا تو مشفق خواجہ سے بھی نیاز حاصل کرنے ان کے دولت کدے ۳-ڈی، ۲۱/۹ ناظم آباد پہنچا۔ ان کے ڈرائنگ روم میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں؛ دیواروں سے ملی ہوئی الماریوں اور ریکس میں نیچے سے اوپر تک کتابیں ٹھسی ہوئی تھیں۔ خواجہ صاحب نے دورانِ گفتگو مجھے بتایا کہ 'اس گھر میں بارہ کمرے ہیں، پھر بھی رہنے کا کوئی کمرہ نہیں۔'' میں ان کے گھر شام کے وقت پہنچا تھا۔ جون کا مہینہ تھا اور اُس روز سخت اُمس تھی۔ باتوں ہی باتوں میں کافی وقت گزر گیا۔ جب انھیں اچانک گرمی کی شدت کا احساس ہوا تو بولے، 'ارے، میں نے آپ کو کوئی چیز پیش نہیں کی''۔ [اُن کے اِس جملے نے مجھے چونکا دیا اور اس کا مطلب میری سمجھ میں نہ آیا]، پھر وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور ڈرائنگ روم ہی میں ایک کونے میں رکھے ہوئے ریفری جریٹر میں سے کولڈ ڈرنک کی ایک ٹھنڈی بوتل نکال لائے اور میری طرف بڑھا دی۔

خواجہ صاحب بلا کے مہمان نواز تھے۔ وہ اپنے مہمانوں کی ضیافت کا بہ طورِ خاص خیال رکھتے تھے اور انھیں کراچی کے کسی اچھے سے ریستوراں میں کھانے پر مدعو کرتے تھے۔ کراچی کے میرے دورے کے دوران (جون-جولائی ۱۹۸۹ء)، مجھے ان کے ساتھ اس طرح کے کئی ظہرانوں اور عشائیوں میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ، اپنی کار میں بٹھا کر، کراچی کے کئی ادبی جلسوں اور دعوتوں میں لے گئے جن میں نیاز، غالب لائبریری اور انجمن ترقیِ اردو (پاکستان) کے جلسے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ حکیم محمد سعید اور راغب شکیب کے دولت کدوں پر جو محفلیں آراستہ ہوئیں اور ضیافتوں کا اہتمام ہوا، ان میں بھی میں خواجہ صاحب کی ہی معیت میں پہنچا۔ خواجہ صاحب کی یہ سب باتیں، خوش گوار یادیں بن کر ذہن پر نقش ہو چکی ہیں۔

مشفق خواجہ نے میرے کراچی کے دورانِ قیام میں علم و ادب کی نہ جانے کتنی شخصیتوں سے مجھے متعارف کرایا (جن سے میرا محض غائبانہ تعارف تھا)۔ ان معروف شخصیات میں سے بعض اب اس دنیا سے کوچ کر چکی ہیں، مثلاً ابواللیث صدیقی، ابوالخیر کشفی، شان الحق حقی، سہیل بخاری، سید قدرت نقوی، صہبا لکھنوی، شہزاد منظر، نورالحسن جعفری، مختار زمن، آفتاب احمد خاں، منظر علی خاں، جمیل اختر خاں، وغیرہ۔ ان سب کی ''حق مغفرت کرے''!

مشفق خواجہ اگرچہ اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں بے حد مصروف رہتے تھے، لیکن خط لکھنے میں یا خطوں کے جواب دینے میں

وہ نہایت مستعد نظر آتے تھے۔ میں نے انھیں جتنے بھی خط لکھے ان میں شاید ہی کوئی ایسا خط ہوگا جس کا انھوں نے جواب نہ دیا ہو۔ بسا اوقات وہ خود سے بھی خط لکھتے تھے۔ اسی لیے وہ میری آنکھوں سے کبھی اوجھل نہ ہوئے تھے اور ان کی یاد دل میں ہمیشہ تازہ رہتی تھی۔ وہ خط ہمیشہ چھپے ہوئے لٹر پیڈ پر لکھتے تھے، لیکن انھوں نے اس پر کبھی اپنا نام نہیں چھپوایا۔ سرنامے کی دائیں جانب صرف ان کا پتا، ''۳-ڈی، ۲۱/۹ ناظم آباد، کراچی'' چھپا ہوتا تھا۔ ان کی تحریر اگرچہ بہت خوش خط نہ تھی، لیکن ایسی ضرور تھی کہ اسے بہ آسانی پڑھا جا سکے۔ بعض الفاظ وہ اپنے مخصوص انداز سے لکھتے تھے، مثلاً انگریزی لفظ ''سے می نار'' (Seminar) یا عربی ''ان شاءاللہ'' وغیرہ۔ وہ خطوں پر تاریخ ہمیشہ خط کے آخر میں اپنے نام (دستخط) کے نیچے ڈالتے تھے۔ یہ ان کا ہمیشہ کا دستور تھا۔ علاوہ ازیں وہ تاریخ ڈالتے وقت مہینے کا نام بھی ہندسے ہی میں لکھتے تھے، مثلاً: ''۲۷-۳-۸۵ء''، یعنی ۲۷/مارچ ۱۹۸۵ء۔ وہ خط کی ابتدا ہمیشہ القاب و آداب سے کرتے تھے، مثلاً مکرمی ومحترمی''، ''برادرِ عزیز و مکرم''، یا ''عزیز مکرم''، وغیرہ۔ اس کے بعد ''سلام مسنون'' (زیادہ تر) یا ''تسلیمات'' (کبھی کبھی) لکھتے تھے۔ مکتوب الیہ کا نام اور پتا وہ خط ختم کرنے کے بعد دائیں جانب نیچے لکھتے تھے۔ خطوں کی ترسیل کا ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کئی کئی خط ایک ساتھ علی گڑھ میں کسی ایک شخص کے پاس بھجوا دیتے تھے، یا ڈاک سے بھیج دیتے تھے اور وہ شخص ان خطوط کو متعلقہ اشخاص تک پہنچا دیتا تھا۔ اکثر کراچی سے علی گڑھ آنے جانے والا شخص مشفق خواجہ کے نامہ بر کا فریضہ انجام دیتا۔

مشفق خواجہ سے میری مراسلت کا سلسلہ تقریباً بیس سال قائم رہا۔ اس دوران میں، ایک اندازے کے مطابق ان کے تقریباً ڈیڑھ دو درجن خطوط مجھے موصول ہوئے ہوں گے، لیکن شومیِ قسمت کہ ڈھونڈنے سے ان کے صرف گیارہ خطوط ہی مل سکے۔ ہر خط کے اوپر ان کا پتا اصل کے مطابق ایک سطر میں درج کر دیا گیا ہے۔ نیچے تاریخ بھی اسی طرح دی گئی ہے جس طرح سے کہ وہ لکھتے تھے۔ ''آپ کا مخلص''، ''آپ کا خیر اندیش''، ''خیر اندیش''، وغیرہ کو ان کے نام (دستخط) کے ساتھ ایک ہی سطر میں لکھ دیا گیا ہے۔ ہر خط کے بعد ضروری حواشی بھی دیے گئے ہیں جو بے حد معلومات افزا ہیں۔ خط ختم کرنے کے بعد نیچے دائیں جانب وہ مکتوب الیہ کا پورا نام اور پتا لکھتے تھے جسے حذف کر دیا گیا ہے کہ ہر خط میں اس کی تکرار نامناسب معلوم ہوتی۔

(مرزا خلیل احمد بیگ)

۳-ڈی، ۲۱/۹ ناظم آباد، کراچی-۱۸

محترمی ومکرمی، سلام مسنون

آپ کی گراں قدر تصنیف 'زبان، اسلوب اور اسلوبیات'[1] مل گئی تھی۔ معذرت خواہ ہوں کہ اس کرم کا شکریہ خاصی تاخیر سے ادا کر رہا ہوں۔ گزشتہ چند ماہ بعض ایسی معروفیات کی نذر ہوئے کہ میں کوئی کام معمول کے مطابق نہ کر سکا۔ بہر حال اس دوران میں نے آپ کی کتاب کا مطالعہ کیا، اور خوش ہوں کہ ایک نئی دنیا کی سیر کی، اور اس سے میرے علم میں اضافہ ہوا۔ آپ کے اسلوبیاتی مطالعے آپ کے گہرے علم کے ساتھ ساتھ آپ کے اعلیٰ ذوق کے بھی عکاس ہیں، ورنہ عموماً صرف لسانی دلچسپی ادب کے جمالیاتی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔

آپ کوتو 'اسلوب' سے علمی دلچسپی ہے، نام کی حد تک میں بھی اس لفظ کو پسند کرتا ہوں، یعنی اس نام کا ایک رسالہ شائع کرتا ہوں۔ اس کا تیسرا شمارہ بھیج رہا ہوں۔ [۲] اگر آپ اس رسالے کے لیے لکھیں گے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا مخلص مشفق خواجہ

۲۷-۳-۸۵ء

۱- اسلوبیاتی تنقید کے موضوع پر میری کتاب 'زبان، اسلوب اور اسلوبیات' جس کا پہلا ایڈیشن علی گڑھ سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔

۲- اس رسالے کا نام 'اسلوب' تھا۔ اس کے پانچ ضخیم شمارے 'تخلیقی ادب' کے نام سے مکتبہ اسلوب، کراچی سے ۱۹۸۰ تا ۱۹۸۵ء شائع ہوئے۔ یہ شمارے ہم عصر تخلیقی ادب کے جائزوں اور منتخب علمی و ادبی نیز تنقیدی تحریروں پر مشتمل ہیں۔

۳

۳- ڈی، ۳۱/۹ ناظم آباد، کراچی-۱۸

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یاد رکھا۔ ثاقب صاحب [۱] کے ذریعے آپ کی دو کتابیں اور 'ادیب' [۲] کے چند شمارے ملے۔ ان عنایات کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ آپ جس لگن، محنت اور توجہ کے ساتھ علمی کام کر رہے ہیں، اس کی جھلک ہمارے علمی اسلاف میں تو نظر آتی ہے، لیکن جدید نسل میں یہ خوبی نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ میں آپ کی تحریروں سے استفادہ کرتا رہتا ہوں اور اب دونوں نئی کتابوں سے بھی استفادہ کروں گا۔

ڈاکٹر مسعود حسین صاحب [۳] کے 'ارمغان' [۴] کے لیے میرا جی چاہتا ہے کہ لکھوں۔ اسی خیال سے ان کی آپ بیتی 'ورودِ مسعود' منگوا بھی لی تھی کہ یہ میری دلچسپی کی چیز ہے اور اس پر لکھنے میں مزا بھی آئے گا، لیکن بدقسمتی سے میرے حالات نے ساتھ نہ دیا۔ پہلے تو میں بیمار ہوگیا اور پھر ایک دم بہت سے مہمان آگئے۔ ان معروفیات کی وجہ سے مضمون نہ لکھا جاسکا۔ البتہ ایک ہلکی پھلکی چیز لکھی جو یہاں چھپ گئی۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب [۵] کے پاس اور یونیورسٹی لائبریری میں یہاں کا ہفت روزہ 'تکبیر' باقاعدگی سے بھیجا جاتا ہے۔ اس میں میرا تبصرہ شائع ہو رہا ہے۔ ایک قسط شائع ہوچکی ہے اور دوسری اگلے چند روز میں شائع ہوگی۔ یہ کالم میں جو لکھتا ہوں، اس کا ایک خاص مزاج ہے جسے آپ "غیر سنجیدگی" سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ آپ کو یا ڈاکٹر صاحب کو پسند آئے گا کہ نہیں، بہر حال میں نے اس میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ 'ورودِ مسعود' اردو کی چند بہترین آپ بیتیوں میں سے ہے۔ [۶]

آپ کا مضمون "بیدی کی زبان" میں نے پڑھا۔ آپ نے اس موضوع پر لکھنے کا حق ادا کردیا ہے۔ میں اسے ششماہی 'غالب' میں شامل کر رہا ہوں۔ یہ رسالہ ادارۂ یادگارِ غالب کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ اس کا پہلا شمارہ گزشتہ سال شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک نسخہ آپ کے لیے اور ایک ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کے لیے ثاقب صاحب کے ذریعے بھیجتا ہوں۔

آپ کا ایک مضمون میرے پاس رکھا تھا، یہ میں نے کراچی کے رسالے 'دائرے' میں اشاعت کے لیے دے دیا تھا۔ امید ہے یہ رسالہ آپ کو ملتا ہوگا۔

'ادیب' بہت عرصہ پہلے میرے پاس آتا تھا۔ آپ نے تو اس کی ظاہری اور باطنی حالت بالکل بدل دی ہے۔ یہ اب پہلے سے بہت بہتر ہو گیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ کی عنایت سے یہ باقاعدگی سے ملتا رہے۔

علی گڑھ میں آپ سے ملاقاتوں کی یادیں ہنوز ذہن میں تازہ ہیں۔ اب جی چاہتا ہے کہ اگلی ملاقات آپ سے کراچی میں ہو۔ کبھی تشریف لائیے نا!

یہاں کی کسی کتاب کی آپ کو ضرورت ہو تو بلا تکلف لکھیے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش مشفق خواجہ

۲۱-۱-۸۹ء

مکرر:

یہ خط کئی دن سے لکھا رکھا ہے۔ خیال تھا کہ ثاقب صاحب آئیں گے تو ان کے حوالے کر دوں گا، مگر وہ نہیں آئے۔ اب یہ ڈاک سے بھیجتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی کتابوں کا ایک پیکٹ بذریعہ رجسٹری ارسال ہے۔ اس میں مخطوطِ رشید احمد صدیقی،(۷) کے دو نسخے ہیں۔ ایک آپ کے لیے اور ایک پروفیسر مسعود احمد خاں (۸) صاحب کے لیے۔ رسالہ 'غالب' بھی آپ دونوں کے لیے ہے۔ چار زائد نسخے بھی ہیں۔ ازراہِ کرم یہ ان تک پہنچا دیجیے جن کے نام ان پر لکھے ہیں۔

پیکٹ کی وصولی کی اطلاع مل جائے تو اچھا ہو!

مشفق خواجہ

۷-۲-۸۹ء

۱- ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب، استاد شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۲- میری ادارت میں شائع ہونے والا جامعۂ اردو، علی گڑھ کا علمی و تدریسی مجلّہ 'ادیب' (سہ ماہی)۔

۳- ڈاکٹر مسعود حسین خاں، اردو کے صفِ اول کے ادیب و لسانی پرداز، محقق اور ماہر لسانیات، نیز سابق پروفیسر و صدر اور ایمی ریٹس پروفیسر، شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۴- یہ ارمغان پروفیسر مسعود حسین خاں کی ستر ویں سال گرہ کے موقع پر 'نذرِ مسعود' کے نام سے علی گڑھ (تعلیمی مرکز) اور ملتان (نیکن بکس) سے علی الترتیب ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اسے میں نے مرتب کیا۔ اس میں ہند و پاک کے تین اہلِ علم کی نگارشات شامل ہیں۔

۵- ڈاکٹر مختار الدین احمد، سابق پروفیسر و صدر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۶- پروفیسر مسعود حسین خاں کی خود نوشت سوانح حیات 'ورودِ مسعود' پر مشفق خواجہ کا تبصرہ بعنوان 'روزہ بکھیر' (کراچی) کی دو اشاعتوں، ۲۶ جنوری اور ۲ فروری ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے 'ورودِ مسعود' کے بارے میں لکھا تھا کہ اسے "بلاشبہ اردو کی چند بہترین آپ بیتیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔" خواجہ صاحب کے اسی تبصرے کو میں نے "ورودِ مسعود: ایک بہترین آپ بیتی" کا عنوان دے کر 'نذرِ مسعود' میں شامل کر لیا تھا۔

۷- 'مخطوطِ رشید احمد صدیقی' مرتبہ لطیف الزماں خاں، اور شائع کردہ مجلسِ ادبیاتِ مشرق، کراچی، ۱۹۸۸ء۔

۸- مشفق خواجہ نے "مسعود حسین خاں" کے بجائے سہواً "مسعود احمد خاں" لکھ دیا ہے۔

﴿۳﴾

۲ -ڈی، ۳۱/۹ ناظم آباد، کراچی-۱۸

محترمی و کرمی، سلام مسنون۔

گرامی نامہ ملا۔ ممنون ہوں۔ خوشی کی بات ہے کہ میرا کالم آپ کو اور پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب کو پسند آیا۔ (۱) آپ کا خیال درست ہے کہ کالم کا خاتمہ یکا یک ہو جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ قلم برداشتہ لکھتا ہوں، طوالت متعین ہوتی ہے، جوں ہی خیال آتا ہے کہ عبارت مقررہ جگہ سے بڑھ رہی ہے، کالم ختم کر دیتا ہوں۔ اخباری تحریریں بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔ یہ جان کر مسرت ہوئی کہ آپ اسے 'نذرِ مسعود' میں شامل کر رہے ہیں۔ (۲) عنوان آپ خود ہی تجویز فرما لیجیے۔ دونوں قسطوں میں جو عنوانات ہیں، اخباری ہیں۔ آپ مختصر عنوان رکھ لیجیے۔ ابتدا میں صراحت کر دیجیے گا کہ یہ اخباری کالم ہے، ورنہ پڑھنے والے یہ کہیں گے کہ اس سنجیدہ محفل میں یہ مسخرہ کہاں سے آ گیا۔ دونوں کالموں کے درمیان خطِ فاصل بھی کھینچ دیجیے گا۔ پہلی قسط کے کالم نمبر ۱، سطر نمبر ۷ میں "والوں" غلط ہے۔ اس کی جگہ "والے" کر دیجیے۔

عسکری صاحب (۳) کے خط آپ نے پڑھے۔ مرحوم کو پروفیسر خواجہ منظور حسین (۴) سے خوامخواہ کی کد تھی۔ 'تخلیقی ادب' میں مَیں نے عسکری کے خطوط بنام ڈاکٹر آفتاب احمد (۵) شائع کیے تھے۔ ان میں بھی خواجہ صاحب کا ذکر "بہ رنگِ دیگر" ہے۔ بعض جملے فحش تھے جو مجھے حذف کرنے پڑے۔

آپ کا ایک مضمون "ذاکر صاحب: زبان اور اسلوب" میرے پاس رکھا ہے۔ کیا یہ ہندوستان کے کسی رسالے میں چھپ چکا ہے؟ اس صورت میں اسے یہاں کے کسی رسالے میں چھپوا دوں گا۔ اگر یہ غیر مطبوعہ ہے تو اسے اُس 'ارمغانِ علمی' میں شامل کر لوں گا جو ہم لوگ ڈاکٹر وحید قریشی (۶) کو پیش کر رہے ہیں۔ 'ارمغانِ علمی' میں مختلف موضوعات پر علمی و ادبی مضامین شامل کیے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں مَیں نے ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کو بھی خط لکھا تھا۔ معلوم نہیں انھیں ملا یا نہیں۔

آپ کی دو مطلوبہ کتابوں میں سے ایک 'خوشبو' مل گئی ہے۔ دوسری کی تلاش میں ہوں۔ جوں ہی ملی پیش کر دوں گا۔ پروین شاکر (۷) کی یہی ایک کتاب نہیں ہے، دو اور بھی ہیں۔ یہ بھی بھیج رہا ہوں۔ دو کتابیں شیخ منظور الٰہی (۸) کی بھی بھیج رہا ہوں۔ شیخ صاحب ہمارے ہاں کے بہت عمدہ نثر نگار ہیں۔ موضوع یادنگاری ہے۔ سفر، ذاتی حالات اور شخصیات کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ گوشہ نشین ہیں، اس لیے ان کی ادبی شہرت اتنی نہیں جتنی ہونی چاہیے۔ مجھے یہ کتابیں بہت پسند ہیں۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ آپ کی نظر سے بھی گذریں۔ ہندوستان کے دوستوں کو کتابیں بھیج کر مجھے خوشی ہوتی ہے۔ میں اسے حصولِ ثواب کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ اس لیے آپ بلا تکلف اپنی ضرورت کی کتابیں طلب فرمائیں۔ رہی یہ بات کہ میں بھی آپ سے کوئی کتاب منگواؤں تو اس کی ضرورت اس لیے نہیں پڑے گی کہ میرے پاس، میری دلچسپی کی تقریباً ہر ہندوستانی کتاب آ جاتی ہے۔ ہاں اگر کبھی کسی ایسی کتاب کی ضرورت ہوئی جو آسانی سے نہ مل سکی تو آپ کو زحمت دوں گا۔ میں نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ ہندوستانی کتابیں میرے پاس فوراً آ جاتی ہیں۔ 'وُرودِ مسعود' (۹) میرے پاس چھپتے ہی آ گئی تھی۔ 'شہیدِ جستجو' (۱۰) بھی میرے پاس ہے۔

'ورودِ مسعود' پر جب سے میرا کالم شائع ہوا ہے، یہاں کے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ کتاب کہاں سے ملے گی۔ مجھ سے عاریتاً مانگتے ہیں، لیکن میں کسی کو کتاب عاریتاً نہیں دیتا کیوں کہ اس سلسلے میں بعض تلخ تجربات ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے کہیے، اسے پاکستان میں چھپوانے کا انتظام کریں۔ اردو اکیڈمی، سندھ سے ان کی ایک کتاب چھپ چکی ہے۔ وہ اسے بھی چھاپ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے 'ورودِ مسعود' میں اپنے ایک "غیر سعادت مند" شاگرد کا ذکر کیا ہے، وہ کون ہیں؟ (۱۱)

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش مشفق خواجہ (۱۲)

۱- یہ مشفق خواجہ کا وہی کالم ہے جو پروفیسر مسعود حسین خاں کی خودنوشت سوانح حیات 'ورودِ مسعود' پر ہفت روزہ 'تکبیر' (کراچی) میں دو قسطوں (۲۶ جنوری اور ۲ فروری ۱۹۸۹ء) میں شائع ہوا تھا۔

۲- متذکرہ کالم میری مرتب کردہ تنقیدی کتاب 'نذرِ مسعود' (مجموعۂ نگارشات جو پروفیسر مسعود حسین خاں کی خدمت میں ان کی ستر ویں سال گرہ ۱۹۸۹ء کے موقع پر پیش کیا گیا) میں "ورودِ مسعود: ایک بہترین آپ بیتی" کے عنوان سے شائع ہوا۔

۳- ممتاز ادیب دوانش ور محمد حسن عسکری، خواجہ منظور حسین سے ایک روایت کے مطابق محض اس وجہ سے خفا ہو گئے تھے کہ انھوں نے اپنے مضمون میں اس لڑکی کو فیل کر دیا تھا جس سے عسکری صاحب شادی کرنا چاہتے تھے۔ محمد حسن عسکری تمام عمر مجرد رہے، بالآخر ۱۸ جنوری ۱۹۷۸ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

۴- خواجہ منظور حسین علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے شعبۂ انگریزی میں پروفیسر تھے۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان منتقل ہونے پر، وہ گورنمنٹ کالج، لاہور میں انگریزی اور اردو کے شعبوں کے سربراہ مقرر ہوئے پھر کچھ عرصے بعد اسی کالج کے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۰ اگست ۱۹۸۶ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔ خواجہ صاحب نہایت اعلیٰ ادبی و تنقیدی ذوق رکھتے تھے اور بہترین نثر نگار تھے۔ اقبال اور اردو غزل پر اپنے علمی کاموں کی وجہ سے وہ اردو دنیا میں معروف ہوئے۔

۵- ڈاکٹر آفتاب احمد جو آفتاب احمد خاں کے نام سے بھی جانے جاتے تھے ایک اچھے نقاد اور غالب شناس تھے۔ 'غالب آشفتہ نوا' (۱۹۸۹ء) ان کی چند مشہور کتابوں میں سے ایک ہے۔ ۲۵ اگست ۲۰۰۵ء کو ان کا انتقال ہوا۔

۶- ڈاکٹر وحید قریشی ممتاز محقق، نقاد اور شاعر؛ اردو کی تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف و مرتب اور رسالہ 'مخزن' (قائدِ اعظم لائبریری، لاہور) کے مدیر۔

۷- پروین شاکر پاکستان کی ممتاز اردو شاعرہ جو ہندوستان میں بھی اتنی ہی زیادہ مقبول تھیں جتنی کہ پاکستان میں۔ افسوس کہ جب وہ کار سے سفر کر رہی تھیں، ایک ٹرک حادثے میں ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۴۲ سال تھی۔ 'خوشبو' (۱۹۷۶ء) ان کا پہلا شعری مجموعہ تھا۔ اس کے بعد ۱۹۹۴ء تک ان کے چار اور مجموعے ('صد برگ' ۱۹۸۰ء، 'خود کلامی' ۱۹۹۰ء، 'انکار' ۱۹۹۰ء اور 'ماہِ تمام' ۱۹۹۴ء) شائع ہوئے۔

۸- شیخ منظور الٰہی کی دونوں کتابوں کے نام اس وقت یاد نہیں آ رہے ہیں۔

۹- 'ورودِ مسعود' پروفیسر مسعود حسین خاں کی خودنوشت سوانح حیات ہے جو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی [اگرچہ اس کتاب پر سنِ اشاعت درج نہیں ہے]۔

۱۰- 'شہید جستجو'، ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر جمہوریہ ہند) کی سوانح حیات ہے جس کے مصنف ضیاء الحسن فاروقی ہیں۔ یہ کتاب مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔

۱۱- پروفیسر مسعود حسین خاں کے اس "غیر سعادت مند" شاگرد کا نام اگرچہ مجھے معلوم تھا، لیکن میں نے اسے مشفق خواجہ کو خط لکھتے وقت ظاہر نہیں کیا تھا۔ چند ماہ بعد جب کراچی میں خواجہ صاحب سے میری ملاقات ہوئی (جون ۱۹۸۹ء) تو انھوں نے اس "غیر سعادت مند" شاگرد کا ذکر پھر چھیڑ دیا، چنانچہ مجھے اس کا نام بتانا ہی پڑا۔

۱۲- اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں ہے، لیکن یہ خط مجھے علی گڑھ میں ۲/مارچ ۱۹۸۹ء کو موصول ہوا تھا۔

﴿۴﴾

۳-ڈی، ۳۲/۹، ناظم آباد، کراچی-۱۸

محترمی و مکرمی، سلام مسنون۔

سخت شرمندہ ہوں کہ آپ کی پیہم عنایات کا شکریہ تاخیر سے ادا کر رہا ہوں۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو کراچی کے حالات ہیں۔ آئے دن کرفیو نافذ ہوتا رہتا ہے۔ آج کل بھی نافذ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ میرے خاندان میں کئی شادیاں تھیں۔ باہر سے بہت سے مہمان آئے۔ ان کی دیکھ بھال میں مصروف رہا۔ اسی سلسلے میں لاہور بھی جانا ہوا۔ غرض کہ بہت سا وقت انھیں کاموں کی نذر ہو گیا۔ علامہ کیفی والی کتاب [1] دیکھ کر جی خوش ہوا۔ آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ اس کا دوسرا نسخہ میں نے غالب لائبریری میں دے دیا ہے۔

'نذرِ مسعود' بھی مل گئی تھی۔ اسے 'وردِ مسعود' کا تکملہ کہنا چاہیے۔ آپ نے اپنے استادِ گرامی [2] سے محبت اور عقیدت کا حق ادا کر دیا ہے۔ اہلِ علم کی خدمات کا اعتراف ہم عموماً اس وقت کرتے ہیں جب وہ ہم میں موجود نہیں ہوتے۔ آپ نے اس روایت سے انحراف کر کے بہت اچھا کیا۔ میں نے اس کتاب پر بھی ایک کالم لکھا تھا امید ہے نظر سے گزرا ہوگا۔ کاش پروفیسر اسلوب احمد انصاری [3] اور پروفیسر مسعود حسین خاں ایک دوسرے کے خلاف وہ کچھ نہ لکھتے جو انھوں نے لکھا۔

کراچی میں آپ کے ساتھ جو وقت گذرا، [4] اس کی خوش گوار یادوں سے دل و دماغ معطر ہیں۔ یہاں جو لوگ بھی آپ سے ملے، آپ کو یاد کرتے ہیں۔

آمنہ [5] آپ کی اور بیگم صاحبہ [6] کی ممنون ہیں کہ آپ دونوں نے انھیں یاد رکھا۔ وہ آپ کو سلام لکھوا رہی ہیں۔

خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔

میرے پاس ڈاکٹر صاحب [7] کے کچھ خط ہیں۔ ان کے عکس جلد ہی ارسال کروں گا، اور ساتھ ہی آپ کی تصویریں بھی۔ [8]

خیر اندیش مشفق خواجہ

۲۰-۲-۹۰ء

ازراہِ کرم دوسرا خط ڈاکٹر نعیم احمد صاحب [9] تک پہنچا دیجیے۔

۱- میری کتاب 'پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی' جو ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی کی جانب سے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔

۲- شفیق استاد پروفیسر مسعود حسین خاں مراد ہیں، جن کی سترویں سال گرہ کے موقع پر میں نے تہنیتی کتاب 'نذرِ مسعود' (۱۹۸۹ء) مرتب کر کے

شائع کی تھی۔

۳- پروفیسر اسلوب احمد انصاری اردو اور انگریزی کے ممتاز نقاد اور سابق صدر شعبۂ انگریزی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ جنھوں نے اپنے ششماہی رسالے 'نقد و نظر' (شمارہ دسمبر ۱۹۸۸ء) میں پروفیسر مسعود حسین خاں کی خودنوشت 'ورودِ مسعود' (۱۹۸۸ء) پر تنقیدی آمیز انداز میں نہایت سخت تبصرہ شائع کیا تھا جس میں ذاتیات پر بھی کیچڑ اچھالی گئی تھی۔ چنانچہ مسعود حسین خاں کو بھی اسلوب احمد انصاری کے بارے میں ایک مذمتی تحریر بعنوان "ضمیمۂ ورودِ مسعود" شائع کرانی پڑی (ملاحظہ ہو 'نذرِ مسعود' مرتبہ مرزا خلیل احمد بیگ [شائع کردہ تعلیمی مرکز، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء]، ص ص ۵۰۳ تا ۵۱۴)۔

۴- میں نے جون-جولائی ۱۹۸۹ء میں اپنی اہلیہ اور دونوں بیٹیوں کے ہمراہ کراچی کا دورہ کیا تھا۔

۵- آمنہ مشفق (بیگم مشفق خواجہ)۔

۶- میری اہلیہ مراد ہیں۔

۷- پروفیسر ڈاکٹر مسعود حسین خاں مراد ہیں۔

۸- کراچی کے دورانِ قیام میں مشفق خواجہ نے میری جو چند تصویریں اتاری تھیں انھیں ارسال کرنے کا ذکر ہے۔

۹- ڈاکٹر قمیم احمد، استاد شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ جن کا ۲۲/جنوری ۱۹۹۶ کو دہلی میں انتقال ہوا۔

۳- ڈی، ۲۶/۹ ناظم آباد، کراچی- ۷۴۹۰۸

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ ملا اور 'لسانی تناظر'(۱) بھی۔ ان عنایات کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ مجھے یاد رکھتے ہیں اور اپنے علمی و ادبی کاموں سے مستفید ہونے کا موقع عنایت کرتے ہیں۔ یہ خط مجھے بہت پہلے لکھنا چاہیے تھا لیکن اچانک بیمار ہو جانے کی وجہ سے میں معمول کے مطابق کوئی کام نہ کر سکا۔ اب خدا کا شکر ہے کہ صحت یاب ہو چکا ہوں۔

"نقوش ایوارڈ" کی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ یہ یہاں کا ایک معتبر ایوارڈ ہے اور منتخب اہلِ علم ہی کو دیا جاتا ہے۔ آپ یہ ایوارڈ وصول کرنے تشریف لائیں گے تو ظاہر ہے کراچی بھی آنا ہوگا۔ میں ابھی سے چشم براہ ہوں۔

دو سال پہلے یہ ایوارڈ ڈاکٹر گیان چند صاحب(۲) کو ملا تھا۔ اس مہینے کی ۱۷ کو وہ کراچی تشریف لائے تھے۔ انجمن ترقیِ اردو نے انھیں خطبۂ بابائے اردو کے لیے مدعو کیا تھا۔ ۲۳/اکتوبر تک وہ کراچی میں رہے، اور پھر لاہور چلے گئے جہاں انھیں نقوش ایوارڈ دیا گیا۔ اس دوران میں ان سے کئی بار ملاقات ہوئی اور آپ کا ذکرِ خیر بھی ہوا۔ آپ کا ذکر وہ بڑی محبت اور شفقت سے کرتے رہے۔ انھوں نے 'لسانی تناظر' پر جو مقدمہ لکھا ہے اس سے محبت کا اظہار بھی ہوتا ہے اور اُن کے منصفانہ مزاج کا بھی۔

'لسانی تناظر' کے چند مضامین رسالوں میں پڑھ چکا ہوں۔ اب میں پوری کتاب سے استفادہ کروں گا۔ اس میں میری دلچسپی کا بہت سامان ہے۔ کتاب کا جو اشتہار آپ نے بھیجا ہے، وہ 'قومی زبان' میں اشاعت کے لیے دے دیا ہے۔ یہ رسالہ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔ 'غالب'(۳) کا آخری شمارہ اس سال کے شروع میں چھپا تھا۔ یہ آپ کو جلد ہی بھیجوں گا اور اس کے ساتھ ہی

صوتیات سے متعلق ایک کتاب بھی جو حال ہی میں متذکرہ قومی زبان نے شائع کی ہے۔ یہ میں نے آپ کے لیے حاصل کرلی ہے۔ یہاں سے کسی بھی کتاب کی ضرورت ہو، آپ بلاتکلف مجھے لکھیں۔ 'ادیب'(۴) کا ایک شمارہ بھی آپ کی عنایت سے ملا ہے۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیراندیش مشفق خواجہ

۳۱-۱۰-۹۷ء

۱- میری کتاب 'لسانی تناظر' جو ہری پبلی کیشنز، نئی دہلی کی جانب سے ۱۹۹۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

۲- ممتاز اردو محقق اور متنازع فیہ کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' (۲۰۰۵ء) کے مصنف پروفیسر گیان چند جین جو اگست ۲۰۰۷ء میں امریکہ میں فوت ہو گئے۔

۳- ادارۂ یادگارِ غالب، غالب لائبریری، کراچی کا ششماہی مجلہ 'غالب'۔

۴- جامعہ اردو، علی گڑھ کا علمی و تدریسی مجلہ 'ادیب' (سہ ماہی) جو میری ادارت میں شائع ہوتا تھا۔

۳-ڈی، ۲۹/۹ ناظم آباد، کراچی- ۷۴۶۰۸

محترمی و مکرمی، سلام مسنون۔

پچھلے مہینے آپ کا گرامی نامہ ملا تھا جس میں آپ نے اپنی تین کتابیں ارسال فرمانے کا مژدہ سنایا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ پیکٹ مل جائے تو خط لکھوں، مگر تا حال نہیں ملا۔ عموماً ہندوستان سے کتابوں کے پیکٹ زیادہ سے زیادہ دس بارہ دن میں یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ آپ کے بھیجے ہوئے پیکٹ کو تقریباً دو ماہ ہو چکے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ضائع ہو گیا۔ خوش گمانی یہ راستہ بھی دکھاتی ہے کہ شاید آپ خط لکھنے کے بعد پیکٹ ارسال کرنا بھول گئے ہوں۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

آج کل علی گڑھ کے متعدد اساتذہ یہاں تشریف فرما ہیں۔ یہ سب سرسید سے می نار(۱) میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ میری آنکھیں آپ کو ڈھونڈتی رہیں۔ آپ بھی آجاتے تو اچھا ہوتا۔

خودنوشت سوانح عمریوں سے مجھے بھی آپ کی طرح بے حد دلچسپی ہے۔ میرے پاس اردو اور انگریزی کی ایک ہزار سے زیادہ آپ بیتیاں ہیں۔ اردو کی آپ بیتیوں کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے۔ کشور ناہید(۲) کی آپ بیتی صحیح صورت میں دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ پاکستانی ایڈیشن ناقص ہے۔ اس میں سے بہت سے مطالب حذف کر دیے گئے ہیں، اس لیے آپ دہلی ایڈیشن ہی ملاحظہ کیجیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی آپ بیتی عرصہ ہوا، شائع ہوئی تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح حاصل کر کے بھیجوں گا۔ اس وقت میں آپ کو ایک نادر آپ بیتی بھیج رہا ہوں۔ اس کا نام ہے 'بیتی کہانی' جو پاٹودی کے رئیس کی بیٹی شہر بانو کی لکھی ہوئی ہے۔(۳) یہ اردو میں کسی خاتون کی پہلی آپ بیتی ہے۔ اس کے ساتھ دو اور کتابیں بھیج رہا ہوں جو آپ کی خاص دلچسپی کی ہیں۔ ایک تو ڈاکٹر سہیل بخاری کی 'اردو کی زبان' ہے

اور دوسری ڈاکٹر محبوب عالم خاں کی 'اردو کا صوتی نظام'۔

میں اگلے چند روز میں ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب (۴) کے نام کتابوں کے چند پیکٹ ارسال کر رہا ہوں۔ مذکورہ تینوں کتابیں انھیں پیکٹوں میں ہوں گی۔ ان پر آپ کا نام لکھ دیا ہے اور ڈاکٹر صاحب سے گزارش کی ہے کہ وہ یہ کتابیں آپ کی خدمت میں پیش کر دیں۔

دہلی سے سعیدہ بانو احمد کی آپ بیتی 'ڈگر سے ہٹ کر' شائع ہوئی ہے۔ میں نے پچھلے سال یہ کتاب منگوائی تھی۔ ایسی عمدہ آپ بیتی ہے کہ شاید ہی کسی خاتون نے اتنی بے باکی اور خوش اسلوبی سے ''ناگفتنی'' کو ''گفتنی'' بنایا ہو۔ امید ہے آپ نے یہ آپ بیتی ضرور پڑھی ہوگی۔

یہ خط ڈاکٹر اصغر عباس صاحب (۵) کے حوالے کروں گا جو یکم اپریل کو یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔

خیر اندیش مشفق خواجہ

۲۵-۳-۹۸ء

۱- یہ لفظ مشفق خواجہ نے اپنے خط میں اسی طرح تو ڑ کر لکھا ہے۔

۲- پاکستان کی ممتاز ناول و شاعرہ جن کی آپ بیتی 'بری عورت کی کتھا' کافی دنوں تک چرچا رہا۔

۳- شہر بانو بیگم (والیِ ریاست پاٹودی نواب اکبر علی خاں [م ۱۸۶۲ء] کی دختر) کی تصنیف کردہ 'بیتی کہانی' نہ صرف اردو کی اولین خودنوشت ہے، بلکہ ریاست پاٹودی (=پٹودی) کی تاریخ کا ایک بنیادی ماخذ بھی ہے۔ اس کا سنہ تصنیف ۱۸۸۵ء ہے۔ اس اعتبار سے یہ عبدالغفور نساخ اور جعفر تھانیسری کی خودنوشت سوانح عمریوں، جو ۱۸۸۶ء میں تصنیف کی گئیں، سے بھی قبل کی تصنیف ہے۔ اسے ڈاکٹر معین الدین عقیل نے مرتب کر کے ادارۂ علمی، حیدرآباد (پاکستان) سے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔

۴- ڈاکٹر مختار الدین احمد، سابق پروفیسر و صدر شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۵- ڈاکٹر اصغر عباس، سابق پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کراچی

برادرِ عزیز و مکرم، سلامِ مسنون

بہت دنوں سے آپ سے رابطہ نہیں ہے۔ اکتوبر ۹۸ء میں آپ کی بیٹی (۱) کی شادی کا دعوت نامہ آیا تھا۔ میں نے مبارک باد کا خط لکھا تھا، امید ہے ملا ہوگا۔ اس سے پہلے لسانیات سے متعلق دو نئی کتابیں ارسال کی تھیں، ان کی وصولی کی اطلاع نہیں ملی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری مرحوم (۲) کی ایک غیر مطبوعہ کتاب چند روز ہوئے شائع ہوئی ہے۔ اس کا ایک نسخہ بھیج رہا ہوں کہ یہ آپ کی دلچسپی کے موضوع پر ہے۔

بہت دنوں سے آپ یہاں تشریف نہیں لائے۔ایک زمانہ ہوگیا آپ کو دیکھے ہوئے۔
میں خیریت سے ہوں اور آپ سب کی خیریت کا طالب۔

خیر اندیش مشفق خواجہ

۱۴-۲-۱۹۹۹ء

۱- میری بڑی بیٹی اسنی کی شادی ڈاکٹر وجاہت جمال اشرف (ساکن اندرا نگر لکھنؤ) سے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو علی گڑھ میں ہوئی۔
۲- ڈاکٹر سہیل بخاری (م ۱۹۹۰ء) پاکستان کے معروف ماہر لسانیات اور محقق تھے۔

﴿۸﴾

۳- ڈی، ۳۱/ ۹ ناظم آباد، کراچی- ۷۴۶۰۸

عزیز مکرم، تسلیمات

گرامی نامہ مورخہ ۲۰ نومبر موصول ہوا، اور اکبر الہ آبادی کے بارے میں مقالہ بھی۔ان عنایات کے لیے سراپا سپاس ہوں۔اکبر کے کلام میں پائے جانے والے انگریزی الفاظ پر تقریباً ہر اس شخص نے لکھا ہے جس نے اکبر کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔مگر آپ نے اس پامال موضوع پر بالکل منفرد انداز سے بحث کی ہے۔مقالہ پڑھ کر جی خوش ہوگیا۔اس سلسلے میں 'لغاتِ مغربی'' کی اصطلاح بھی بڑی معنی خیز ہے جس سے ذہن فوراً مغربی تہذیب کی طرف منتقل ہوتا ہے۔میں نے یہ مقالہ 'قومی زبان' میں اشاعت کے لیے انجمن ترقی اردو کے دفتر بھیج دیا ہے۔[1] ان شاءاللہ جلد ہی شائع ہوگا۔

میں نے اس سال دو مرتبہ کچھ کتابیں آپ کو بھیجی تھیں، امید ہے مل ہوں گی۔

سرور صاحب، [2] جذبی صاحب، [3] مسعود صاحب [4] اور خورشید الاسلام [5] کی خیریت جان کر خوشی ہوئی۔ خدا ان بزرگوں کو تا دیر سلامت رکھے۔یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ان سب کی خدمت میں نیاز حاصل ہے۔ملاقات ہو تو میرا سلام کہیے گا۔

ڈاکٹر گیان چند [6] کا مظفر نگر (یوپی) سے خط آیا تھا جس سے ان کے دورۂ ہندوستان کی اطلاع ملی تھی۔اب تو شاید وہ امریکہ واپس جا چکے ہوں گے۔کراچی اور لاہور میں ان کی تقریباً ایک درجن کتابیں شائع ہو رہی ہیں جن میں سب سے اہم 'اردو کی ادبی تاریخوں کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ' ہے۔انھوں نے اپنے تمام مضامین کو موضوع وار مختلف جلدوں میں تقسیم کیا ہے۔

رسالہ 'اردو' بھی آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔اس رسالے کی اشاعت میں بوجوہ بے قاعدگی راہ پا گئی ہے۔لیکن اب ایسے انتظامات کیے ہیں کہ یہ باقاعدہ شائع ہوگا۔

بیگم صاحبہ سے ہم دونوں کا سلام کہیے —— ایک عرصہ ہوگیا کہ آپ کراچی تشریف نہیں لائے۔ہم دونوں کا اکاؤنٹ جس بینک میں ہے، وہاں ایک خاتون سے ملاقات ہوتی ہے۔وہ آپ کی عزیزہ ہیں (افسوس کہ ان کا نام بھول گیا ہے۔ان کی ایک شناخت

یہ ہے کہ ٹی وی کے ڈراموں میں حصہ لیتی ہیں)۔(۷) ان سے آپ دونوں کا ذکر رہتا ہے۔

خیر اندیش   مشفق خواجہ

۹-۱۲-۹۹ء

۱- یہ مقالہ جس کا عنوان "اکبرالٰہ آبادی اور لغاتِ مغربی: ایک اسلوبیاتی مطالعہ" ہے رسالہ 'قومی زبان' (انجمن ترقی اردو پاکستان) کے علاوہ مجلۂ 'اطلاقی لسانیات' (شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کے مشترکہ شمارے نمبر ۱۱ اور ۲ میں بھی شائع ہوا۔ علاوہ ازیں یہ میری کتاب 'تنقید اور اسلوبیاتی تنقید' (علی گڑھ: شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء) میں بھی شامل ہے۔

۲- پروفیسر آلِ احمد سرور (م ۲۰۰۲ء) ممتاز نقاد اور دانش ور۔

۳- معین احسن جذبی (م ۲۰۰۵ء) ممتاز ترقی پسند شاعر۔

۴- پروفیسر مسعود حسین خاں (پ ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء) جلیل القدر ادیب، دانش ور، محقق اور ماہرِ لسانیات۔

۵- پروفیسر خورشید الاسلام ممتاز شاعر اور نقاد۔

۶- پروفیسر گیان چند جین آخر عمر میں مستقلاً امریکہ میں سکونت پذیر ہو گئے تھے اور وہیں اگست ۲۰۰۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے، جن کے جین صاحب سے دیرینہ دوستانہ مراسم تھے، ان کی وفات پر یہ تین مصرعے کہے:

دوست میرا بہت گیانی تھا
میں تو مرحوم اُس کو لکھتا ہوں
لوگ کہتے ہیں 'انجہانی' تھا

یہاں "دوست" سے مراد گیان (چند جین) ہیں اور اسی مناسبت سے مسعود صاحب نے "گیانی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

۷- یہ میری اہلیہ کی سگی بھانجی تحسین خاں ہیں جنھوں نے پاکستانی ٹی وی سیریلز میں کئی اہم کردار ادا کیے۔

۳-ڈی، ۹/۳۱، ناظم آباد، کراچی-۷۴۶۰۰

محترمی و مکرمی، سلام مسنون

آپ کی دونوں کتابیں ملیں اور گرامی نامہ۔ ان عنایات کے لیے تہ دل سے ممنون ہوں۔ یہ آپ کا کرم ہے کہ مجھے یاد رکھتے ہیں اور اپنی تصانیف سے نوازتے رہتے ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے پہلے ایڈیشن میرے پاس ہیں۔ ان شاءاللہ ان ایڈیشنوں سے بھی استفادہ کروں گا۔ آپ نے یہ اچھا کیا کہ 'اردو زبان کی تاریخ' کے آخر میں آپ نے اپنا مقالہ "اردو کی سماجی اور تہذیبی قدر و قیمت"(۱) شامل کر دیا۔ حقیقتہً اس موضوع پر یہ اپنی نوعیت کا واحد مضمون ہے۔ اس موضوع پر تو پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے، اور یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں۔

لسانیات جیسے خشک موضوع پر کام کرنے والے ہر دور میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ موجودہ دور تو خشک سالی کا ہے۔ بس ایک

آپ ہی سے امیدیں وابستہ ہیں۔خدا آپ کو تا دیر سلامت رکھے۔

'دریافت' تو قمر جمیل کی زندگی ہی میں بند ہو گیا تھا۔[۲] البتہ 'صریر' نکل رہا ہے۔میں مدیر 'صریر' [۳] سے گزارش کروں گا کہ آپ کے نام پرچہ جاری کر دیں۔

سنا ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب[۴] کی طبیعت ناساز ہے۔ملاقات ہو تو میری طرف سے مزاج پرسی کیجیے۔ میری دعا ہے کہ خدا انھیں صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔

یاد فرمائی کے لیے آمنہ[۵] آپ کا اور بیگم صاحبہ[۶] کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔ بیگم صاحبہ کو ہم دونوں کی طرف سے سلام کہیے۔

آپ کا خیر اندیش　　مشفق خواجہ

۲۱-۵- ۲۰۰۱ء

۱- میرے مقالے کا اصل عنوان ہے 'اردو زبان کی سماجی اور تہذیبی جڑیں'۔ یہ میری مرتب کردہ کتاب 'اردو زبان کی تاریخ'، دوسرا ایڈیشن (علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۰ء) میں شامل ہے۔اب اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہو گیا ہے۔

۲- 'دریافت' کراچی سے قمر جمیل نکالتے تھے۔یہ رسالہ نئے تنقیدی میلانات و رجحانات اور نئے ادبی مباحث کے لیے وقف تھا۔اس میں زیادہ تر سسیور کے فلسفۂ لسان، نیز دریدا، لاکاں، فوکو، بارت، وغیرہ کے جدید ادبی و تنقیدی تصورات و نظریات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔

۳- 'صریر' کراچی سے فہیم اعظمی نکالتے تھے۔اس کے چند شمارے مجھے موصول ہوئے تھے، پھر یہ رسالہ آنا بند ہو گیا۔

۴- ڈاکٹر مسعود حسین خاں، صفِ اول کے ادیب و انشا پرداز، محقق، اور ماہرِ لسانیات، نیز بانی صدر و پروفیسر، شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

۵- آمنہ مشفق (بیگم مشفق خواجہ)۔

۶- میری اہلیہ دردانہ بیگ۔

﴿۱۰﴾

۳-ڈی، ۳۱/۹ ناظم آباد، کراچی- ۷۴۶۰۰

برادرِ عزیز و مکرم، سلام مسنون

'بکٹ کہانی'[۱] کے تین نسخے کل کی ڈاک سے موصول ہوئے۔اس عنایت کے لیے بے حد ممنون ہوں۔یہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس کتاب کو دوبارہ شائع کر دیا۔[۲] اس کا پہلا ایڈیشن خود ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے مجھے عنایت فرمایا تھا۔ پہلے ایڈیشن پر مرتبین کے نام جس ترتیب سے درج ہوئے تھے، اگر دوسرے ایڈیشن پر بھی اسی طرح درج ہوتے تو بقول مسعود صاحب یہ "مشرقی وضع داری" کے عین مطابق ہوتا۔ہاشمی صاحب[۳] کے انتقال کے بعد ناموں کی ترتیب بدلنا اچھا نہ لگا۔[۴]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب کی صحت کے بارے میں بعض متضاد خبریں سننے میں آتی رہیں، مگر جب کالی داس گپتا رضا[۵] پر ان کا مضمون دیکھا تو اطمینان ہوا کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ملاقات ہو تو میرا سلام کہیے گا۔

اگرچہ سیاسی اور مکانی فاصلوں کی وجہ سے آپ سے رابطہ کم کم ہے، لیکن آپ سے ملاقاتوں کی یاد دل میں تازہ ہے۔ اس پر یہ کہ آپ اپنے علمی و ادبی کاموں سے بھی استفادے کا موقع دیتے رہتے ہیں۔ آپ کا یہ حسنِ سلوک دلی مسرت کا باعث ہے۔ میں نے بھی اِدھر ایک دو چھوٹے موٹے کام کیے ہیں جن میں سے ایک کلیاتِ یگانہ کی تدوین ہے۔ یہ کلیات دہلی سے بھی چھپ رہا ہے۔ اس کا ایک نسخہ ان شاء اللہ آپ کو وہیں سے پیش کیا جائے گا۔

'بکٹ کہانی' کے باقی دو نسخے آج ہی ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحبان کو بھجوا دوں گا۔

علی گڑھ کی یادیں ہنوز ذہن میں تازہ ہیں۔ ۱۸ سال گزر گئے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ (۶)

آپ کی اور تمام اہلِ خانہ کی خیریت کے لیے دعا گو ہوں۔

خیراندیش مشفق خواجہ

۲۳-۴-۲۰۰۳ء

۱- محمد افضل افضلؔ (م ۱۰۲۵ھ/ ۳۱-۱۶۲۵ء) کا بارہ ماسہ معروف بہ 'بکٹ کہانی' جسے "شمالی ہند میں اردو شاعری کا پہلا مستند نمونہ" قرار دیا گیا ہے۔ 'بکٹ کہانی' سب سے پہلے عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد کے تحقیقی مجلّے قدیم اردو کی جلدِ اول (۱۹۶۵ء) میں شائع ہوئی۔ اس مجلّے کے مدیر پروفیسر مسعود حسین خاں تھے۔ قدیم اردو کی اب تک کل چار جلدیں شائع ہوئیں۔ اس کی جلد سوم (۱۹۶۹ء) اور جلد چہارم (۱۹۷۲ء) شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے شائع ہوئیں۔ یہ بھی پروفیسر مسعود حسین خاں کی ہی ادارت میں شائع ہوئیں۔ قدیم اردو (۱۹۶۵ء) میں شائع شدہ نسخے کو بنیاد بناتے ہوئے 'بکٹ کہانی' دوبارہ ۲۰۰۲ء میں شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ اس کا پیش لفظ، بہ حیثیت صدر شعبۂ لسانیات (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)، میں نے لکھا۔

۲- پروفیسر نورالحسن ہاشمی (م ۲۰۰۲ء) معروف ناقد اور محقق، لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد رہے۔

۳- ایسا پروفیسر مسعود حسین خاں کی ہی ایما پر کیا گیا تھا اور انھیں کی اجازت سے یہ ایڈیشن شائع ہوا تھا۔

۵- شاعر، محقق اور ماہرِ غالبیات کالی داس گپتا رضاؔ جن کا انتقال نئی دہلی کے اسکارٹس ہسپتال میں ۱۲ مارچ ۲۰۰۱ء کو ہوا۔ رضا صاحب "پدم شری" کا قومی ایوارڈ لینے نئی دہلی آئے ہوئے تھے جہاں راشٹرپتی بھون میں صدرِ جمہوریہ ہند کے ہاتھوں انھیں ۲۵ مارچ ۲۰۰۱ء کو یہ ایوارڈ ملنے والا تھا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا یہ بیان غلط ہے کہ کالی داس گپتا رضا کا انتقال "بمبئی" میں ہوا۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی مرتب کردہ کتاب 'مکاتیبِ مشفق خواجہ بنام رفیع الدین ہاشمی' (لاہور: ادارۂ مطبوعاتِ سلیمانی، ۲۰۰۸ء)، ص ۹۹ [حاشیہ]۔

۶- مشفق خواجہ اپنی بیگم آمنہ مشفق کے ہمراہ ۱۹۸۵ء میں ہندوستان آئے تھے اور علی گڑھ بھی تشریف لائے تھے۔

۳ -ڈی، ۳۱/۹ ناظم آباد، کراچی- ۷۴۶۰۰

محترمی و مکرمی، سلامِ مسنون

بیحد شرمندہ ہوں کہ آپ کے گرامی نامہ مورخہ ۴ جنوری ۰۴ء کا جواب اتنی تاخیر سے دے رہا ہوں۔ میں نومبر ۰۳ء میں شدید بیمار ہوا اور اپنے گھر سے ایک دوسری جگہ منتقل ہو گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب صحت بحال ہو گئی ہے اور میں معمول کے مطابق اپنے کاموں میں مصروف ہوں۔ فی الحال چار ماہ کی جمع شدہ ڈاک دیکھ رہا ہوں۔ اسی میں آپ کا خط اب ملا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ 'قومی زبان' (۱) آپ کو نہیں مل رہا ہے۔ دراصل اب دفترِ انجمن میں علمی و ادبی مذاق کے لوگ نہیں رہے۔

میں بھی اپنی بیماری کی وجہ سے لاتعلق رہا۔ بہر حال میں نے نوٹ لکھ کر بھیجا ہے کہ حسبِ سابق ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کو علی گڑھ کے اہلِ ادب کے لیے رسالہ بھیجا جائے۔ آپ کا مضمون جب ملا تھا، اسی وقت 'قومی زبان' کے لیے بھیج دیا گیا۔ اس سلسلے میں معلومات کر کے متعلقہ شمارہ بھیجوں گا۔

ڈاکٹر گیان چند صاحب (۲) کی تمام تصانیف کے نئے ایڈیشن یہاں سے شائع ہو رہے ہیں۔ لسانیات [سے] متعلق ایک مجموعہ 'لسانی رشتے' شائع ہوا ہے۔ اس کا انتساب ڈاکٹر صاحب نے بہت اچھے لفظوں میں آپ کے نام کیا ہے۔ (۳) انتساب کے الفاظ یہ ہیں:

"ماہرِ علمِ زبان، شیریں کلام، کرمفرما ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے نام"۔

میں نے اس کتاب کا ایک نسخہ آپ کے لیے حاصل کر لیا۔ بہت جلد ارسالِ خدمت کروں گا۔ ڈاکٹر گیان چند صاحب سے میرا رابطہ رہتا ہے۔ آج صبح ہی ان کا فون آیا تھا۔ ان کی تقریباً تمام تصانیف یہاں چھپ رہی ہیں۔ مضامین بھی ترتیبِ نو کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔

خدا کرے آپ خیریت سے ہوں۔ بہت عرصے سے آپ یہاں تشریف نہیں لائے۔ اب تو آمد و رفت میں بڑی سہولت ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب سے ملاقات ہو تو میرا اسلام پہنچا دیجیے گا۔ خدا کرے وہ خیریت سے ہوں۔

آپ کا خیر اندیش مشفق خواجہ

۱۹-۴-۲۰۰۴ء

۱- انجمن ترقیِ اردو (پاکستان) کا علمی و ادبی مجلہ۔ ماہنامہ 'قومی زبان'۔

۲- معروف محقق اور متنازع فیہ کتاب 'ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب' (۲۰۰۵ء) کے مصنف پروفیسر گیان چند جین جنھوں نے اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد ہندوستان سے ترکِ وطن کر کے امریکہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں اگست ۲۰۰۷ء میں ان کا انتقال ہوا۔

۳- گیان چند جین سے میرے دیرینہ مراسم تھے۔ انتساب کی اطلاع انھوں نے بھی مجھے امریکہ سے بھیجے گئے اپنے خط مورخہ ۱۷ ستمبر ۲۰۰۴ء میں دی تھی۔

''پس پردہ۔عالمی سیاست کے مخفی حقائق''

محمد ہارون عثمانی

تاریخ عالم کا بغور مطالعہ کیا جائے تو قوموں کا عروج و زوال، ملکوں کا ٹوٹنا بننا اور سرحدوں میں تبدیلی سب ایک فطری اور مستقل عمل دکھائی دے گا۔تاریخ کے اوراق اس کی گواہی دیتے ہیں کہ کسی ایک قوم کو ہمیشہ عروج حاصل نہیں رہا۔سپر پاور ہونے کا ہما کبھی ایک قوم کے سر اور کبھی کسی دوسری قوم کے سر بیٹھتا رہا ہے۔یہ حالات ابتدا سے آج تک جوں کے توں رہے ہیں۔بیسویں صدی اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں دو عالمی جنگوں کے علاوہ سرد جنگ بھی لڑی گئی۔سپر پاور کی اصطلاح کے حوالے سے ڈاکٹر شاہد مسعود لکھتے ہیں:۔

> ''۱۹۴۴ء میں پہلی بار سپر پاور کی اصطلاح امریکہ،سویت یونین اور سلطنت برطانیہ کے لیے استعمال ہوتی تھی لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ کے زوال نے صرف دو سپر پاور کو سرد جنگ لڑنے کے لیے چند دہائیوں تک چھوڑا''۔[1]

سرد جنگ اسی (۸۰) کی دھائی کے آخر میں یورپ میں سوشلسٹ حکومتوں کے خاتمے تک چلی۔۱۹۸۹ء میں سویت یونین تحلیل ہوا اور دیوار برلن گرا دی گئی تو دنیا میں طاقت کا رہا سہا توازن بھی ختم ہو گیا۔اب دنیا یک قطبی (Unipolar) ہو گئی تھی۔امریکی دنیا کی واحد سپر پاور کے طور پر ابھرا تو دنیا کے وسائل پر قبضے کی خواہش نے عمل کی راہ دکھانی شروع کر دی۔ ۱۹۹۱ء میں خلیج کی جنگ نے امریکی عزائم اور نئی دنیا کا نقشہ واضح کیا۔ادھر امریکی صدر جارج بش (سینئر) نے نئے عالمی نظام (New World Order) کا اعلان کر دیا جو اصل میں دنیا میں امریکی تسلط کا چارٹر تھا۔اس پس منظر میں امریکہ کی عسکری قوت عرب سرزمین پر اتری اور آج تک وہیں ہے۔لیکن ابھی مشن نامکمل تھا۔اس کی تکمیل کے لیے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کا ڈراما رچایا گیا اور اسے جواز بنا کر عراق پر دوبارہ اور افغانستان پر نئی یلغار کی گئی۔اب جنگ دہشت گردی کے خلاف تھی۔گویا، دنیا کو تشدد، بے چینی اور بدامنی کی آگ میں جھونک دیا گیا۔اس تمام معاملے میں،اپنی عوام اور بین الاقوامی سیاست کے حوالے سے،امریکہ کے دوہرے معیارات دکھائی دیتے ہیں۔ڈاکٹر مجاہد کامران نے انھی دوہرے معیارات اور دیگر کئی مخفی حقائق کی نشان دہی اپنی کتاب ''پس پردہ۔عالمی سیاست کے مخفی حقائق'' میں کیے ہیں۔

ڈاکٹر مجاہد کامران ''طبیعیات'' (فزکس) کے میدان کے شہسوار ہیں کتاب کے فلیپ پر دیے گئے تعارف کے مطابق:۔

> ''ڈاکٹر مجاہد کامران ۲۳ جنوری ۱۹۵۱ء کو گجرات میں پیدا ہوئے اور راولپنڈی کے سرسید سکول اور گارڈن کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ۱۹۷۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فزکس میں ایم

ایس سی کی۔ ۱۹۷۲ء میں انہوں نے بطور لیکچرار پنجاب یونیورسٹی میں کیریئر کا آغاز کیا، ۱۹۸۸ء میں پنجاب یونیورسٹی ہی میں پروفیسر مقرر ہوئے جہاں وہ ۱۹۹۵ء تا ۲۰۰۱ء اور ۲۰۰۷ء تا ۲۰۰۸ء شعبہ فزکس کے صدر اور ۲۰۰۴ء ۲۰۰۷ء ڈین کلیہ سائنس رہے۔ جنوری ۲۰۰۸ء میں ڈاکٹر مجاہد کامران کو پنجاب یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔''[۲]

ڈاکٹر مجاہد کامران علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے والد مرحوم سید شبیر حسین معروف صحافی تھے ان کی اہلیہ ڈاکٹر نجمہ نجم فاطمہ جناح یونیورسٹی برائے خواتین راولپنڈی کی بانی وائس چانسلر رہ چکی ہیں، ڈاکٹر مجاہد کامران پانچ کتابوں کے مصنف ہیں۔ زیر تذکرہ کتاب کے علاوہ ''جدید طبیعیات کے مشاہیر''، ''جدید طبیعیات کے بانی'' اور ڈاکٹر عبدالقدیر کی تقاریر پر مشتمل کتاب ان کے کریڈٹ پر موجود ہیں۔

''پس پردہ'' بنیادی طور پر صحافتی تحریریں ہیں جو کالم کی شکل میں ''روزنامہ وقت'' میں اگست تا دسمبر ۲۰۰۷ء کے دوران میں شائع ہوئیں۔ ان تمام کالموں (جو تعداد میں ۲۳ ہیں) کا بنیادی موضوع ایک ہی ہے۔ اس حوالے سے پیش لفظ میں مصنف نے یوں وضاحت کی ہے۔

''دراصل ۹/۱۱ کے بارے میں بہت سے ایسے سوالات ہیں جن کا تسلی بخش جواب تلاش کرنا بہت مشکل تھا، لیکن دنیا بھر کے محققین، بالخصوص مغربی محققین اس واقعے کو سمجھنے کے لیے فوراً ہی کوشاں ہو گئے اور چند برسوں میں صورت حال بڑی حد تک واضح ہو گئی۔ ۹/۱۱ کو سمجھنے کے لیے اس امر کو سمجھنا ضروری ہے کہ دنیا کی اکثر جنگیں اقتصادی مفادات کے لیے لڑی جاتی ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ مفادات متحارب ملکوں کے عوام کے نہیں بلکہ ان مالدار طبقات کے ہوتے ہیں جو پس پردہ دنیا کے ممالک کی سیاست کو کنٹرول کرتے ہیں، لیکن اس حقیقت کو بڑی محنت اور عیاری سے عوام کی نظروں سے چھپایا جاتا ہے۔ امریکہ کی خارجہ اور داخلی سیاست متذکرہ بالا حقیقت کی حیران کن مثال ہے اس کا اندازہ قاری کو اس کتاب کے مضامین پڑھنے سے ہو جائے گا''۔[۳]

اگر موضوع کو دھیان میں رکھا جائے تو ضیاالحسن کا یہ کہنا کہ:

''اس بات میں ہرگز مبالغہ نہیں کہ ڈاکٹر مجاہد کامران کی کتاب ''پس پردہ'' نقطہ نظر تبدیل کر دینے والی کتاب ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں سطحی جذبات کا اظہار نہیں کیا گیا بلکہ نہایت مدلل انداز میں کافی تحقیقی مواد کے ساتھ اپنے نقطہ نظر کو واضح کیا گیا ہے''۔[۴]

بڑی حد تک درست ہے۔ ڈاکٹر مجاہد کامران کا بنیادی تھیسس ہی یہی ہے کہ امریکہ جس عالمی دہشتگردی کا مرتکب ہو رہا ہے اس میں اس کی عوام شامل نہیں ہیں۔ ڈاکٹر مجاہد کامران کے مطابق امریکی ترقی میں اس کے عوام کا کردار بنیادی ہے مگر جب عالمی پالیسی تشکیل دی جاتی ہے، تو عوام کو اس سے دور رکھا جاتا ہے۔ گویا امریکی حکمرانوں کی پالیسیاں جہاں باقی دنیا کے خلاف ہیں وہیں خود ان کے عوام بھی ان پالیسیوں کا نشانہ ہیں۔ اس لیے ڈاکٹر مجاہد کامران نے اپنی کتاب کا انتساب یوں کیا ہے۔

امریکہ کے دیانتدار، کشادہ دل
طاقتور اور بھولے عوام کے نام

یہ عوام طاقتور اس لیے ہیں کہ وہ اپنے تن من دھن سے امریکہ کی معاشی اور ٹیکنالوجیکل ترقی میں اپنا کردار ادا کر رہے ہیں لیکن ان کی معاشیات پر جن لوگوں کا قبضہ ہے ان کے اپنے بین الاقوامی مفادات ہیں ۔خصوصاً امریکن مالی اداروں اور میڈیا پر یہودی غلبے کو ڈاکٹر مجاہد کامران امریکی عوام کا استحصال قرار دیتے ہیں ۔مائیکل روپرٹ کی کتاب (Cossing the Rubicon) میں بھی یہی بات کی گئی ہے جس کا حوالہ مصنف نے متعدد جگہوں پر دیا ہے ۔[۵]

امریکہ کی داخلی اور خارجی سیاست میں پیسہ سب سے اہم عنصر ہے اور امریکی عوام کے پیسے کو جس طرح بے دردی کے ساتھ اپنے جنگی عزائم کی تکمیل پر لگایا جا رہا ہے یہ امریکہ کے زوال کا سبب بن سکتا ہے ۔امریکہ کی نظریں اب دنیا کے معدنی وسائل پر ہیں ۔جن میں تیل سب سے اہم ہے ۔کیونکہ اسی صورت میں وہ اپنے اخراجات پورے کر سکے گا ۔ڈاکٹر شاہد مسعود نے امریکہ کے دفاعی اخراجات کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''اس برس امریکہ اپنے دفاع پر ۶۵۱۲. ارب ڈالرز خرچ کرنے جا رہا ہے ۔اس رقم میں وہ اخراجات شامل نہیں جو امریکی محکمہ دفاع سے ہٹ کر خرچ ہوں گے ۔مثلاً ایٹمی ہتھیاروں کی تحقیق (جس پر محکمہ توانائی ۱۹۳. ارب ڈالرز خرچ کرے گا) یا پھر عراق اور افغانستان میں فوجی کارروائیوں سے ہٹ کر خرچ ہوتی رقم (جو ۲۰۰۷ء میں ۱۷۰ ارب ڈالرز عبور کر گئی تھی) ـــــ امریکی سی آئی اے کا بجٹ ۴۴ ارب ڈالرز سالانہ ہے جبکہ ایف بی آئی پر دس ارب ڈالرز کے لگ بھگ خرچ ہو رہے ہیں ۔''[۶]

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد امریکہ نے دنیا کو ایک نئی جنگ میں جھونک دیا ۔اس جنگ کو دہشتگردی کے خلاف جنگ قرار دیا گیا ۔اب امریکہ کا نشانہ ایشیائی بالخصوص وسط ایشیاء اور جنوبی ایشیاء کے عوام تھے ۔۹/ ۱۱ کے حوالے سے ڈاکٹر مجاہد کامران نے کئی سوالات اٹھائے ہیں:

> ''۹/ ۱۱ کے بارے میں بہت سے سوالات ہیں جن کا امریکی حکام کی طرف سے کوئی جواب یا تسلی بخش ردعمل سامنے نہیں آیا ۔یہ تمام سوالات مغربی مصنفین بالخصوص امریکہ محققین نے اٹھائے ہیں ۔کیا افغانستان پر حملہ واقعی ۹/ ۱۱ کے ردعمل کے طور پر تھا یا اس حملے کا منصوبہ پہلے سے تیار تھا ؟ کیا امریکی حکومت نے اس ۹/ ۱۱ اور افغانستان کے درمیان تعلق کا کوئی ثبوت پیش کیا ہے؟ ہوائی جہازوں کے بلیک باکس کہاں ہیں اور ان میں کیا معلومات ہیں؟ ۹/ ۱۱ کے بعد بن لادن کے ۱۱ قریبی رشتے دار امریکہ میں پھنس گئے تھے انہیں کس کے حکم کے تحت ایک چارٹرڈ جہاز پر واپس آنے دیا گیا؟''[۷]

ان سوالات میں بہت سارے جوابات بھی پوشیدہ ہیں ۔دہشتگردوں کے خلاف جنگ اچانک نہیں شروع کی گئی اس کی منصوبہ بندی پہلے سے موجود تھی ۔مصنف نے ۹/ ۱۱ کے حوالے سے چشم کشا انکشافات کیے ہیں ۔دوسری جنگ عظیم میں جاپان کو پرل ہاربر پر جس طرح حملہ کرنے کے لیے اکسایا گیا بالکل وہی صورت حال ۹/ ۱۱ کی تھی ۔ڈاکٹر ضیاالحسن کے مطابق:

> ''انہوں نے مغربی محققین کی تحقیق کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ پرل ہاربر پر حملہ کرنے سے پہلے

جاپان کو باقاعدہ منصوبہ بندی سے اکسایا گیا تا کہ امریکہ کی عالمی جنگ میں شمولیت کی راہ ہموار کی جا سکے کیوں کہ اس وقت تک امریکہ کا نظام معاشرت اتنا کمزور نہیں ہوا تھا جتنا آج ہے۔اس وقت قوم سے اجازت حاصل کرنے کے لیے حالات پیدا کرنے ضروری تھے۔حالات تو انہوں نے ۹/ ۱۱ کے لیے بھی باقاعدہ منصوبہ بندی سے پیدا کیے"۔[۸]

۹/ ۱۱ کے بہانے سے شروع ہونے والی جنگ نے تمام دنیا کو بے امنی، دہشت گردی اور خوف میں مبتلا کر دیا ہے۔معاشی بے یقینی اور بے چینی نے تیسری دنیا کے ممالک کو بالخصوص اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

ڈاکٹر مجاہد کامران لکھتے ہیں:

"اس صدی کا امریکہ ایک ایسا بھوکا دیو ہے جو دنیا کے وسائل ہڑپ کرتا جا رہا ہے اور اس کے لیے قوت کا مسلسل استعمال کر رہا ہے۔یہ دیو تیل پیتا ہے اور جب تک اس کے حلق سے روزانہ تیل کے کروڑہا پیرل اس کے شکم تک نہ پہنچیں اسے چین نہیں۔اس کا تیل کا نشہ پورا کرنے کے لیے ایشیا، افریقہ اور امریکی براعظموں سے تیل کی نلیاں اس کے وجود تک پہنچتی ہیں۔اس دیو نے دنیا کے ہر کونے میں بے چینی، بربادی اور خلفشار کو مسلسل فروغ دیا ہے اسے زنجیریں پہنانے کے لیے امریکی عوام اور بنی نوع انسان کو مل کر کام کرنا ہوگا"۔[۹]

اصل میں زیر تذکرہ کتاب کا بالواسطہ موضوع امریکی عوام ہی ہیں جو بے چارگی، بے بسی، مظلومیت، بنیادی حقوق سے محرومی، معاشی جبر کی اسیری، بے طاقتی اور انصاف سے محرومی کی زندہ تصویر ہیں۔المیہ یہ ہے کہ یہ معصوم عوام اپنے اس استحصال سے بے خبر بھی ہیں، جن اعلیٰ اقدار کو اس امریکی عوام نے ایک سو چالیس برس میں فروغ دیا وہ آج چند سو جنونی بیمار ذہنوں کے ہاتھوں تباہ ہو چکی ہیں۔مصنف نے متعدد جگہ وضاحت کی ہے کہ دنیا کی بیشتر مالیاتی تنظیموں اور تجارتی اداروں پر یا تو یہودی خود قابض ہیں یا پھر ان کے سرپرست۔اور ان کے پیش نظر تیل اور گیس کے دیگر معدنی ذخائر ہیں جن کا ستر فی صد حصہ مسلم ممالک میں ہے۔اسی وجہ سے مسلمان ان جنونیوں کی ہٹ لسٹ پر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مسلمان دہشت گرد اور ان کے ممالک بدی کا محور قرار دیے گئے ہیں۔اور ان جنونیوں کی نظر میں قابل نیست و نابود ہیں۔اسی بات کا ذکر سابق رکن امریکی کانگریس پال فنڈلے نے اپنی کتاب Silent No More:Confronting America's false images of islam. (امریکہ کی اسلام دشمنی) میں کیا ہے۔وہ لکھتا ہے:

"خبروں اور مضامین میں دوسرے مذاہب کے برعکس اسلام کو عمومی طور پر تشدد سے جوڑ دیا جاتا ہے لیکن جب دوسرے مذاہب کے لوگ دہشت انگیز کام کرتے ہیں تو ان کی مذہبی شناخت بیان نہیں کی جاتی۔۔۔۔مسلمانوں کے سوا ہر مرتکب کو عموماً مذہب نہیں بلکہ قومیت سے شناخت کیا جاتا ہے۔عیسائیت کی تحقیر کے لیے متشدد عیسائی نہیں لکھا جاتا۔لیکن اگر کوئی مسلمان کسی غلطی کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے بلاامتیاز امریکہ میں "اسلامی خطرے" کے ایک نمائندہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے"۔[۱۰]

ڈاکٹر مجاہد کامران نے امریکی میڈیا کے اسی کردار کو بے نقاب کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ امریکی میڈیا کے اصل مالکان

یہودی ہی ہیں ۔امریکہ کی تین بڑی میڈیا کمپنیاں ٹائم وارنر، والٹ ڈزنی اور Viacom کے مالکان یا سرکردہ لوگ یہودی ہیں۔ان تینوں کمپنیوں کے علاوہ بھی امریکی میڈیا کے بڑے ادارے یہودیوں کے قبضے میں ہیں ۔انگلش فلموں کا سب سے بڑا ڈائریکٹر اور پروڈیوسر سٹیون سپیل برگ یہودی ہے ۔اس کی بنائی ہوئی فلموں میں ہولوکاسٹ اور یہودیوں سے ہمدردی واضح نظر آتی ہے ۔اخبارات کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:۔

''یہی حالت اخبارات کی ہے اس وقت امریکہ کے ۸۰ فی صد اخبارات بڑی بڑی نیوز پیپر chains کے پاس ہیں جن کی ملکیت اور نظم ونسق اکثر وبیشتر یہودیوں کے ہاتھ میں ہیں۔وہ اخبارات جو غیر یہودیوں کے ہاتھ میں ہیں وہ اشتہارات کے لیے امیر یہودیوں کے مرہون منت ہیں ۔ان حالات میں امریکہ کی آزادی تحریر وتقریر انتہائی طور پر مسخ شدہ حالت میں ہے''۔ [11]

امریکی اداروں کے حوالے سے بھی زیر مذکرہ کتاب میں بہت سے حقائق کی نشان دہی کی گئی ہے ۔مصنف نے جہاں سی آئی اے اور ایف بی آئی کے کردار کو واضح کیا ہے وہیں امریکہ کے کچھ پراسرار اداروں کی نشان دہی بھی کی ہے۔یہ تنظیمیں دراصل دنیا کے امیر ترین خاندانوں کی اصل دولت کو چھپانے اور اس دولت کے ذریعے دنیا پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے بنی ہیں۔دوسری طرف امریکہ نے اسلامی فلاحی تنظیموں کو کالعدم قرار دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا ہوا جو دراصل غریب، نادار، بے کس اور آفت زدہ لوگوں کی بے لوث خدمت کرنے والی اسلامی فلاحی تنظیمیں تھیں ۔ڈاکٹر ایم اے سلومی نے اپنی کتاب ''دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے معصوم شکار'' میں انھی اسلامی فلاحی تنظیموں کے ابتلا وآزمائش کی سرگزشت بیان کی ہے ۔ [12]

ڈاکٹر مجاہد کامران نے منشیات کے فروغ میں سی آئی اے کے کردار کو مائیکل روپرٹ کے حوالے سے بے نقاب کیا ہے ۔اور منشیات سے حاصل ہونے والی رقم کا ذکر بھی کیا ہے ۔سی آئی اے نے منشیات کا دھندہ ویت نام کی جنگ کے دوران اختیار کیا تھا اس وقت یہ لاؤس ہیروئین سمگل کرتے تھے اور یہ سمگلنگ ایک انتہائی اہم راز تھا ۔اس حوالے سے مصنف نے امریکہ کے افغانستان پر حملے کی ایک وجہ منشیات بھی قرار دی ہے وہ لکھتے ہیں۔

''افغانستان محض اس لیے اہم نہیں کہ یہ تیل یا گیس کی راہداری ہے بلکہ افغانستان ہیروئین کی وجہ سے امریکہ کے لیے بے انتہا اہمیت رکھتا ہے ۔طالبان نے بے علمی میں پوست کی کاشت بند کر کے امریکی کارپوریشنوں کا گلا دبا دیا تھا اور یہی افغانستان پر فوری حملے کا ایک بڑا سبب تھا''۔ [13]

وال سٹریٹ امریکہ کے شہر نیویارک میں واقع ایسا علاقہ ہے جو بڑے بڑے بنکوں، بڑی بڑی کارپوریشنوں اور کاروباری اداروں کے دفاتر کا مرکز ہے ۔یہاں ہونے والے مالیاتی فیصلے دنیا بھر کے مالیاتی رجحانات کو جنم دیتے ہیں۔ڈاکٹر مجاہد کامران نے سی آئی اے اور وال سٹریٹ کے درمیان تعلق کو بھی واضح کیا ہے کہ کس طرح سی آئی اے وال سٹریٹ کے مفادات کا تحفظ کرتی ہے ۔یہ منشیات کا کالا دھن ہے جو امریکی مالیاتی نظام کا سٹیرائیڈ (Steriod) کہلاتا ہے ۔یہ دوا، وال سٹریٹ کو سی آئی اے فراہم کرتی ہے۔

مجموعی طور پر ''پس پردہ'' اخباری کالموں پر مشتمل کتاب ہے لیکن ان تمام کالموں کا بنیادی موضوع ایک ہی ہے یعنی دنیا کی سپر پاور امریکہ کی داخلی اور خارجی سیاست اور ان کے عوام کا کردار۔ڈاکٹر مجاہد کامران کے یہ مضامین یا کالم محض جذباتی

تحریریں نہیں ہیں۔مصنف نے باقاعدہ تحقیق اور دلیل سے بات کی ہے۔کتاب کے آخر میں ۴۳ کتابوں کے حوالے ظاہر کرتے ہیں کہ ڈاکٹر مجاہد کامران نے محض تعصب کی بنیاد پر نہیں لکھا ان کی پیش نظر اس موضوع پر عالمی لٹریچر موجود تھا۔اسی طرح ویب پر موجود سو سے زائد مضامین بھی مصنف کے زیر مطالعہ رہے لیکن جس کتاب اور مصنف کا ڈاکٹر مجاہد کامران نے بار ہا ذکر کیا ہے وہ مائیکل روپرٹ اور اس کی کتاب ''کراسنگ دی روبی کان'' ہے۔اس کے علاوہ برزنسکی اور فنڈلے کی کتاب کا حوالہ بھی متعدد جگہوں پر موجود ہے۔ان کتب اور مضامین میں پیش کیے گئے حقائق کو مجاہد کامران نے نہایت ذہانت اور بصیرت کے ساتھ اپنے نتائج اخذ کرنے میں استعمال کیا ہے۔اس کتاب میں نقطۂ نظر تبدیل کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔اور دلیل اختلاف رائے کو موافقت میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔مصنف کا اسلوب اگرچہ ادبی نہیں ہے اس کے باوجود ابلاغ متاثر نہیں ہوتا۔کتاب اردو کے ایک بڑے ادارے سنگ میل پبلی کیشنز نے شائع کی ہے۔قیمت نسبتاً زیادہ ہے۔پروف خوانی کی چند اغلاط بھی موجود ہیں۔خاص طور پر سنین میں لیکن اس کے باوجود یہ عالمی سیاست کے تناظر میں اہم کتاب ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شاہد مسعود، زوال (کالم) میرے مطابق، مشمولہ روزنامہ جنگ، لاہور: ۳ جون ۲۰۰۹ء۔ ص ۶

۲۔ پس پردہ۔عالمی سیاست کے مخفی حقائق، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔ فلیپ

۳۔ پس پردہ۔ ص ۷

۴۔ ضیاء الحسن، پس پردہ۔عالمی سیاست کے مخفی حقائق (تبصرہ) مشمولہ بازیافت: تحقیقی و تنقیدی مجلہ، لاہور: شمارہ
نمبر ۱۳، جولائی ۲۰۰۸ء تا دسمبر ۲۰۰۸ء۔ ص ۳۹۵

۵۔ Michael Ruppert, Crossing the Rubicon: Decline of the American
Empire at the end of the Age of Oil,Gabroila, BC: New Society Publishers,2004.

۶۔ شاہد مسعود، میرے مطابق، مجلہ بالا

۷۔ پس پردہ۔ ص ۴۳

۸۔ پس پردہ۔عالمی سیاست کے مخفی حقائق (تبصرہ)۔ ص ۳۹۸

۹۔ پس پردہ۔ ص ۱۱۲

۱۰۔ فنڈلے، پال، امریکہ کی اسلام دشمنی از جرا ترجمہ احسن بٹ، لاہور: نگارشات، ۲۰۰۴ء۔ ص ۷۹-۷۸

۱۱۔ پس پردہ۔ ص ۷۳

۱۲۔ سلوی، ایم اے، دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ کے معصوم شکار، از جرا ترجمہ
یحییٰ خان، لاہور: نگارشات، ۲۰۰۸ء

۱۳۔ پس پردہ۔ ص ۱۵۹

مکاتیب مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

مبصر: سعید اکرم

مرتب: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ صفحات: ۳۱۶۔ قیمت: ۲۲۵ روپے۔ ناشر: ادارہ مطبوعات سلیمانی، اردو بازار لاہور

مکتوب نویس اور مکتوب الیہ کا باہمی تعلق اگر محبت، خلوص اور ہمدردی کا ہو اور اسی طرح ادبی تعلق اگر باقی سب تعلقات پر فوقیت رکھتا ہو تو اس کے نتیجے میں لکھی ہوئی تحریریں یقیناً ادبی حوالے سے خاصی اہمیت کی حامل تحریریں ہوا کرتی ہیں۔ مجھے اس حقیقت کا اس وقت شدت سے احساس ہوا جب میں نے محترم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی مرتب کردہ نئی کتاب ''مکاتیب مشفق خواجہ بنام ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی'' پڑھی۔

مکتوب نویس۔ مشفق خواجہ (خدا انھیں اپنی جوار رحمت میں جگہ نصیب کرے۔ آمین) اور مکتوب الیہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (خدا انھیں عمر دراز عطا کرے۔ آمین) دونوں ہی اردو کے تحقیقی ادب کے حوالے سے اس دور کی ممتاز شخصیتیں شمار ہوتے ہیں اور دونوں کی ادبی خدمات کا ایک دنیا اعتراف کرتی ہے۔ مشفق خواجہ تحقیق، مزاح نگاری، کالم نویسی اور شاعری میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں اور انھیں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ ایک عرصے تک علمی و ادبی رفاقت و معاونت کا اعزاز بھی حاصل رہا ہے۔ ان کے قلمی آثار اردو ادب کا قیمتی سرمایہ شمار ہوتے ہیں۔ اور ان کے ادبی کارناموں پر اب تک درجنوں کتب اور رسائل ترتیب پا چکے ہیں نیز ان کے احوال و آثار پر اس وقت پی۔ ایچ۔ ڈی کے دو مقالے زیر تحقیق ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (سابق صدر شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور) اس وقت شعبہ اقبالیات، پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بطور ایچ۔ ای۔ سی ایمینٹ سکالر وابستہ ہیں اور اقبال اکادمی پاکستان لاہور اور ادارہ معارف اسلامی لاہور کے اعزازی رفیق علمی بھی ہیں۔ تحقیق و تنقید اور اقبالیات کے شعبوں میں ان کی کم و بیش ۳۵ تصنیفات و تالیفات چھپ چکی ہیں۔ وہ بین الاقوامی کانفرنسوں کے سبب دنیا کے متعدد ممالک دیکھ چکے ہیں اور ان کا حلقۂ احباب ملک سے باہر بھی دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس تالیف میں اپنے نام مشفق خواجہ کے ۱۴۳ خطوط (مع چند مستند نقادوں کے چھپے ہوئے خطوط کے) جمع کر کے اردو کے خطوط نگاری کے اثاثے میں ایک قیمتی اضافہ کیا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی بجا لگتا ہے کہ مشفق خواجہ کے خطوط ''مشفق نامے'' اور ''خطوط مشفق'' بالترتیب بنام محمد عالم مختار حق و ڈاکٹر طیب منیر، دو علیحدہ علیحدہ مجموعوں کی صورت میں پہلے ہی منظر عام پر آ چکے ہیں اور جن کی ادبی اہمیت سے بھی کسی صورت انکار نہیں کیا جا سکتا۔

زیرِ نظر کتاب میں مشفق خواجہ کے خطوط پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کا ایک میلہ لگا ہوا ہے جس میں پاکستان ہی کے نہیں پاکستان سے باہر کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر بھی موجود ہیں اور جہاں اردو ادب کے بڑے بڑے مراکز لاہور، کراچی اور اسلام آباد کے علاوہ دہلی بھارت سے آئے ہوئے لوگ تو بالخصوص نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ اس دور کی بڑی بڑی تحقیقی کتب کی ایک نمائش بھی لگی ہے جس میں کتاب کے ہمراہ اس کا مصنف بھی کھڑا نظر آتا ہے۔ اور اگر کوئی چاہے تو اس میلے کا چکر لگا کر اس دور کے تحقیقی اور تنقیدی ادب کا مفصل نامہ آسانی سے مرتب کر سکتا ہے۔

مشفق خواجہ کے خطوط کے مطالعہ سے جو بات سب سے نمایاں دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے تادمِ آخر تحقیق، تنقید اور مطالعہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ انھیں ادبی کتب کے ساتھ عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ وہ ہر اچھی کتاب کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرتے، خود پڑھتے اور دوسروں کو پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ انھیں بہت کچھ کرنے کے باوجود کچھ نہ کر سکنے کا احساس ہمیشہ لاحق رہا۔

> ''سچی بات یہ ہے کہ اب تو جی چاہتا ہے کہ صرف اپنے نامکمل کاموں کو مکمل کروں یا جو مکمل رکھے ہیں انھیں نظرِ ثانی کے بعد چھپوا دوں۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ میرے پاس کلاسیکی شعرا پر تقریباً ڈیڑھ سو غیر مطبوعہ مضامین رکھے ہیں، عادت یہ ہے کہ کام کرتا ہوں اور اٹھا کے رکھ دیتا ہوں۔ اب عمر کی اس منزل میں ہوں کہ اس عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے غیر مطبوعہ کاموں کو چھپوانے کی فکر میں ہوں۔ آج کل ایک پریشانی اور بھی ہے کہ میرے کتب خانے کا کیا ہوگا۔ ۵۰، ۶۰ ہزار سے زیادہ کتابیں اور رسالے ہیں اور خطوط کا بہت بڑا ذخیرہ ہے .....''
> (صفحہ ۱۴۶۔۱۴۷)

> ''ارمغانِ محمود شیرانی''، ''ارمغانِ علمی''، ''ارمغانِ سید عبداللہ'' اور دوسری تحقیقی کتب کی تالیف کی خواہش اور ان کی تالیف میں تاخیر پر تشویش مکتوب الیہ کے نام ان کے درجنوں خطوط میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ''ارمغانِ علمی'' کا نام اب ارمغانِ تاخیر رکھ دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس کام میں مسلسل تاخیر ہو رہی ہے۔ نصف درجن مقالہ نگار تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں.....'' (صفحہ ۱۸۸)۔

ان کے مطالعہ کا شوق ملاحظہ کیجیے۔ ایک جگہ اپنی مکتوب بنام رشید حسن خان لکھتے ہیں:

> ''..... بیماری کا ایک دلچسپ نتیجہ یہ ہے کہ ۶۸ برس کا ہوں لیکن ۱۲۸ برس کا نظر آتا ہوں۔ میز پر بیٹھ کر البتہ کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ روزانہ دس بارہ گھنٹے لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں بس بیماری کا یہی پہلو اطمینان بخش ہے کہ اس نے میرا حوصلہ نہیں چھینا۔'' (صفحہ ۱۸۷)

ان کی شگفتہ مزاجی ان کے کالموں کی طرح ان کے خطوط میں بھی ہر جگہ تازہ پھولوں کی طرح مہکتی نظر آتی ہے۔ وہ اتنے خوبصورت انداز میں مزاح کرتے ہیں کہ پڑھنے والا بے اختیار مسکرانے لگتا ہے۔ ''.....(بھارت سے) واپس آ کر مفصل خط لکھے گا جو سفرنامے کی طرح طویل اور دلچسپ ہو۔ مگر آپ کا سفرنامہ تو شرعی نوعیت کا ہوتا ہے۔ ہم جیسے آوارہ خانوں کی خاطر اب کے دو چار

اچھے چہرے بھی دیکھ لیجیےگا۔اس کارِخیر کا گناہ میرے سر رہےگا آپ سے کوئی پرسش نہ ہوگی۔"(صفحہ ۱۷۲) "آج موصول ہونے والے تراشوں میں ایک ایسی تصویر بھی ہے جس میں ایک کنارے پر آپ ہیں اور دوسرے کنارے پر ایک خوبصورت چہرہ۔ بیچ میں دو آدمی کھڑے ہیں وہ کباب میں ہڈی نظر آتے ہیں۔آپ کے چہرے پر جو بشاشت نظر آرہی ہے وہ دوسرے کنارے ہی کا فیضان معلوم ہوتا ہے۔تحسین فراقی صاحب اس تصویر میں نہیں ہیں ورنہ وہ آپ کو محظوظ نہ ہونے دیتے اور......"(صفحہ ۱۷۲) لگتا ہے مشفق خواجہ کا ڈاکٹر تحسین فراقی کے ساتھ خصوصی تعلق خاطر تھا کہ تقریباً ہر خط میں ان کا ذکرِ خیر بالتزام ملتا ہے۔

مشفق خواجہ کی خوبصورت مزاح نگاری کے ہمراہ اس کتاب میں ان کے بعض سنجیدہ اور فکر انگیز جملے قاری کو ایک دم غمزدہ کر دیتے ہیں۔وہ ابتر سیاسی حالات اور قومی حادثات کی مختصر مگر جامع الفاظ میں ایسی مکمل تصویریں پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اچانک سر پکڑ کر رہ جاتا ہے اور جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ صرف شگفتہ مزاج ہی نہیں دردِ دل رکھنے والے انسان بھی تھے۔

"آپ بنگلہ دیش ضرور جائیں۔بہت اچھا تجربہ ہوگا۔میں تو ذہنی طور پر آج تک مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو قبول نہیں کر سکا۔یہ دراصل ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے کہ بنگالی ہم سے الگ ہو گئے ورنہ وہ تو ہم سے بہتر مسلمان ہیں۔آج بھی بنگال میں مخلص مسلمانوں کی تعداد ہم سے زیادہ ہے۔"(صفحہ ۴۳)

"محمد صلاح الدین صاحب کے بعد اب "تکبیر" میں لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔آپ یقین کیجیے میں صرف اور صرف صلاح الدین کے لیے لکھتا تھا......سات سال تک لکھا اور کوئی معاوضہ نہ لیا......"(صفحہ ۱۴۴)

"کراچی کے حالات مختلف وار خراب اور درست ہوتے رہتے ہیں۔آج کل ہمارے علاقے میں سکون ہے۔ملیر اور فیصل کالونی اور بعض دوسرے علاقے حالتِ جنگ میں ہیں۔"(صفحہ ۴۸)

محترم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اس کتاب کی ترتیب و تالیف اور اسے خوبصورت شکل دینے میں جو سعی کی ہے اس میں انھوں نے مشفق خواجہ کے ساتھ اپنی ۳۶، ۳۷ برس کی ادبی و روحانی رفاقت کا حق ادا کر دیا ہے۔مشفق خواجہ کے خطوط کے ہمراہ حسبِ ضرورت مختصر اور جامع حواشی کے اضافے سے اس دور کے ادبی خاکے میں اور بھی رنگ بھر دیا ہے۔کتاب کے آغاز میں حرفِ اول کے عنوان سے کتاب کے تعارف اور مقدمہ کے عنوان سے اپنے مضمون میں انھوں نے مکتوب نویس کے ساتھ اپنی علمی و ادبی رفاقت کی کہانی بیان کر کے کتاب کو سمجھنے کے لیے کافی مواد فراہم کر دیا ہے اور ہر بات کا مستند حوالہ دے کر کتاب کی ادبی قیمت کو بڑھا دیا ہے۔علاوہ ازیں کتاب کے شروع ہی میں ڈاکٹر خالد ندیم کا مرتب کردہ مشفق خواجہ کا کوائف نامہ اور پھر مؤلف کا اپنا مرتب کردہ مشفق کے چند احباب کا تعارف، کہ جن کا کتاب میں ذکر بکثرت آیا ہے، دے کر کتاب کو اور بھی مکمل اور خوبصورت بنا دیا ہے۔ڈاکٹر خالد ندیم کا مرتب کیا ہوا کتاب کا اشاریہ بھی خاصے کی چیز ہے جو ہر دو حضرات کے ساتھ ان کی عقیدت اور محبت کی دلالت کرتا ہے۔کتاب کو پڑھ کر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی تحقیق و تنقید کے میدان میں وسیع تجربے کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا اور یقین ہے کہ اردو ادب کے طلبا اس کتاب سے ہمیشہ کما حقہٗ استفادہ کرتے رہیں گے۔

مختصر تبصرے

اردو سفرنامے میں جنس نگاری کا رجحان، ۱۹۴۷ء کے بعد

مبصر: محمد افضل حمید

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور کی طرف سے ذوالفقار علی احسن کی نئی کتاب "اردو سفرنامے میں جنس نگاری کا رجحان، ۱۹۴۷ء کے بعد" کی اشاعت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

سفرنامہ پر تنقیدی مواد مقدار میں تو کم ہے ہی بیشتر اوقات معیار میں بھی کم تر محسوس ہوتا ہے۔ ذوالفقار علی احسن لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے اردو نثر کے اس تشنہ باب کی آب یاری کے لیے ایم اے کی سطح پر "اردو سفرنامے میں طنز و مزاح کے عناصر، قیام پاکستان کے بعد" اور اب ایم فل کی سطح پر اردو سفرنامے میں جنس نگاری کے موضوع پر تحقیقی مقالے لکھے۔ جن میں سے جنس نگاری کا مقالہ اب کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد شفیق الرحمٰن، ابن انشا اور محمود نظامی نے سفرنامے کو عوامی پذیرائی دلائی اور خاص طور پر بیسویں صدی کے آخری تین عشروں میں اے حمید، مستنصر حسین تارڑ، رضا علی عابدی اور عطاء الحق قاسمی نے اپنے رنگا رنگ اسالیب سے سفرنامے کو مقبول عام صنف بنایا۔ جو ادیب اپنی نہایت میں مزاح نگار تھے انھوں نے سفرناموں کو کشت زعفران بنا دیا اور جو افسانہ نگار تھے انھوں نے سفرناموں کو فکشن کا تڑکا لگا دیا۔ موخر الذکر رجحان کو بعض سفرنامہ نگاروں کی مقبولیت کی وجہ جانتے ہوئے بہت سے سفرنامہ نگاروں نے لازم جانا کہ اپنے سفرناموں میں کوئی داستانِ عشق شامل کر کے یا مغرب میں جنسی بے راہ روی کی تصویر کشی کر کے قاری کو محظوظ کیا جائے۔ لیکن سفرنامے کا یہ رجحان چٹخارہ بازی سے بڑھتے بڑھتے جنسی تلذذ تک جا پہنچا۔

ہماری جامعات عام طور پر جنس کے موضوعات کو تحقیق و تنقید کے لیے منتخب کرنے سے کتراتی ہیں کیوں کہ ہمارے معاشرے میں جنس پر کھلم کھلا بحث و تمحیص کو موزوں نہیں سمجھا جاتا اسی لیے زیر بحث مقالہ کے متعلق ڈاکٹر سلیم اختر فلیپ میں لکھتے ہیں:

> "اب ہماری جامعات بھی بالغ ہو رہی ہیں جس کے نتیجہ میں جامعات کے تحقیقی مقالات 'احوال و آثار' کے آثار قدیمہ کے حصار سے باہر آ کر کھلی فضا کا مزا چکھ رہے ہیں۔"

معاشرتی حوالے سے اس موضوع کے حساس ہونے کے علاوہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ سفرنامہ نگاروں کے ہاں جنس نگاری کے رجحان کا تجزیہ کرنے کے لیے محقق اور نقاد کے پاس جو نفسیاتی ژرف نگاہی درکار ہوتی ہے وہ ہمارے ہاں ابھی کم یاب ہے۔

ذوالفقار علی احسن کا کمال یہ نہیں ہے کہ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کو اس موضوع پر تحقیق کی اجازت دینے پر آمادہ کیا،

ان کا اصل کمال یہ ہے کہ جنس نگاری کے محرکات اور جنس نگاروں کی تحلیل نفسی میں انھوں نے جس مہارت کا مظاہرہ کیا ہے اور نفسیات کی جدید اصطلاحوں سے واقفیت کے سبب، بعض سفرنامہ نگاروں کی شخصی تفہیم جس انداز میں کی ہے اس سے قبل اردو تنقید و تحقیق میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اولین باب میں ذوالفقار علی احسن نے جنسیات کی تاریخ، جنسی تلذذ کے مختلف زاویوں یعنی جنسی انحرافات، جنسی تسکین، جنس زدگی، ہم جنسیت، ایذا طلبی، ایذا کوشی، ایونیت، ڈان جوآن، ہوس نگاری، جنسی علامت پرستی، نمائشیت پسندی، نرگسیت، ہوس دید اور دیگر اصطلاحوں کو بڑے عالمانہ انداز میں بیان کر کے ان کا ادب اور اخلاقیات سے ربط واضح کیا ہے۔ دوسرے باب میں ۱۹۴۷ء سے پہلے اور تیسرے اور سب سے اہم باب میں ۱۹۴۷ء کے بعد لکھے گئے سفرناموں میں جنس نگاری کے رجحان کا تحقیقی تنقیدی اور نفسیاتی جائزہ لیا ہے۔ اور جنس نگاری کے نمونے پیش کر کے ان پر سیر حاصل تبصرے کیے ہیں۔ اور بعض اوقات طنز اور مزاح کی آمیزش سے ان تبصروں کو سہ آتشہ بنا دیا ہے۔ باب چہارم میں چند منتخب سفرنامہ نگاروں یعنی کرنل محمد خان، شفیق الرحمٰن، مستنصر حسین تارڑ اور عطاالحق قاسمی کی تحریروں کا ایسا عالمانہ تجزیہ کیا ہے کہ ان حضرات پر تنقید و تحقیق کے لیے مباحث کے نئے جہان دریافت کر دیے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید سنڈے میگزین روزنامہ نوائے وقت لاہور کی ۱۵ فروری ۲۰۰۹ء کی اشاعت میں صفحہ ۱۵ پر لکھتے ہیں:

"خوبی کی بات یہ ہے کہ مصنف تنی ہوئی رسی پر بانس پکڑے بغیر ڈولتے نظر نہیں آتے اور مشکل مقامات بھی آسانی سے سر کر جاتے ہیں۔ انھوں نے قلم محتاط انداز میں پکڑا ہے، لیکن حقیقت کو بیان کرنے سے گریز نہیں کیا اور مثبت اخذ نتائج کرتے ہوئے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"

امید کی جا سکتی ہے کہ ذوالفقار علی احسن کی یہ کتاب اردو سفرنامہ نگاروں کے مطالعہ کے لیے رہنما کا کام کرے گی۔

مکالمات جاوید (ڈاکٹر جاوید اقبال کے انٹرویوز)

مبصر: ڈاکٹر محمد ایوب اللہ

مرتبہ: ڈاکٹر اختر النساء ناشر: نشریات، الحمد مارکیٹ اردو بازار لاہور صفحات: ۲۱۴ قیمت: ۲۰۰ روپے

جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال کے زیر نظر مصاحبوں (انٹرویو) کا دورانیہ ۱۹۶۵ء سے لے کر ۱۹۹۳ء تک محیط ہے۔ اس کتاب میں کل انیس مکالمات شامل ہیں۔ انٹرویو نگاروں نے بعض اہم سوالات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ہر انٹرویو پر ایک مرکزی عنوان قائم کیا ہے۔ مثلاً (۱) اقبال کن معنوں میں زندہ ہے؟ (۲) روح اقبال مضطرب ہے (۳) ابا جان زندہ ہوتے تو (۴) اتحاد عالم اسلامی کے داعی (۵) اقبال کی ترجمانی (۶) علامہ اقبال اور سید مودودی (۷) فکر اقبال کی ترویج و اشاعت (۸) علامہ اقبال اور پاکستان کی عملی تشکیل (۹) مستقبل کا مفکر (۱۰) ڈاکٹر نامسن کی تضاد بیانی (۱۱) اقبال شناسی کا قحط (۱۲) اقبال کا تصور پاکستان (۱۳) اقبال اور کشمکش حیات (۱۴) اسلام، پاکستان اور اقبال (۱۵) اقبال اور ایرانی انقلاب (۱۶) جمہوریت کی کشمکش اور پاکستان

(۱۷) میری پہچان (۱۸) کیا اقبال محض ایک شاعر تھے؟ (۱۹) کچھ یادیں۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے علامہ اقبال کی درونِ خانہ زندگی کے بعض معاملات کا تذکرہ کیا ہے۔ فکرِ اقبال پر چھپنے والی تحریروں پر بھی وہ نظر رکھتے ہیں اس لیے مختلف مصنفین کے ہاں جو تضادات پائے جاتے ہیں ان کی نشان دہی کرتے ہوئے اقبال کا اصولی اور صحیح موقف واضح کیا ہے۔

جاوید اقبال نے ایک انٹرویو میں بطورِ خاص وضاحت کی ہے کہ اسلام سے اقبال کا لگاؤ اور محبت ڈھلتی عمر کے ساتھ ساتھ اس قدر ترقی کر گئی کہ آخر فلسفہ و تصوف بھی ان کی نگاہ میں بے کار ہو گئے۔ اسلامی روایات سے محبت اس قدر بڑھتی جا رہی تھی کہ اپنی بیٹی کو سر کے بالوں کی دو چوٹیاں بنانے سے روک دیا کہ یہ طریقہ یہود کا ہے۔ بیٹے کے لیے زمین پر سونا ان کے لیے باعثِ مسرت ہوتا تھا۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کی باتوں میں بھی تاسف اور فکر مندی کی وہی جھلک نظر آتی ہے جو حضرت علامہ کے ہاں موجود تھی۔ وہ پاکستان اور امتِ مسلمہ کے زوال و انحطاط پر نوحہ کناں ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد ہم نے اپنی ذمہ داری کو خاطر خواہ طریقے سے پورا نہیں کیا۔

ان مکالمات کے مطالعے سے ڈاکٹر جاوید اقبال کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے بیانات سے ان کے بارے میں اچھا تاثر پیدا نہیں ہوتا، مگر ان کے زیرِ نظر مکالمات سے ان کی شخصیت کے توازن، پاکستان کے لیے ان کے ہاں جذبۂ دردمندی اور مسلم امہ کی زبوں حالی کے لیے ان کی تڑپ ظاہر ہوتی ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے اس کتاب کے پیش لفظ میں بجا طور پر تحریر فرمایا ہے کہ یہ مجموعہ جاوید اقبال صاحب کی شخصیت کو سمجھنے کے ساتھ اقبالیات کی بہتر تفہیم میں بھی معاون ثابت ہوگا۔

علامہ اقبال: شخصیت اور فن

مبصر: ڈاکٹر محمد ایوب للہ

اکادمی ادبیات نے "پاکستانی ادب کے معمار" کے سلسلے میں ایک سو سے زائد مشاہیرِ علم و ادب پر مونوگراف طرز کی کتابیں شائع کی ہیں۔ اسی سیریز میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی کتاب "علامہ اقبال: شخصیت اور فن" شائع ہوئی ہے۔ حضرت علامہ پر کم و بیش ایک صدی سے لکھا جا رہا ہے۔ سینکڑوں کتابوں اور ہزاروں مضامین میں ان کی شخصیت اور فن کو مختلف زبانوں میں موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان سب کی موجودگی میں اقبال کی شخصیت اور فن کو موضوع بنانے کی آخر کیا ضرورت تھی اور وہ بھی اس اجمالی انداز میں؟ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب نے اس کا جواب اس انداز سے دیا ہے کہ یہ "تازہ واردان" کے لیے ہے کہ ایک مختصر کتاب میں اقبال کے فکر اور ان کی شخصیت کا واضح نقش سامنے آ سکے۔ اس سے بھی ایک بڑی وجہ جواز یہ ہو سکتی ہے کہ عدیم الفرصتی کے اس دور میں اس طرح کی کتاب نسلِ نو میں فکرِ اقبال کی چینک پیدا کرنے کے لیے بہت ضروری تھی۔

ڈاکٹر ہاشمی صاحب نے سوانح، شخصیت اور فن کو اس مختصر کتاب میں باہم مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ کتاب کو چھ میں ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کتاب کا آغاز اقبال کے آبا و اجداد کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور اقبال کی وفات تک کے تمام چیدہ چیدہ واقعات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ اور مختلف عنوانات کے تحت پیش کیا گیا ہے۔ ابواب کے عنوانات اقبال کے کسی نہ کسی مصرعے

سے اخذ کیے گئے ہیں۔کتاب کا آخری باب اقبال کی وفات کا ہے۔اقبال کی ذاتی زندگی پر بعض لوگوں نے لکھتے ہوئے اعتدال کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔مثلاً عطیہ فیضی کے بیانات سے بعض غلط فہمیاں جنم لے سکتی ہیں۔اسی طرح اقبال کی فکر کے حوالے سے بھی بعض لوگ افراط و تفریط کا شکار ہوئے ہیں۔اس لیے ضروری تھا کہ کوئی ایسا شخص جس نے اپنی زندگی کا ایک وقیع حصہ اقبال اور اقبالیات کے مطالعے میں صرف کیا ہو،اس کی اصل صورت کو لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ڈاکٹر ہاشمی صاحب کا یہ مطالعہ ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔

اس کتاب میں جہاں اقبال کی بعض شخصی کمزوریوں مثلاً امیر بیگم سے گانا وغیرہ سننا یا ایماد کیے نا ست کو بار بار یاد کرنے کا ذکر ملتا ہے وہاں اسلام پر ان کے غیر متزلزل یقین کا بھی بار بار نقش سامنے آتا ہے۔عشقِ رسولؐ تو ان کی مٹی میں گندھا ہوا تھا کہ سفر یورپ پر جاتے ہوئے ۱۹۰۵ء میں بھی وہ ریگ نواح کاظمہ سے بے پناہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور اس عقیدت میں اضافہ مرتے دم تک فزوں تر ہوتا جاتا ہے۔

فکرِ اقبال میں فقرِ غیور کا جو درس ملتا ہے،اقبال کی اپنی زندگی اس کی بھرپور مثال پیش کرتی ہے۔اقبال اپنے پیشہ ورانہ ذریعے (وکالت) سے ہزاروں روپے کما رہے تھے مگر ۱۹۳۵ء میں بیماری کے سبب مالی مشکلات کا شکار ہو چکے تھے تو نواب بھوپال نے ۵۰۰ روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔نواب بھوپال کی کوشش سے کچھ اور وظیفے ملنے کی امید بھی تھی مگر اقبال نے نواب بھوپال کے مذکورہ وظیفے کو کافی خیال کیا اس ضمن میں ایک خط میں راس مسعود کو لکھتے ہیں:

> ”آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے، وہ میرے لیے کافی ہے اور کافی نہ بھی ہوتو میں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپے کا لالچ ہے، جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔“

امتِ مسلمہ کے لیے درد و سوز آرزومندی اور تڑپ اور برِ عظیم کے مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا حصول، جہاں اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزاری جا سکے ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔اقبال اسلام کو تمام بنی نوعِ انسان کی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

اقبال عمر بھر فقہ اسلامی کی تدوینِ نو کے لیے فکر مند رہے اور امتِ مسلمہ کے جمود کو توڑنے کی مسلسل سعی ان کے ہاں نظر آتی ہے۔اس سلسلہ میں ان کے سامنے بہت سے منصوبے تھے لیکن ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جن وسائل و افراد کی ضرورت تھی وہ میسر نہ آ سکے۔یوں اقبال کے بہت سے منصوبے شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔

مجموعی طور پر اس کتاب کے مطالعے سے قاری کی ملاقات ایک ایسے اقبال سے ہوتی ہے جو امتِ مسلمہ کے ناگفتہ بہ حالات کے باوجود دل شکستہ اور مایوس نہیں ہے، دنیا کے تمام ازم اسے اسلام کے مقابلے میں ہیچ نظر آتے ہیں۔

دیوان اختر۔۔تازگیِ فکر کا مرقع

مبصر: خواجہ محمد زکریا

اختر سعید پیشہ ور شاعر نہیں۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنی شاعری کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔وہ اس کے بارے میں سنجیدہ ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں وہ مقدار (تعداد) میں کم ہو سکتا ہے لیکن معیار میں کسی جدید غزل گو سے کم نہیں۔

ان کا یہ مجموعہ ''دیوان اختر'' اوسط ضخامت کا ہے جس پر صفحات کے نمبر درج نہیں ہیں اور نہ ہی غزلیات کے نمبر ہیں۔یہ سراسر غزلیات کا مجموعہ ہے۔سرسری طور پر اس سے گزرنے پر اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سی غزلیں غیر مردف ہیں اور جہاں ردیف موجود ہے بہت مختصر ہے۔اس قسم کی غزلیات میں تسلسل موضوعات کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور کم از کم وہ اشتہار پیدا نہیں ہوتا جو ہمارے بیشتر غزل گو شعراء کے ہاں معمولات کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسری بات جس کا فوری طور پر احساس ہوتا ہے، یہ ہے کہ اس میں متروکات سے بے دریغ استفادہ کیا گیا ہے۔میں یہ بات خوبی کے طور پر کہہ رہا ہوں اور اسے کم از کم خامی ہرگز نہیں سمجھتا۔متروکات کیا ہیں اور کس اصول کے تحت بعض لفظوں کو اساتذہ نے ترک کیا۔یہ ایک طویل موضوع ہے۔مختصر یہ کہ اردو کے بہت سے لہجے ہیں۔ہندی والوں نے اپنے لغات میں کئی لہجوں کو معیاری قرار دے کر انھیں شامل کر لیا ہے جبکہ اردو میں معیاری لہجے صرف دہلی اور لکھنو کے شہروں کے قرار پائے ہیں۔چنانچہ ان شہروں میں رہنے والوں نے اپنے شاگردوں کو ہدایت کی کہ فلاں فلاں لفظ کو استعمال نہ کیا جائے کیونکہ وہ غیر فصیح ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ بہت سے الفاظ جو فصیح ہیں اور اردو گرامر کی رو سے معیاری ہیں بلاوجہ ترک کر دیے گئے۔مثلاً کرنا سے فعل ماضی 'کیا' کو معیاری قرار دیا گیا اور اس کی دوسری شکل ''کرا'' کو غیر فصیح قرار دے کر ترک کر دیا گیا مگر ''کرا'' میں نہ کوئی صوتی نقص ہے اور نہ ہی کوئی اور کمی البتہ قواعد کے مطابق ہے اور ''کیا'' خلاف قواعد ہے مگر اسے بلاوجہ اختیار کر لیا گیا۔یہی صورت 'آئے' کے مقابلے میں 'آوے' کی ہے جو ہر لحاظ سے 'آئے' سے بہتر ہے۔چنانچہ اختر سعید نے بعض متروکات کو دوبارہ اختیار کر لیا ہے جو زبان کی خدمت کے علاوہ شعری تاثر کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے۔

دیوان اختر کی غزلیات کا شاعر کہیں فلسفی، کہیں صوفی، کہیں مومن اور کہیں دور حاضر کی اصطلاح میں انسان دوست نظر آتا ہے۔وہ حیات و کائنات کے مسائل پر غور کرتا رہتا ہے، یہ مسائل ایسے پیچیدہ ہیں کہ ان پر ہزاروں برسوں سے دنیا کے بہترین دماغ غور کرتے چلے آئے ہیں۔کچھ مسائل کو سائنس نے کسی قدر سلجھا دیا ہے لیکن بہت سے مسائل ابھی تک لاینحل ہیں۔کائنات کی ابتدا کا مسئلہ ہو یا خدا کی کائنات میں حیثیت و اہمیت کا معاملہ ہو۔۔۔حیات و کائنات کے بامقصد یا بلامقصد ہونے کا قضیہ ہو یا اخلاقیات کی بحثیں ہوں، ان پر حتمی رائے قائم کرنا اور انھیں دیگر سوچنے والوں کے لیے قابل قبول بنانا آج بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا دو تین ہزار سال پہلے تھا۔ان حالات میں سوچنے والا حساس دماغ بعض اوقات الجھ کر رہ جاتا ہے اور بعض اوقات کسی مسئلے کے

بارے میں کسی نتیجے پر مطمئن ہو کر خوشی بھی محسوس کرتا ہے۔

ایسی صورت میں ایک بہتر حل یہ ہے کہ سوچنے والا ذہن، دوسروں کی سوچ کو مسترد کرنے کی بجائے اس کے امکانات کو تسلیم کرے۔ اس سلسلے میں ایک رویہ صوفیاء کا ہے جو کسی مسلک اور عقیدے سے پیر نہیں رکھتے بلکہ تمام انسانوں سے محبت کرتے ہیں۔ وہ تمام منفی باتیں جو انسان کو انسان سے لڑاتی ہیں اور دنیا میں مناقشات کا باعث ہیں، ان سے صوفی پرہیز کرتا ہے اور پرہیز کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ہوس، لالچ، نفرت، نمود و نمائش، تکبر ۔۔۔ اور ایسی ہی تمام منفی خواہشات پر قابو پا کر تمام انسانوں سے بلاتمیز مذہب و ملت پیار کرنا صوفی کا مسلک ہے۔

موجودہ "انسان دوستی" کی اصطلاح بھی اس سے مماثلت رکھتی ہے جس کا پرچار کرنے والے مذہب، رنگ، نسل، جنس، علاقہ وغیرہ کے فرق کو نظر انداز کر کے تمام انسانوں کی فلاح کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے جدید انسان دوستی اور ماضی کے تصوف کی بنیاد ایک ہی ہے۔

دیوان اختر میں اسی قسم کے افکار و خیالات سے جگہ جگہ واسطہ پڑتا ہے:

کہیں ہو درج جہاں میں مجھے کرے ہے اثر — جدید رنجِ زمانہ کو میں ہوں مقناطیس

شکار ہوں تیرا یہ گزارش ہے بعد عجز — شکار کے بارے میں بڑی بحث چلی ہے

صبح سے شام تلک دوڑتی نسل آدم — رک کے پوچھے کبھی خود سے کہ کدھر جاتی ہے
زندگی تک ہے اگر غم تو نہیں ہے کچھ غم — زندگی آنکھ جھپکتے ہی گزر جاتی ہے

جان نکل جائے گی تو فیصلہ دیں گے کیا خوب — صاحبو ایسی مکافات سے کیا ہوتا ہے

ہر اک نے دیکھا ہے دنیا کو اپنی عینک سے — ہر ایک دعوے کو ہر مدعی کو دیکھا ہے

آدم ہوں کہ مانند نباتات و جمادات — اور اس پہ توقع ہے کہ راضی برضا ہوں

صبح سے شام شام سے پھر صبح — کون جانے یہ سلسلہ کیا ہے
میری کوشش سے کچھ نہیں کھلتا — میری تقدیر میں لکھا کیا ہے

بے چارگی دوش ہے اور بار گراں ہے — اظہار پہ پابندی ہے اور منہ میں زباں ہے

تھی بہت خانہ خرابی کو ہماری یہ عمر — اک جہاں اور بھی بنتے ہیں یہاں سے آگے

ان فلسفیانہ افکار کے علاوہ دیوان اختر میں موجودہ حالات کی عکاسی بھی جگہ جگہ کی گئی ہے۔ رہنما، امراء، علماء اور عوام میں

جو فاصلے اور جو تضادات ہیں ان کا بہت اچھے انداز میں اظہار کیا گیا ہے:

اٹھا کے راہ نشینوں کو پھینک دو کہیں اور ہوا ہے وقت شہنشاہ کی سواری کا

کس شہر خموشاں میں چلے آئے ہیں ہم لوگ نے زور سناں ہے نہ کہیں شور فغاں ہے

ابھی تمھیں نہیں اندازہ کل کو کیا ہو گا ابھی تو تم نے مری بے کسی کو دیکھا ہے

ایک یہ بھی تو کھلے کچھ تری نیت کیا ہے ندرت فکر اور اندازِ سخن کیا کہنا

غرض دیوان اختر حساس فکر کا بہت اچھا مرقع ہے۔اس کے صفحے صفحے سے ایک حساس ذہن کی باریک سوچیں آشکار ہیں۔اس مجموعے کا شاعر مسائل پر خود سوچتا ہے اور ہمیں بھی سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔اس لیے اس میں ایک نیا پن ہے اور وہ فرسودہ خیالات و انداز بیان نہیں ہے جو بیشتر شعری مجموعوں کا خاصہ ہے۔اس مجموعے کا شاعر قاری سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ حیات و کائنات کے مسائل پر خود بھی غور کرے اور اپنا راستہ آپ متعین کرے۔

جس کو دیکھا کسی مردے کا مقلد دیکھا
اپنی ہو جائے ہر اک شخص کی رائے تو بنے

انتخاب کلام مصحفی

امجد اسلام امجد

تیرے بیٹھے جو ہمیں یاد بھی آیا کوئی کام
ہم نے موقوف اسے وقتِ دگر پر رکھا

میں ہوں اور خلوت ہے اور پیشِ نظر معشوق ہے
ہے تو بیداری و لے کچھ دیکھتا ہوں خواب سا

نہ بوسہ لینے کی کر مجھ پر ادیان تہمت
وہ ہو گا اور کوئی شخص میری صورت کا

خواب تھا یا خیال تھا، کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا، کیا تھا
مصحفی! شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا، کیا تھا

یادِ ایام بے قراریٔ دل
وہ بھی یا رب! عجب زمانہ تھا

کم ہے کچھ کندن سے کیا چہرے کا اس کے رنگ زرد
عشق کر کے مصحفی! تو کیمیا گر ہو گیا

یار تو آیا تھا میرے دل میں رات
پر میں تیری وضع سے ڈر کر گیا

اس قدر بھی راحت و آرام کا دشمن نہ ہو
مصحفی! مت دل کو ان ترکیب والوں سے لگا

کل قافلہ نکہت گل ہو گا روانہ
مت چھوڑیو تو ساتھ نسیم سحری کا

دل جدھر جائے ہے میرا، تری صورت کا خیال
ساتھ پھرتا ہے لگا اس کے قضائی سا

بہت رکھا مجھے زنداں میں عشق نے لیکن
علاج ہو نہ سکا اس سرِ ہوائی کا

رکھے ہے حکمِ خزف گوہر اس زمانے میں
ز بس کہ گرم ہے بازار نادانی کا

کہے تو کھیل لڑکوں کا ہے یہ، یعنی مصور نے
جو نقش اس صفحۂ ہستی پہ کھینچا سو مٹا ڈالا

زور آوری نہ کر کہ جو آیا غرور میں
مارا زمیں پہ اس کو فلک نے، پچھرا پچھرا

ہر اشک کو مری مژگاں سے یوں علاقہ ہے
کہ جوں ستار کی کھونٹی سے تار باندھ دیا
فلک کو دیکھ تو اے مصحفی کہ صانع نے
عجب طرح کا یہ نقش و نگار باندھ دیا

حادثے ہوتے تھے زمانے میں
اس قدر انقلاب کس دن تھا!
کشورِ بخت تیرہ روزاں میں
جلوہ گر آفتاب کس دن تھا!

بانگِ رسیدگاں سے گوش زمانہ کر ہے
منزل پہ شور دونا ہوتا ہے کارواں کا

وہ عشق و ولولہ وہ شورہائے و ہُو نہ رہا
ہوئے ضعیف اِدھر ہم اُدھر وہ تُو نہ رہا

جوں اشکِ سرِ مژگاں ہم پھر نہ نظر آئے
از بس کہ یہاں وقفہ اک چشم زدن کا تھا

چلے بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلہ نوبہار ٹھہرے گا

واقسحا! کہ سر پہ مرے آفتاب نے
ہوتے ہی صبح، طشت پُر آتش الٹ دیا

حباب و موج کا کیا حادثہ بیان کیجیے
کہ آ گیا ہے عجب انقلاب میں دریا

وہ جو خود بینی کا اک بت تھا مرے ہاتھوں میں
کیا کہوں میں کہ بڑے زور سے کافر ٹوٹا

غیرت پہ باغباں کی پتھر پڑیں کہ ہم نے
سو بار گل کو ہنستے بادِ صبا سے دیکھا

جس جگہ ڈوبا تھا کل دریا کے اندر مصحفی
اس جگہ کہتے ہیں پانی سا اچھل کر رہ گیا

بارے ترے عہد میں وہ نکلا
خورشید بہت چھپا رہا تھا

اس کے بدن سے حسن ٹپکتا نہیں تو پھر
لبریز آب و رنگ ہے کیوں پیرہن تمام

تُو تو اس شہر سے جاتا ہے ولے یہ ڈر ہے
ہووے جانے سے ترے شہر نہ ویران کہیں

گر ہو طپنچہ بند وہ رشک فرنگیاں
باگے مغل بچے نہ کریں خانہ جنگیاں

کیا جانے کس سے بگڑی ہے دریا میں مصحفی
لہروں کے ہاتھوں میں ہیں جو تلواریں تھکیاں

کعبے کا جانا فرض نہیں ہم کو مصحفی
کعبہ جو ہم سے سیکڑوں فرسنگ ہے تو ہو

حاکم شہر اگر میں ہوں تو اتنا کہہ دوں
کہ کوئی شہر میں آئینے کو صیقل نہ کرو

یہ حسن وہ شعلہ ہے کہ اگر سر کو اٹھاوے
پروانہ بنا دے پرِ جبریلِ امیں کو

اے شوقِ سفر اس کی خبر ہم کو بھی کیجو
گر یاں سے کوئی قافلہ جاتا ہو کہیں کو

میں دم بخود اس کوچے سے گزرا کہ مبادا
پہچان لے دشمن مری آواز حزیں کو

تیار ہوا ہے قافلہ شب
پھر دیر یہ کیا ہے چلنے والو!
ہے مصحفی دوست دار آخر
روٹھا ہے تو اس کو جا منا لو!

اے دوزخِ فراق میں سارا ہی جل گیا
کس دردمند کا نفسِ آتشیں ہے تُو

بیچ دنیا کے کچھ آئے نہیں گھر کرنے کو
مستعد بیٹھے ہیں ہم یاں سے سفر کرنے کو

یہ چمن جائے اقامت نہیں جب تو شب سے
غنچے گٹھری ہوئے بیٹھے ہیں سفر کرنے کو

ان دنوں بس کہ زمانے میں نہیں قدر ہنر
ہم سمجھتے ہیں ہنر ترکِ ہنر کرنے کو

پھرتا ہے کب کا دامنِ صحرا میں گرد باد
یہ کس کی خاک ہوتی ہے برباد دیکھیو

گویا اسے خبر ہے کہ آئی بہار گل
تک اضطراب مرغِ قفس زاد دیکھیو

حلقہ در حلقۂ زنجیر چلے جاتے ہیں
کون کرتا ہے اب احوال اسیراں پہ نگاہ

مصحفیؔ شہر نہیں، شرم ہے اب یاں کس سے
خوب سا کھول کے دل رو کہ بیابان ہے یہ

اٹھنے سے ترے شورِ قیامت بھی گیا بیٹھ — اے فتنہ برخاستہ از بہر خدا بیٹھ
کیا ہم نہیں پہچانتے یہ ساختہ صورت — غصے سے تنک اک اور بھی تو منہ کو بنا بیٹھ

کان دھر کر تو ذرا مصحفیؔ یک بار تو سن
آگے ہے دل کے دھڑکنے کی صدا کیا کیا کچھ

جب تلک مے نہ پئیں کچھ ہمیں آوے نہ نظر — عینکِ چشم ہماری تو میاں ہے شیشہ

زمانے کا چلن یکساں نہیں کچھ — کہیں کچھ ہے کہیں کچھ ہے کہیں کچھ
زمین سر پوشِ خونِ کشتگاں ہے — بغیر از خوں نہیں زیرِ زمیں کچھ
یہ سرگوشی نہ تھی بے وجہ اس کی — کہے تھی چشمِ تر سے آستیں کچھ

شعلۂ شمع کا حریف نہ ہو — نفع تو اک طرف ضرر کو دیکھ
میرے آگے نہ دیکھ آئینہ — میری حسرت بھری نظر کو دیکھ
کیسی فرفر زبان چلتی ہے — اس کی گفتارِ بے خطر کو دیکھ

دیکھ کر کتنے نصاریٰ تجھ کو مومن ہو گئے — بلکہ مومن بھی کئی اسلام سے جاتے رہے

چاندنی رات میں تارے سے پڑے چمکے ہیں
یہ جو ذرات ہیں مکھڑے پہ ترے افشاں کے

ہم کیا کریں چمن میں گر پھر ہوا چلی ہے — اپنا دلِ فسردہ تصویر کی کلی ہے
مرجھا رہے ہیں غنچے، گل ہو گئے ہیں پت جھڑ — اب کے برس چمن میں یہ کیا ہوا چلی ہے

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے

دیکھ کر اس کو بہت روتا ہوں — جو کوئی عمر میں کم مرتا ہے

اے دل! قدم آہستہ کہ اس فرشِ زمیں پر
محنت زدہ چند نے آرام کیا ہے
اس رات ستاروں کی جھکی پڑتی ہیں آنکھیں
اس مہ نے مگر جلوہ سرِ بام کیا ہے

صحرا میں جا کے دیکھ کہ ہر وقت رودِ خشک
ہم رنگ جوئے شیر بناتی ہے چاندنی

مرا سلام وہ لیتا نہیں مگر سمجھا
کہ یہ غریب ہے اس کا سلام کیوں لیجے

کس دن نہ اٹھا دل سے مرے شور پرستش
کس رات یہاں کعبے میں ناقوس نہ باجی

میں تجھ کو یاد کرتا ہوں الٰہی!
ترے بھی دل میں ہو گی یاد میری

بازار میں لیے میں دُرِ اشک کو بکف
اتنا پھرا کہ قیمتِ اول بھی گھٹ گئی

از بس کہ سوا اپنے باقی نہیں یاں کوئی
ہم اس لیے حیراں ہیں اس آئینہ خانے میں

بادِ صبا نے اس کے یہ کیا کان میں کہا
گل کی کلی جو کپڑوں سے باہر نکل پڑی

حکمِ سلطاں ہے کہ اس محکمۂ عدل کے بیچ
دستِ فریاد کو اونچا نہ کرے فریادی

آتا ہے جی میں چادر ابرِ بہار کو
ایسی ہوا میں سر پہ ذرا تان لیجیے

بنسو ہو جانِ من تم اس لیے آشفتہ حالوں پر
کہ صورت آپ نے دیکھی نہیں آشفتہ حالوں کی
دیارِ عشق میں ہر اک کے منہ پر خاک اڑتی ہے
عجب صورت میں دیکھی اس نگر کے رہنے والوں کی

میں ترے واسطے سر ٹیکوں ہوں دیواروں سے
جبیں کس طرح تجھے خانہ خراب آتا ہے

نہ کر اے مصحفیؔ! روزی کا شکوہ
خدا بے زار ہوتا ہے گِلے سے

کون آیا تھا نہانے، لطف بدن نے کس کے
لہروں سے سارا دریا آغوش کر دیا

دو غارت زدہ کی طرح نمایاں ہے تمام
میرے ظاہر سے حقیقت مری ویرانی کی

آشنا سا نظر آتا ہے تو یار
میں نے شاید کہیں دیکھا ہے تجھے

نگینوں سے پلکوں کے شرارے ہی اڑے ہیں
جب اشک کی چلتن کی مرے باڑھ جھڑی ہے

—

کھینچ کر تیغ یار آیا ہے
اس گھڑی سر جھکا دیئے ہی بنی
یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل
ایک شب اور بھی جئے ہی بنی

—

گل ہی اس باغ سے جانے پر نہیں بیٹھا کچھ
گٹھری غنچے نے بھی از بہر سفر باندھی ہے

—

یوں کر کے مرے لاشہ قربان کے ٹکڑے
جاتا ہے کدھر او بے مری جان کے ٹکڑے

—

بار گنہ سے آپ کو اتنا گراں نہ کر
کشتی کی طرح پانی کے اوپر زمین ہے

—

کیوں کہ بے تقریب جاؤں اس کے پاس
کچھ تو ملنے کو بہانا چاہیے

—

گرم ہے آہ سے یہ ہنگامۂ آتش بازی
کون سی شب کو فلک تک یہ ہوائی نہ گئی

—

آتے ہوئے گلی سے تری، جیسے گردباد
ہم آپ اپنی خاک کو برباد کر گئے

—

پھرا کریں ہیں ہم ہاتھ سے ناداری کے
تمہارے کوچے میں کچھ مہر وماہ بھول گئے

—

پر بجاں آئے ہیں ہم ہاتھ سے ناداری کے
جب ہو دکان سے بنیے کی ادھار اٹھتا ہے

—

اس دل میں میاں تری محبت
جیسے کہ نمک کباب میں ہے

—

اب کس ہوس سے باغ میں دھومیں مچائیے
وہ شوق ہی نہیں رہا، وہ ولولے گئے
آتش میں تیرے عشق کی مانند چوب خشک
جب تک کسی نے ہم کو جلایا جلے گئے

—

گو کہ تو میرؔ سے ہوا بہتر
مصحفیؔ میرؔ پھر بھی میرؔ ہی ہے

—

ہنستے ہو تو اچھی ہی طرح مجھ پہ ہنسو نا
یوں منہ میں میاں کا ہے کو رومال دیا ہے

—

پیچھے پھر پھر دیکھتا جاتا ہوں اور بھاگوں ہوں میں
اپنے سائے سے بھی اب تو مجھ کو وحشت ہو گئی

آئینہ لے کے دیکھو ٹک اپنے جمال کو — صحبت کا شب کی کرتے ہو انکار کس لیے

معلوم نہیں کیا غرض اب آئی ہے درپیش — ہے کب سے زباں اپنی ثنا خوان کسی کی

چل اس طرح کہ نہ اے مصحفی! لگے ٹھوکر
پڑے ہیں وے جو سر ہانے زمیں پہ ہاتھ دھرے

دل آنسو سے ہے میل کی رہگذر میں — عجب ہے گر اس گھر کی دیوار ٹھہرے

دیکھیو پاؤں رکھ دیا کس نے — آج کیوں نوک خار پھر چبھی

لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے — کون سے شہر میں ہوتا ہے؟ کدھر ہوتا ہے

غافل نہ آسماں تئے خوابگاہ کر — زیر لبی شکستہ تو سویا نہ چاہیے
عشق کا گھوڑا نپٹ منہ زور ہے اے مصحفی!
ہاتھ میں میرے بھلا اس کی عناں کیوں کر رہے

اس آسماں سے دل اپنا یہ لگ آیا ہے — بناویں گے کوئی اور آسماں زمیں کے تئے

پکارتا ہے تجھے مصحفی جواب تو دے — کھڑا رہے یہ ترے آستاں پہ یا پھر جائے

قائداعظم لائبریری کی علمی وادبی سرگرمیاں

ذکیہ مراد

۳ فروری ۲۰۰۹ء

"Questions for National Pryche"

کیپٹن نیاز الحق نے پاکستان میں قوم کی بڑھتی ہوئی غیر ذمہ داریوں اور سیاست جیسا اہم شعبے میں موجود کمزوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے "Questions for National Prychee" پر ایک بھرپور لیکچر دیا۔اس لیکچر میں کیپٹن صاحب نے ۱۹۶۰ء سے لے کر دور حاضر تک پاکستان کو پہنچنے والے نقصانات کی نشان دہی کی۔انھوں نے دقومی نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنی تاریخ کو فراموش کر چکے ہیں۔شرکاء کی ایک بڑی تعداد نے ان کے خیالات سے استفادہ کیا اور سوال وجواب کے سیشن میں بھرپور حصہ لیا۔

۱۹ مارچ ۲۰۰۹ء

امن عالم سیرت مطہرہ کی روشنی میں

صدارت: محمد ناج، چیف لائبریرین قائداعظم لائبریری

مقررین: ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، ڈین آف آرٹس یونیورسٹی آف فیصل آباد

سید عبدالرحمٰن بخاری، مؤسس اسلامک امہ فاؤنڈیشن

قائداعظم لائبریری لاہور میں ربیع الاول کے موقع پر سیرت النبی ﷺ پر ایک تقریب منعقد کی گئی۔تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک اور نعت رسول مقبول ﷺ سے ہوا۔

محمد ناج صاحب نے مقررین کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ سیرت النبی سے ہمیں ہر طرح کی رہنمائی ملتی ہے کہ ہم کس طرح اپنی زندگیوں کو اسلام کا بہترین نمونہ بنائیں۔انھوں نے نہایت خوبصورتی سے سرکار دوعالم کی زندگی کا دلکش پیکر پیش کیا؛ اور

بتایا کہ آپ کی تعلیمات جو اپنائے گا وہی پُرسکون زندگی پائے گا۔ نہ صرف زندگی میں بلکہ آخرت میں فلاح پائے گا۔

سید عبدالرحمٰن بخاری صاحب نے فرمایا کہ انسان کا رویہ، رسم و رواج، سوشل لائف سٹائل، ویلیوز یہ سب انسان کو ایک سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ اور جس زندگی کو آئیڈیل سمجھا جاتا ہے اور یہ کائنات جس آئیڈیل لائف سٹائل کے انسان کی تلاش میں ہے۔ سیرت مطہرہ ہی کی رہنمائی سے یہ لائف اسٹائل اپنایا جا سکتا ہے۔ انبیاء انسانوں کی ہدایت کے لیے زمین پر اتارے گئے ہیں۔ ان ہدایات کو جو اپنائے گا اس کی زندگی خوف اور غم سے بے نیاز گزرے گی۔ اسلام کا تو نام ہی سلامتی ہے۔ امن ہی امن ہے۔ انھوں نے اسلامی اخلاقیات پر سیر حاصل بحث کی۔

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے بتایا کہ امن عالم سیرت پاک کی روشنی میں اس دنیا میں کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اسلام کی تاریخ اور رسول پاک ﷺ کی زندگی کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا کہ اسلام ایک وحدت اور مساوات کا نام ہے۔ اور اگر آج کی دنیا میں مساوات اور عدل و انصاف قائم ہو جائے، جس کی کئی مثالیں ہمیں آپ ﷺ کی زندگی میں ملتی ہیں تو دنیا میں امن خود بخود قائم ہو جائے گا۔

آخر میں محمد تاج صاحب نے ایمان اور عمل پر زور دیا۔ سیرت النبی کی اس تقریب میں شرکاء کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

۲۱ مارچ ۲۰۰۹ء

قدیم عربی شاعری

صدارت: ڈاکٹر رشید جالندھری مقرر: ڈاکٹر خورشید رضوی

قائداعظم لائبریری اور مجلس یادگار خلیفہ عبدالحکیم کے اشتراک سے مورخہ ۲۱ مارچ ۲۰۰۹ء کو خلیفہ عبدالحکیم میموریل لیکچر کے سلسلے میں "قدیم عربی شاعری" کے موضوع پر ڈاکٹر خورشید رضوی کے ایک لیکچر کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر رشید جالندھری نے کی۔ اس لیکچر میں کہا گیا کہ قبل از اسلام عربی ادب بہت پھیلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اس کی کوئی مفصل اور مجموعی تاریخ مرتب نہیں کی گئی۔ جس کی وجہ سے عربی ادب کی شروعات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ عربی ادب کی شروعات اسلام سے تقریباً ڈیڑھ یا دو سو سال پرانی ہے۔ آج عربی شاعری بہت سے مرحلے طے کرتے ہوئے اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے۔ لیکچر میں یہ بھی تذکرہ کیا گیا کہ عربی ادب میں بھی دوسری زبانوں کے ادب کی طرح شاعری پہلے وجود میں آئی اور نثر بعد میں۔ اس لیکچر میں رضوی صاحب نے عربی شاعری کی تمام انواع پر سیر حاصل بحث کی۔

آخر میں ڈاکٹر رشید جالندھری نے عربی شاعری پر بات کرتے ہوئے کہا کہ جتنی بھی قدیم عربی شاعری ہے اس میں اصل کے ساتھ اس کی نقل بھی موجود ہے اور عربی شاعری میں جتنی بھی روزمرہ زندگی کی عکاسی پائی جاتی ہے اس طرح کی اقدار ہمیں کسی اور ادب کی شاعری میں نہیں ملتیں۔ اس معلوماتی لیکچر کو سب نے سراہا۔

۹/اپریل ۲۰۰۹ء

تعزیتی ریفرنس محترم ڈاکٹر سہیل احمد خاں (مرحوم)

صدارت: جناب عنایت اللہ، صدر مجلس ادارت، مجلہ مخزن

نظامت: محمد ناج، چیف لائبریرین، قائداعظم لائبریری

اظہار خیال: قاضی جاوید، طارق زیدی، امجد اسلام امجد، بیگم ڈاکٹر عبادت بریلوی، شہزاد احمد، انتظار حسین

اردو زبان کے معروف سکالر، ادیب، نقاد اور استاد پروفیسر ڈاکٹر سہیل احمد خاں مرحوم کی یاد میں قائداعظم لائبریری میں ایک تعزیتی ریفرنس کا انعقاد کیا گیا۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے محمد ناج صاحب نے کہا کہ گریزاں لمحات فانی دنیا کی فانی زندگی کا مقدر ہیں۔ لاکھوں انسان آج اس زمین کے اندر دبے پڑے ہیں۔ موت برحق ہے۔ ہر انسان کی اجل کا وقت بھی متعین ہے لیکن بعض انسانوں کی موت ایسی عجیب لگتی ہے جیسے انھیں ابھی مرنا نہیں چاہیے تھا۔ خاں صاحب ایک ایسے اہل قلم، دانشور اور اکابر تھے جو اپنی عمر ملک و ملت کی خدمت میں گزار کر رخصت ہو گئے۔ ان کے کارہائے نمایاں انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے اور ان کے نقش قدم آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

مرحوم کی ان خدمات کو سراہتے ہوئے قاضی جاوید نے سہیل احمد خاں کی کتب بینی پر بات کی کہ سہیل صاحب مطالعے پر زیادہ وقت دیتے جس کی بنا پر وہ ایک روایتی استاد نہ تھے بلکہ مثالی استاد تھے۔ محترم طارق زیدی نے کہا کہ سہیل صاحب کا طریقہ تدریس دیگر اساتذہ سے مختلف تھا۔ وہ لکھتے بھی اچھا تھے اور بولتے بھی اعلیٰ تھے۔ عالم وہ ہوتا ہے جو باعمل ہو اور سہیل صاحب نے اپنے علم کو عمل کا حصہ بنا لیا۔ امجد اسلام امجد نے گراں قدر منظوم خراج تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سہیل احمد خاں کے اخلاق و اطوار پر بات کی۔ محترمہ بیگم عبادت بریلوی صاحبہ جو خان صاحب کی اہلیہ سے قریبی تعلق رکھتی تھیں، آپ نے کہا کہ سہیل احمد خاں واقعی گنج ہائے گراں مایہ تھے۔ آپ بہت عظیم اور کھرے انسان تھے۔ شہزاد احمد نے خاں صاحب کی خدمات کے حوالے سے بڑا پُرمغز مقالہ پیش کیا اور کہا کہ خاں صاحب کی فکری، علمی اور ادبی روایت کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

آخر میں عنایت اللہ صاحب نے خطبہ صدارت دیتے ہوئے قائداعظم لائبریری کو اس قدر کامیاب تعزیتی ریفرنس کے انعقاد پر مبارک باد پیش کی اور کہا کہ خاں صاحب نہ صرف ایک بڑے آدمی تھے بلکہ انھوں نے اپنی تعلیمات سے بڑے آدمی بھی پیدا کیے۔

۱۸ویں شمارے کے قلمی معاونین

رفاقت علی شاہد صاحب، مکان نمبر 54 گلی نمبر 10 محمدی کالونی نزد Q بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور

محمد حمزہ فاروقی، D-86 کلفٹن بلاک 4، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی V، کراچی

قاسم یعقوب، پی 240، رحمان سٹریٹ، سعید کالونی، مدینہ ٹاؤن، فیصل آباد

ڈاکٹر سلیم اختر، الجودت، C-569 گلی نمبر 17، جہانزیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

مشتاق احمد بیگ، ریسرچ سکالر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی لاہور

شفقت رضوی 2933 Sun Meadow, Flower Mound TX.75022, USA

محمد حنیف شاہد، 170 جہانزیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ڈاکٹر ناصر عباس نیر، شعبہ اردو، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، کچہری روڈ لاہور

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی، حافظ محمود شیرانی روڈ، سٹیڈیم پارک شیخوپورہ

سید سغیر حیدر، لیکچرار شعبہ اردو، ایف سی کالج، فیروز پور روڈ، لاہور

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ، Areen, Street-1, 386 Iqra Colony, New Sir Syed Nagar, Aligarh-202002

محمد ہارون عثمانی، ڈپٹی چیف لائبریرین، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور

سعید اکرم، پرنسپل الہدیٰ پبلک سکول، سہگل آباد، چکوال

محمد افضل حمید، استاد شعبہ اردو، گورنمنٹ میونسپل ڈگری کالج، فیصل آباد

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، A-21-295 طفیل روڈ لاہور چھاؤنی

ڈاکٹر محمد ایوب اللہ بمعرفت ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، D-28 منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

امجد اسلام امجد، N-275 ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، لاہور کینٹ

ذکیہ مراد، لائبریرین، قائداعظم لائبریری، لاہور